اسلامی انقلاب

کا

پس منظر اور اس کے نتائج

ڈاکٹر منوچہر محمدی

ترجمہ

سید قلبی حسین رضوی

نقالوں سے ہوشیار
کتاب کے پیچھے موجود مجمع جہانی اہلبیت کی مہر والی کتابیں طلب فرمائیں۔
AL-MUNJI FOUNDATION
0345-2985380
0345-3821902
sbhk786@yahoo.com
sbhk110@gmail.com

ACC No. 112068 Date 15/3/10
Section.......................Status
D.D. Class....................
NAJAFI BOOK LIBRARY

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے"

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

قال رسول اللهﷺ : "انی تارك فیکم الثقلین، کتاب اللّٰه، وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا ابدا وانهما لن یفترقا حتّیٰ یردا علیّ الحوض"۔

حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہارے درمیان دوگرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں: (ایک) کتاب خدا اور (دوسری) میری عترت اہل بیت (علیہم السلام)، اگر تم انھیں اختیار کئے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں''۔

(صحیح مسلم: ۱۲۲/۷، سنن دارمی: ۴۳۲/۲، مسند احمد: ج ۳، ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹. ۳۶۶/۴ و ۳۷۱. ۱۸۲/۵، اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳، ۱۴۸، ۵۳۳. وغیرہ.)

اسلامی انقلاب

کا

پس منظر اور اس کے نتائج

اسلامی انقلاب

کا

پس منظر اور اس کے نتائج

ڈاکٹر منوچہر محمدی

ترجمہ

سید قلبی حسین رضوی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

سرشناسه : محمدی، منوچهر، ۱۳۲۵.
عنوان قراردادی : انقلاب اسلامی زمینه‌ها و پیامدها. اردو.
عنوان و نام پدیدآور : اسلامی انقلاب کاپس منظر اوراس کی نتائج / ڈاکٹر منوچهر محمدی؛[برای] مجمع جهانی اهل بیت علیهم السلام؛ ترجمه سید قلبی حسین رضوی.
مشخصات نشر : قم: مجمع جهانی اهل بیت(ع)، ۱۳۸۶.
مشخصات ظاهری : ۳۳۸ ص.
شابک : 9789645292193
وضعیت فهرست‌نویسی : فیا
موضوع : ایران -- تاریخ --انقلاب اسلامی، ۱۳۵۷--علل.
موضوع : ایران -- تاریخ --انقلاب اسلامی، ۱۳۵۷--تحقیق.
شناسه افزوده : رضوی، قلبی حسین، مترجم.
شناسه افزوده : مجمع جهانی اهل بیت(ع).
رده بندی کنگره : ۱۳۸۶ ۸۰۴۶الف ۳م / DSR۱۵۵۱
رده بندی دیویی : ۹۵۵/۰۸۳
شماره‌کتابشناسی ملی : ۱۱۰۳۴۳۴

نام کتاب : اسلامی انقلاب کاپس منظر اوراس کے نتائج
مؤلف : ڈاکٹر منوچہر محمدی
مترجم : سید قلبی حسین رضوی
نظر ثانی : مرغوب عالم عسکری
پیشکش : معاونت فرہنگی، ادارۂ ترجمہ
ناشر : مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام
طبع اول : ۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء
تعداد : ۳۰۰۰
مطبع : لیلیٰ

ISBN:978-964-529-238-4
www.ahl-ul-bayt.org
Info@ahl-ul-bayt.org

فہرست

عرض ناشر.. ۱۱

•حرف اول.. ۱۳

• مقدمہ.. ۱۵

• پہلا حصہ: ایک کلی مطالعہ اور بحث کا دائرہ.. ۲۱

•۔ پہلی فصل: انقلاب کی تعریف.. ۲۳

ا۔مکتب تضاد.. ۳۱

۲۔مکتب اصالت کار.. ۳۲

•۔دوسری فصل: انقلاب کے تین مراحل.. ۳۷

پہلی گفتگو: انقلاب سے پہلے سیاسی اور اجتماعی حالات.. ۳۸

دوسری گفتگو: اجتماعی اقتدار کی تشکیل اور انقلاب کا ظہور.. ۵۰

تیسری گفتگو: انقلاب کی کامیابی کے بعد کا دور.. ۶۱

چوتھی گفتگو: اسلامی انقلاب کی آفتیں.. ۶۸

• دوسرا حصہ: ایران کے اسلامی انقلاب کا تجزیہ.. ۷۱

پہلی فصل: انقلاب سے پہلے سیاسی اور اجتماعی حالات کا پس منظر.. ۷۳

پہلی گفتگو: سیاسی طاقت.. ۷۵

ایک تنہا مرد.. ۹۳

دوسری گفتگو: سماجی طاقت.. ۹۷

انقلاب سے پہلے ایران کے سماجی حالات.. ۱۰۴

دوسری فصل: اسلامی انقلاب کی کامیابی کے اسباب.. ۱۰۹

الف) عوام.......... ۱۱۳
ب) قیادت.......... ۱۲۱
ج) آئیڈیالوجی.......... ۱۳۵
تیسری فصل: انقلاب میں تیزی آنے کے عوامل.......... ۱۴۷
الف) کارٹر کے انسانی حقوق کا نفاذ.......... ۱۴۹
ب) شاہ کے کینسر کی بیماری میں مبتلا ہونے کا انکشاف.......... ۱۵۷
ج) ملک کو تیزی سے ماڈرن کرنے کی شاہ کی کوششیں.......... ۱۵۹
د) توہین آمیز مقالہ کی اشاعت.......... ۱۶۲
چوتھی فصل: اسلامی انقلاب کے نتائج.......... ۱۶۷
پہلی بات: انقلاب کی پہلی دہائی.......... ۱۶۹
مقدمہ.......... ۱۷۰
پہلا مرحلہ: لیبرل طاقتوں کی حکومت (عبوری حکومت).......... ۱۷۹
دوسرا مرحلہ: مخلوط حکومت.......... ۱۹۲
تیسرا مرحلہ: خط امام کی حاکمیت.......... ۲۰۶
چوتھا مرحلہ: تیسرا انقلاب.......... ۲۱۳
دوسری بات: انقلاب کی دوسری دہائی.......... ۲۲۷
مقدمہ.......... ۲۲۸
پہلا مرحلہ: داخلی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں.......... ۲۳۰
الف) آیت اللہ منتظری کی برطرفی.......... ۲۳۰
ب) آئین میں ترمیم.......... ۲۳۲
ج) امام خمینیؒ کی رحلت.......... ۲۳۷

د) تعمیری وترقی کے دور کا آغاز............۲۴۵
دوسرا مرحلہ: اسلامی انقلاب اور عالم اسلام میں تبدیلیاں............۲۵۱
الف) عراق کا کویت پر حملہ اور خلیج فارس کی جنگ کا آغاز............۲۵۲
ب) سوویت یونین کا زوال اور نئی حکومتوں کی تشکیل............۲۵۶
ج) افغانستان میں تبدیلیاں............۲۵۹
د) اسلامی انقلاب اور فلسطین کی تحریک............۲۶۳
ھ) اسلامی انقلاب اور خلیج فارس کے جنوبی ممالک............۲۶۶
تیسرا مرحلہ: اسلامی انقلاب اور عالمی تبدیلیاں............۲۶۹
• تیسرا حصہ: اسلامی انقلاب، کا شمار دنیا کے بڑے انقلابوں میں............۲۸۵
مقدمہ............۲۸۶
پہلی فصل: ایران، فرانس اور روس کی بادشاہی حکومتوں کا موازنہ............۲۸۷
ا۔ انقلاب سے پہلے حکومتوں کی اقتصادی حالت............۲۸۸
۲۔ انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں حکومتوں کی عسکری طاقت............۲۸۹
۳۔ انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں حکومتوں کی پیچد گی اور استحکام............۲۹۳
دوسری فصل: انقلاب سے پہلے ایران، فرانس اور روس میں سماجی طاقت کا موازنہ............۲۹۵
الف) لوگوں کی شراکت............۲۹۶
ب) رہبری............۲۹۸
ج) آئیڈیالوجی............۳۰۰
• خلاصہ اور نتیجہ............۳۰۵
اسلامی انقلاب کو پہنچنے والے نقصانات کی پہچان............۳۰۸
ا۔ آئیڈیالوجی کے زاویہ سے............۳۰۹

۲۔قیادت کے زاویہ سے ۳۱۰
۳۔عوامی زاویہ سے ۳۱۱
• فارسی اور انگریزی منابع کی فہرست ۳۲۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کردیا، آپ کی تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھی، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان ومذاہب اور تہذیب وروایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت وپاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کے بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردئی گئی تھی، پھر بھی حکومت وسیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمہ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء ودانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار ونظریات سے متاثر اسلام وقرآن مخالف فکری ونظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام وقرآن اور مکتب

اہل بیت علیہ السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب وکامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ عملی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل وشعور کو جذب کرنے والے افکار ونظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تا کہ موجود دنیائے بشریت جو قرآن وعترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق ومعنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان وولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ ورسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدوخال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواراں کی نام نہاد تہذیب وثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی وتحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین ومترجمین کا ادنی خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل ڈاکٹر منوچہر محمدی کی گرانقدر کتاب ''اسلامی انقلاب کا پس منظر اور اس کے نتائج'' کو فاضل جلیل مولانا سید قلبی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہاد رضائے مولی کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

حرف اول

خدائے متعال کی حمد وثنا کہ جس نے ایران کے لوگوں اور اس بندۂ حقیر کو گزشتہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ کے دوران اسلام کی حاکمیت کی نیز اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ ایران کے زیر سایہ زندگی گزارنے کی توفیق عطا کی۔ نہ تو میں اپنے آپ کو کتاب لکھنے کے لائق سمجھتا ہوں اور نہ ہی میں پہلے سے کوئی اہل قلم تھا۔ حقیقت میں یہ عظیم اسلامی انقلاب کی کشش تھی جس نے مجھے ۱۹۸۵ء میں دست بہ قلم ہونے کی جرأت بخشی اور میں نے اپنے تحت الشعور میں اس عظیم انقلاب کے حوالے سے جس چیز کو درک کیا تھا، اسے قلم بند کر کے ''اسلامی انقلاب کا ایک جائزہ'' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی اور وہ منظر عام پر آ گئی۔

اس کتاب کا غیر معمولی استقبال ہوا، اس کا آٹھ بار شائع ہونا اور ہر بار اس کے نسخوں کا نایاب ہونا میرے لئے پھر سے قلم اٹھانے کے لئے حوصلہ افزائی کا سبب بنا تاکہ اپنی رسالت اور ذمہ داری کو جاری رکھ سکوں، جس کا نتیجہ اس سلسلہ میں مزید چار کتابوں کی اشاعت[1] ہے۔

چند برسوں سے میرے دوست واحباب اسلامی ''انقلاب کا ایک جائزہ'' نامی میری کتاب کے بارے میں مجھے تجدید نظر کی سفارش اور تشویق کرتے رہے اور اس میں اسلامی انقلاب کی دوسری دہائی کے حوادث اور اتفاقات پر تجزیہ وتحلیل کے حوالے سے اس کو مکمل کرنے کا تقاضا کرتے تھے، یہاں تک کہ انجمن معارف اسلامی ایران کے بزرگ احباب نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی کہ طلاب کے استفادہ کے لئے میں اس کام کو حتماً انجام دوں۔ دوسری مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود میں نے اس تجویز کو اپنے لئے حجت سمجھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا آپ کے ہاتھ میں یہ کتاب موجود ہے۔

کتاب کے مطالب ومواد کے پیش نظر اور یہ کہ اس کی تالیف کا سیاق بھی حوادث اور واقعات

---

[1] یہ چار کتابیں (فارسی میں) حسب ذیل ہیں: ''انقلاب اسلامی در مقائسہ با انقلاب ہای فرانسہ وروسیہ''، ''اصول سیاست خارجی جمہوری اسلامی''، ''سیاست خارجی جمہوری اسلامی (اصول ومسائل'') ''ومروری بر سیاست خارجی دوران پہلوی''۔

کے تجزیہ پر مشتمل ہے، اس میں واقع نگاری سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ''اسلامی انقلاب کے پس منظر اور نتائج'' کے نئے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں، میں اپنی حوصلہ افزائی کرنے والے تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں نیز قارئین کرام کی خدمت میں عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر بہت بڑا کرم ہوگا اگر وہ کتاب کا تنقیدی نگاہ سے مطالعہ فرمائیں اور اس میں پائی جانے والی خامیوں سے مجھے آگاہ کریں۔

خدائے متعال سے دعا کرتا ہوں کہ ملت ایران کو اس الٰہی اور عوامی انقلاب کی حفاظت کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

ڈاکٹر منوچہر محمدی

اگست ۲۰۰۱ء

مقدمہ

لفظ انقلاب پہلی نظر میں ایک ملک کی سیاسی حکومت میں بنیادی تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے۔انقلاب ایک دیرینہ، عادت میں اچانک تبدیلی کا نام ہے (یعنی یک بیک ہاں سے نہیں ہو جائے مثلاً) حکومت قانون وضع کرتی ہے، اسے نافذ کرتی ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دیتی ہے۔اچانک ایک حکومت سے یہ سب اختیارات سلب ہو جائیں اور اس نظام سے تعلق رکھنے والے دور ونزدیک کے تمام افراد سیاسی اور سماجی منظر سے محو ہو جائیں اور ایک حکومت جو تمام سیاسی اقتدار، سماجی اور ثقافتی مراکز کو کنٹرول کر کے معاشرے کے اتار چڑھاؤ کو جو اپنے قابو میں رکھتی تھی، اچانک سرنگون ہو جائے اور اسکی جگہ پر ایک نئی حکومت برسر اقتدار آجائے (یہ ہے انقلاب)۔

اس قسم کی عظیم طاقت کا منبع کیا ہے؟ اور یہ طاقت اس سے پہلے کہاں، کس طبقہ کے پاس اور کیسے بطور ذخیرہ وسرمایہ تھی؟

تاریخ میں ملنے والے حقیقی انقلاب کے نمونوں کو صرف نظر کرتے ہوئے ظاہر میں ایک پائدار اور قبول شدہ نظام کو درہم برہم کر کے اس کی جگہ ایک نئے نظام کو وجود میں لانے کا عمل نیز اس کی اصولی اور نظریاتی تحقیق ایک دلچسپ اور قابل غور موضوع ہوسکتا ہے۔

طبیعی طور پر معاشرے میں کسی بھی سیاسی نظام کی حاکمیت مخالفت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ہر معاشرے کے گوشہ وکنار میں ضرور کچھ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو طرز حکومت، حکام یا اس حکومت کی قانونی بنیادوں اور برحق ہونے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔لیکن ایک معاشرے میں انقلابی حالات کے باوجود، مخالف قوتوں کے سلیقے، نظریے، طور طریقے اس قدر پراکندہ اور بکھرے ہوئے ہوں کہ سیاسی ''نظام کا تختہ الٹنے'' کے لئے ان کا ایک مقصد پر متحد اور منسجم ہونا بہت زیادہ بعید اور ناممکن نظر آرہا ہو۔اس لئے دوسرا دلچسپ موضوع یہ ہوگا کہ ہم معلوم کریں کہ مخالف طاقتوں کو متحد کر کے برسر اقتدار سیاسی نظام کا تختہ الٹنے کے لئے وحدت اور یکجہتی ایجاد کرنے کا عامل کیا ہوسکتا ہے؟

۱۹۷۹ء میں رونما ہونے والے ایران کے اسلامی انقلاب کا حساس اور حیرت انگیز نکتہ، جس نے

خاص طور پر معاصر محققین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرایا، یہ تھا کہ اس انقلاب کا اصلی محرک اور وحدت کا عامل نہ صرف نظریاتی تحریکوں کا وجود تھا بلکہ اس کا سرچشمہ اس کے مذہبی ہونے کی نوعیت اور حقیقت میں توحید پر مبنی ایک دین الٰہی تھا[۱] حالانکہ اس زمانہ کے اکثر معاشروں میں دین سیاسی اور سماجی اثرات سے عاری تھا اور زیادہ سے زیادہ پروردگار کے بارے میں ایک داخلی اور انفرادی معنوی عشق تک محدود تھا۔

اس کتاب میں دین اسلام کے بارے میں اس نئے نظریہ کی تحقیق کی جائے گی اور عصر حاضر کے ایرانی معاشرے میں اس کی تشکیل اور پختگی کی وضاحت کی جائے گی۔

دوسری جانب، مخالف پارٹیوں میں اختلافات، بدنظمیاں، جلسے جلوس، بلوے، اعتراض آمیز دھرنے، پوسٹر بازی، تقریریں اور پمفلٹ بازی نے معاشرے کو ایک ہیجانی وجذباتی حالت میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا اور معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد میدان میں آ کر اپنے مطالبات، خواہشات اور تمایلات کو موثر طریقے سے تاریخ اور نسلوں کے کانوں تک پہنچا رہے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ انصاف نہیں ہے، کہ قارئین کرام ان عجیب اور حیرت زدہ مناظر سے محروم رہیں، جو بیشک ان کے اسلاف کے ریکارڈ کا ایک حصہ ہے۔

لیکن سیاسی علوم کے علاوہ دوسرے علوم کے طالب علم، جو سماجی اور سیاسی مسائل سے براہ راست واسطہ نہیں رکھتے، کیسے اس ضروری اور ظریف مطالعہ کے میدان تک پہنچ سکتے ہیں؟

یہ کتاب اسلامی انقلاب سے مربوط بنیادی مفاہیم کو ان ہی طالب علموں تک پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ علمی اور مروجہ اکاڈیمک اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے اس سلسلہ میں ضروری اور عام مسائل کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے اور مطالب کو ایسے مرتب کیا جائے تاکہ سیاسی واجتماعی اصطلاحات اور پیچیدہ نظریوں سے ناآشنا طالب علم بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

۱۔ تہران کی سڑکوں پر ہزاروں مظاہرین مسلح فوجیوں کے سامنے خالی ہاتھ مارچ کرتے ہوئے نعرے بلند کرتے تھے: ''اسلام اسلام'' ''اے فوجی بھائی! کیوں اپنے بھائی کو قتل کر رہے ہو؟'' ''قرآن کی حفاظت کیلئے فوج کو ہم سے ملنا چاہئے'' ''خمینی خمینی تم وارث حسینؑ''۔ میں نے اجتماع میں موجود کئی طالب علموں کو پہچان لیا جو ہماری نظروں میں سوشلسٹ تھے لیکن جلی حروف میں لکھے ہوئے اپنے مطالبات پر مشتمل پلاک کارڈ ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ (میشل فوکو ایرانیوں کے دماغ میں کیسے خواب ہیں ص ۲۸)

ایرانی جوان نسل اور محقق طالب علوی کے لئے اسلامی انقلاب کا مطالعہ کرنے کی صرف اس لئے اہمیت نہیں ہے کہ یہ انقلاب ایران میں واقع ہوا ہے اور اس معاشرے کے حاکم اور رائج نظام میں تبدیلی ایجاد واقع ہوئی ہے، بلکہ یہ انقلاب اس کے علاوہ ایسی خصوصیتوں کا حامل ہے کہ جس نے اس انقلاب کو دوسرے انقلابوں اور سیاسی وسماجی تبدیلیوں سے ممتاز بنادیا ہے اور اس کی کامیابی کو دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود یہ انقلاب اپنی نوعیت میں بے مثال ہے اور تاریخ بشر کی بے نظیر تبدیلی کے عنوان سے ایک یادگار ہے۔ ذیل میں ہم ان خصوصیات میں سے بعض کی تشریح پیش کرتے ہیں:

۱۔ یہ انقلاب ایسے حالات میں کامیاب ہوا ہے، کہ ملت نے کسی قسم کا اسلحہ ہاتھ میں لئے بغیر ایک طولانی مدت کے شہنشاہی نظام کا خاتمہ کیا۔ ایک ایسا نظام کہ جس کا ڈھانچہ اس وقت کی طاقت ور ترین فوج پر استوار تھا اور تقریباً بلا استثناء دنیا کی تمام بڑی طاقتیں من جملہ امریکہ، سابقہ سوویت یونین اور یورپی ممالک حتی علاقہ کی حکومتیں بھی اس کی حمایت کرتی تھیں۔

۲۔ اس انقلاب کی صدائے بازگشت اور جھٹکے واشنگٹن اور امریکی صدر کے محل تک پہنچ گئے۔ یہاں تک اس انقلاب نے امریکہ کے صدارتی انتخابات کے قانون کو اپنے سے جوڑ دیا۔ اس وقت کا امریکی صدر ''جمی کارٹر'' اپنے پھر سے انتخاب ہونے کو ایران کی حالات میں تبدیلیوں سے وابستہ جانتا تھا اور بالاخر انقلاب کے بعد ایران میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر کنٹرول کرنے میں ناکام ہونے کے سبب بری شکست سے دوچار ہوا۔ یہ جھٹکے اس کے بعد والے سربراہان مملکت من جملہ رونالڈ ریگن تک جاری تھے اور ان کے لئے پے در پے ناکامیوں کا سبب بنے۔

۳۔ اس انقلاب کے مبارزہ کا طریقہ کار بنیادی طور پر دنیا کے دوسرے انقلابوں سے متفاوت تھا۔ عام لوگوں نے غیر مسلحانہ مظاہروں، قربانی اور شہادت کے جذبوں سرکاری اداروں حتی فوجی چھاونیوں میں عام ہڑتالوں سے کاروبار زندگی کو معطل رکھا، آرام وآسائش حتی مال وجان کی حفاظت سے ایک طولانی مدت تک دست بردار رہے تا کہ مطلوبہ آرزو تک پہنچ سکیں۔ لوگوں نے اس راہ میں اپنی مرضی اور ارادہ سے معاشرے کے اقتصاد کو ٹھپ کر کے رکھدیا اور جان بوجھ کر اس طرح کے فیصلہ

سے مالی نقصانات کو آئندہ کئی برسوں تک برداشت کرنا قبول کیا۔

۴۔ تیسری دنیا کی ایک ملت، جس کے بین الاقوامی روابط قاعدے کے مطابق ہمیشہ سرحد پار کی تبدیلیوں کے اثر میں ہوتے تھے، نے اچانک اس نقشہ کو بدل ڈالا۔ ایک ایسے زمانہ میں، جبکہ تمام عالمی اتفاقات اور حوادث کے سرچشمہ کو وقت کی دو بڑی طاقتوں، یعنی امریکہ اور سوویت یونین میں سے کسی ایک کی چاہت اور فیصلہ میں تلاش کیا جاتا تھا، اس ملت نے ان تمام بین الاقوامی چالوں سے ہٹ کر انقلاب برپا کیا اور ایسے حیرت انگیز حالات پیدا کئے، جس کی مثال نہ اسکی گزشتہ تاریخ میں اور نہ دوسری ملتوں کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اس سے زیادہ اہم یہ کہ اس انقلاب نے مغربی اور مشرقی مفکروں کے تجزیوں، نظریوں اور پیشگوئیوں کو مکمل طور پر درہم برہم کر کے رکھ دیا[۱]

۵۔ دنیا کی بڑی جاسوسی ایجنسیوں من جملہ امریکہ کی CIA، اسرائیل کی موساد، انگلستان کی انٹیلی جنس سروس اور سوویت یونین کی KGB کے ایران میں غیر معمولی اثر نفوذ کے باوجود، ان میں سے کوئی ایک ایجنسی اس انقلاب کی کامیابی اور تشکیل کے بارے میں پیشگوئی نہ کر سکی۔ حتی ان جاسوسی ایجنسیوں میں سے بعض معتقد تھیں کہ شاہ کی حکومت آئندہ دس برسوں تک اپنے استحکام اور اقتدار کے ساتھ باقی رہے گی[۲]

---

[۱] سوویت یونین کا صدر اور کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکریٹری، پارٹی کی چوبیسویں کانفرنس کو پیش کی گئی ایک رپورٹ میں اپنی تشویش اور پریشانی کا یوں اظہار کرتا ہے: اس وقت ہماری جنوبی سرحدیں براہ راست خطرے سے دوچار ہیں... حالیہ دنوں میں، بعض مشرقی ملکوں میں اسلامی قوانین بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں... اسلام کی تجدید حیات شائد بیسویں صدی کا اہم ترین سیاسی واقعہ ہو۔ سوویت یونین کے مسلمان آبادی والے علاقے اب تک بالکل امن وامان میں تھے، ان علاقوں کی ایران اور افغانستان کے ساتھ مشترک سرحدیں ہیں، ممکن ہے ایران کے انقلاب کے مذہبی جذبات سرحدیں پار کر جائیں۔ (نشریہ مطبوعات جہان، شمارہ: ۵، نقل از مجلہ فیگارو، مورخ ۱۶ جنوری ۱۹۸۲ء)

۲۔ اگست ۱۹۷۸ء میں آبادان کے ریکس سنیما میں آتش سوزی، جس نے شاہ کے خلاف لوگوں کی نفرت کو بھڑکا دیا، کے بعد بھی امریکہ، ایران کے حالات کے بارے میں خواب میں تھا۔ جبکہ پانچ جاسوسی ایجنسیاں (سازمان اطلاعاتی، وزارت دفاع، فوجی امداد کے مشاوروں کا گروہ، وزارت خارجہ کے جاسوسی اور تحقیقاتی دفتر کا شعبہ اور ساواک یعنی سازمان امنیت ملی کشور) ایران کے مسائل پر کنٹرول اور پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے۔ اوائل اگست ۱۹۷۸ء (انقلاب سے پانچ ماہ قبل) امریکی جاسوسی ایجنسی اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ ایران انقلاب کی حالت میں نہیں ہے حتی قبل از انقلاب کی حالت میں بھی نہیں ہے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۸ء میں وزارت دفاع کے جاسوسی شعبہ نے یہ پیشنگوئی کی تھی کہ شاہ آئندہ دس سال تک اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ اقتدار پر باقی رہے گا۔

D.Hiro, Iran, Under the Ayatollahs

۶۔ یہ نکتہ بھی دلچسپ ہے کہ یہ انقلاب کسی منظّم پارٹی یا تشکیل یافتہ گروہ کی مداخلت کے بغیر صرف عوامی تحریک کے نتیجہ میں کامیاب ہوا اور شاہ کی حکومت کے زوال کے بعد آزادی کا ایسا ماحول پیدا ہوا کہ بدخواہ اور انقلاب دشمن عناصر بھی اس تازہ نظام میں انتہائی درجہ تک نفوذ کر سکے اور نظام کے اولین مقام یعنی صدر جمہوریہ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اپنے لئے یہ ممکن بنا سکے کہ رجائی اور باہنر جیسے برجستہ ترین انقلابی شخصیتوں کو بزدلانہ طور پر شہید کر ڈالیں۔ انہوں نے اندورونی اور بیرونی جنگیں برپا کیں، ملک کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی کرائی اور تختہ الٹنے کی سازشیں کیں، لیکن اس کے باوجود انقلاب کی بنیادوں میں خلل اور انحراف پیدا کر کے اسے ناکام نہ بنا سکے۔

۷۔ اس انقلاب نے دوسری عالمی جنگ کے پیدا ہوئے بین الاقوامی رسم و رواج کو درہم برہم کر کے رکھدیا اور جن دو بڑی طاقتوں کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ یہ آپس میں کبھی اتفاق نہیں کر سکتی ہیں، کو آپس میں ملا دیا، اسطرح کہ نہ صرف انقلاب کے دوران انہوں نے مشترک پالسی اپنائی بلکہ اس کے بعد بھی خاص کر عراق کے ایران پر حملہ کے دوران، عراق کی مشترک طور پر ہر قسم کی مدد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی۔ یہ سلسلہ دو قطبی نظام کے زوال تک جاری تھا۔ جب امریکی ایک قطبی نظام کو دنیا پر مسلط کرنے کی کوششیں کر رہے تھے، تو اسلامی انقلاب کی مخالفت اور نافرمانی اس امر کا سبب بنی کہ یہ نیا عالمی نظام تشکیل پانے سے پہلے ہی بکھر کرنا کام ہو گیا[۱]

۸۔ اس انقلاب نے آزادی کی تحریکوں کے طرز عمل پر بھی اہم اثرات ڈالے۔ جن تحریکوں نے

۱۔ اس سلسلہ میں کسینجر کہتا ہے: ''مشرق وسطیٰ چار صورتوں سے دو چار ہوا کہ اول شیعہ شدت پسندی، دوم اسلامی شدت پسندی، سوم ایران کا انقلاب اور چہارم سوویت یونین کی سامراجیت... خلیج (فارس) کے ممالک کے بارے میں ایرانی انقلاب کا براہ راست خطرہ سوویت یونین کے طویل المیعاد خطرے کو تحت الشاع میں قرار دے چکا ہے... ایران ہمیشہ عربوں کے بوس کو بھڑکاتا ہے۔''

(نشریہ ''مطبوعات جہان''، شمارہ ۳۰ نقل از ''الاستور'' طبع انگلستان، مورخ ۵ جنوری ۱۹۸۲ء)

۲۔ بیگن کی کابینہ میں وزیر خارجہ موشہ دایان نے اسلامی انقلاب کے بارے میں یوں اعلان کیا: ''علاقہ میں ایک زلزلہ آیا ہے اور میں نے بیگن کو نصیحت کی ہے کہ کیمپ ڈیوڈ سے زیادہ اہم مسئلہ رونما ہوا ہے کہ ہمیں جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔'' اس کے بعد مغرب اور اسرائیل کے لئے اسلامی انقلاب کے خطرات کا جائزہ لینے کی غرض سے موشہ دایان کے مؤسسہ نے تل ابیت میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں امریکہ اور اسرائیل کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے شرکت کی۔

اشترا کی یا قوم پرستی کے اقتدار پر بھروسہ کر کے ستم زدہ عوام کو امید دلائی تھی، وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھیں اور ان کے رہنما اور سربراہان بھی لوگوں کے درمیان بے اعتبار ہو کر رہ گئے اور یاسر عرفات جیسے افراد نے بھی امریکی سامراج کے جال میں پھنس کر ہتھیار ڈال دیئے۔

۹۔اسلامی انقلابی کی کامیابی کو ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اسکی چنگاریوں نے جنوب لبنان کے مظلوم ومحروم جوانوں کو متحرک بموں میں تبدیل کر دیا اور اسرائیلی غاصبوں اور ان کے بیرونی حامیوں جیسے انگلستان، فرانس، اٹلی اور خاص کر امریکہ میں سے ہر ایک نے، جو اس ملک میں اپنے لئے چھوٹے چھوٹے فوجی اڈے قائم کر رکھے تھے، کو ایک ایسے جہنّم میں تبدیل کر دیا کہ یہ سب کسی برتری وامتیاز کے کسی معاہدہ پر دستخط کئے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے اور ان شہادت طلب جوانوں کے مقابلہ میں اپنے عجز وشکست کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے[۲]

۱۰۔اس انقلاب نے سیاسی اور جغرافیائی اصطلاحات پر بھی اچھا خاصا اثر ڈالا، اس طرح سے کہ ان میں سے بہت سی اصطلاحوں کو بے اعتبار و بے مفہوم کر کے جدید اصطلاحوں میں تبدیل کر دیا اب مشرق وسطیٰ، عرب دنیا، پہلی دوسری اور تیسری دنیا جیسی اصطلاحیں، سیاسی تجزیوں میں اپنے مفہوم کو پیش نہیں کر سکتی ہیں تا کہ دنیا کے نظام میں پائے جانے والے روابط کی تصویر پیش کر سکیں۔اسلامی انقلاب کی برکت سے آج عالم اسلام، دنیا کی عظیم تہذیبیں، عالمی استکبار، مستضعفین جہاں جیسی جدید اصطلاحوں نے جنم لیا ہے۔اس کتاب میں مناسب نظریہ کا ڈھانچہ پیش کر کے اسلامی انقلاب کے ظاہر ہونے اور اس کے تشکیل پانے کے اسباب وعوامل نیز انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد دو دہائیوں کے دوران مختلف ابعاد میں حاصل ہوئے نتائج کی تحقیق، تجزیہ وتحلیل پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

پہلا حصہ:

ایک کلی مطالعہ اور موضوع بحث کا دائرہ

پہلی فصل: انقلاب کی تعریف

دوسری فصل: انقلاب کے تین مراحل

پہلی فصل:

انقلاب کی تعریف

- مکتب تضاد
- مکتب اصالت کار

انقلاب کی تعریف

اسلامی انقلاب کی تحقیقات سے پہلے ضروری ہے کہ انقلاب کے بارے میں ایک ''متفقہ تعریف'' پیش کردی جائے تا کہ ہم جان لیں کہ کس چیز کا مطالعہ مقصود ہے۔

انقلاب کی تعریف کے لئے ہمارے سامنے دو راہیں ہیں:

ا۔ رونما ہوئے تاریخی نمونوں کی تحقیق کی جائے اور ان کے درمیان مشترک فصل کو اخذ کر کے ایک ایسے مفہوم تک رسائی حاصل کی جائے جو ان تمام مصادیق پر محیط ہو۔

۲۔ انقلاب کی مرسوم اصطلاح سے صرف نظر براہ راست انقلاب سے متعلق ایک تعریف کو پیش کریں اور اس کے بعد اس کے مطابق دنیا میں واقع ہوئے گونا گون مصادیق کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

باوجود اس کے کہ دوسری روش علمی اور بہت زیادہ معقول دکھائی دیتی ہے، لیکن معاشرہ شناسی کے سیاسی مسائل کے دائرہ میں اس کا استعمال ناممکن نظر آتا ہے، کیونکہ اس علم کا موضوع، انسان کے اجتماعی رفتار کی تحقیق ہے کہ جس کے لئے عقلی اور علت و معلول کے رابطہ کو حاصل کرنا بہت بعید ہے۔

دوسری جانب، علوم سیاسی کی اصطلاح میں مفہوم انقلاب کے مصادیق مختلف و گونا گوں ہیں، اس بنا پر پہلی روش سے استفادہ کرنا آسان نظر آتا ہے۔ یہ نمونے انقلاب فرانس، انقلاب روس، انقلاب چین، انقلاب کیوبا، انقلاب نیکاراگوۂ اور ایران کے اسلامی انقلاب سے عبارت ہیں۔ لیکن چند دیگر مظاہر بھی ہیں جن میں غالباً ضمنی طور پر لفظ ''انقلاب'' کا تصور پایا جاتا ہے لیکن ماہیت اور مفہوم کے لحاظ سے، کلمۂ انقلاب سے بنیادی تفاوت رکھتے ہیں۔ ان مظاہر کے بعض مصادیق حسب ذیل ہیں:

۱۔ ۱۹۹۹ء میں پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل پرویز مشرف نے ملک کے وزیر اعظم نواز شریف اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز چند دیگر افراد کو بیت المال کا غلط مصرف اور اس میں خرد برد کے الزام میں جیل بھیج دیا۔ اس کے بعد مارشل لا کا اعلان ہو گیا اور حکومت کی باگ ڈور جنرل مشرف نے خود سنبھال لی۔ اس نے پہلے تو اپنے آپ کو پاکستانی حکومت کے انچارج کے طور پر پیش کیا اور پھر صدارت کی کرسی سنبھال لی۔ اہم شہروں کے گوشہ و کنار میں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں کھڑی کر دی گئیں، فوج کے تمام شعبوں کو تیار رہنے کا حکم دیا گیا کہ یکا یک تمام شہروں پر ایک خاموشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ معروف طور پر تختہ الٹنے کی سازش کا ایک نمونہ تھا۔ یہ ایک ایسا مظہر ہے جو کبھی انقلاب سے مشتبہ ہوتا ہے، لیکن مفہوم انقلاب کے دائرہ سے خارج ہے۔ تختہ الٹنے کی سازش کے سلسلہ میں پیش آنے والے واقعہ پر تھوڑا سا غور کرنے سے انقلاب کے ساتھ اس کے تفاوت کو آسانی کے ساتھ درک کیا جا سکتا ہے۔ کسی حکومت کا تختہ الٹنا اس طرح کہ دستور و آئین کے خلاف فوج کی ایک اقلیت اپنی سازش کے تحت برسر اقتدار افراد کو حکومت سے بے داخل کر دے کہ جس میں لوگوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ یوگسلاویہ کی راجدھانی، بیلگراڈ میں ہزاروں مظاہرین نے ملک کے صدر جمہوریہ میلو سوویچ کے خلاف اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔ وہ ہاتھوں میں پلاک کارڈ لئے ہوئے میلوسوویچ کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے اس سے اقتدار سے ہٹنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میلوسوویچ ایک نامعلوم اور محفوظ جگہ چھپا ہوا تھا اور منظر عام پر آنے سے اجتناب کرتا تھا۔ لوگوں کے غم وغصہ ٹھنڈا کرنے اور اعتراضات سے بچنے کے لئے اس کا آخری حربہ قبل از وقت انتخابات کا وعدہ تھا۔ تھوڑی مدت کے بعد انتخابات کرائے گئے اور میلوسوویچ کا رقیب، ''کوشتونیکا'' برسر اقتدار آنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس شورش کی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شورش، بغاوت اور ناراضگی کے بحران کے

نتیجہ میں سیاسی نظام کے ایڈمنسٹریشن میں تبدیلیاں آتی ہیں، لیکن اس کی بنیادوں کو اکھاڑ کر ان کو بالکل تبدیل کرنے کا سبب نہیں بنتے۔ بغاوت میں صرف خود تبدیلی کی اہمیت ہے نہ اس کی جگہ پر جانشین نظام کی۔

جو معاشرہ حکمران طبقہ سے مکمل طور پر ناامید نہ ہوا ہو، وہ امید رکھتا ہے کہ بعض اصلاحات کے ذریعہ معاشرہ پر حکمراں طبقہ کے حالات میں کسی طرح تبدیلی ایجاد کر کے کم سے کم نقصان پر اپنے مطالبات کو معمول کے مطابق نظام کے اندر ہی پورا کرے۔اس تحریک اور تبدیلی کو اصلاحات کہتے ہیں، جو نظام کے اندر ہی تبدیلی ایجاد کر کے اس کو حفظ کرتے ہوئے انجام پاتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر چہ مشروطیت کی تحریک کو انقلاب کہا جاتا ہے، حقیقت میں یہ ایک اصلاحاتی تحریک تھی، جس نے قاجار سلطنت کو برقرار رکھتے ہوئے مظفرالدین شاہ کی منظوری حاصل کر کے استبدادی نظام کو مشروط سلطنتی نظام میں تبدیل کیا۔

تاریخ معاصر کا منحوس ترین مظہر، استعمار ہے۔اس سلسلہ میں یورپی ممالک نے افریقہ، ایشیا اور براعظم امریکہ کے دوسرے ممالک پر فوجی اور سیاسی تسلّط جما کر تعمیر وترقی اور فلاح و بہبود کے نام پر ان کے مالا مال منابع کو لوٹ کر یورپ کی حالیہ صدیوں کی تاریخ پر ایک بدنما داغ لگادیا ہے۔انگلستان ایک زمانہ میں اپنے مقبوضہ علاقوں کو وسعت بخشتے ہوئے دعویٰ کرتا تھا کہ ایک چھوٹے جزیرہ پر مشتمل اس کے ملک کی سرزمین پر سورج کبھی ڈوبتا ہی نہیں ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں نو آبادی علاقوں میں اجنبیوں کے تسلط کے خلاف عوامی بغاوتیں شروع ہوئیں۔ان علاقوں کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنے ملک کو یورپی قابضوں کے تسلط سے آزاد کرنے میں کامیاب ہوئے۔انگلستان کے تسلط کے خلاف ھندوستان میں مہاتما گاندھی کی تحریک اور فرانسی تسلط کے خلاف الجزائر کے لوگوں کی بغاوت آزادی کی ان تحریکوں کے نمونے ہیں۔اس قسم کی عوامی تحریکوں کا مقصد، صرف اجنبیوں سے آزادی حاصل کرنا ہوتا ہے، استعمار کے زیر اثر قائم ہوئے نظام کی قدروں اور ثقافت میں تبدیلی لانے کی طرف کوئی خاص توجہ

نہیں دی جاتی ہے۔اس لئے ایسی تحریکوں کو انقلاب کے بجائے آزادی کی تحریکوں کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم کتاب کے اس حصہ میں تاریخ میں پائے جانے والے انقلابات کی مشترک صورت حال کی تحقیق کر کے حتی الامکان انقلاب کے عمیق معنی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

لفظ''انقلاب'' کی تعریف میں پائے جانے والے تمام اختلافات کے باوجود،ایک نکتہ جو یقینی طور پر ہر ایک کے نزدیک مطلوب ہے وہ یہ کہ انقلاب کا معنی:''ایک معاشرے کے اندر مختلف جہتوں سے تحول یعنی تحمیلی اقتدار واعتقاد، سیاسی اداروں،اجتماعی ڈھانچوں،قیادت کے آئین واصول اور سرگرمیوں میں فوری اور بنیادی تبدیلی لانے کی ایک تحریک ہے جو تشدد کے ساتھ ہو۔''اس بنا پر انقلاب کے معنا ومفہوم کی تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان تبدیلیوں کی بنیاد، جہت اور تحریک کے عوامل کے بارے میں توجہ کریں اور انھیں ایک تصویر کے مختلف ٹکڑوں کے مانند ایک دوسرے سے ملا کر ایک مکمل تصویر کی صورت میں انقلاب کی خصوصیات کو اخذ کریں۔

چونکہ انقلاب ایک سیاسی، اجتماعی مظہر ہے نہ کہ صرف علوم سیاسی کے دانشوروں کے مطالعہ کا موضوع ہے، بلکہ سماجی دانشوروں کی توجہ کا سبب بھی ہے اور چونکہ معاشرہ شناسی کا اہم ترین رکن، جس سے معاشرے کی خصوصیات اور اس کی تبدیلیوں کے سلسلہ کی تحقیق کی جاتی ہے،انسانوں کے اجتماعی افعال ورفتار کی شناخت اور اس کی تحلیل ہے،اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ جب تک انسانوں کے افکار واذہان نہ بدل جائیں، کہ جن کی بنا پر وہ عمل کرتا ہے،ان کے اجتماعی کردار میں بھی تبدیلی نہیں آئے گی اور معاشرے کے افراد کے اجتماعی کردار میں تبدیلی آئے بغیر معاشرے میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا۔

دوسرے الفاظ میں معاشرہ کی اخلاقی فضیلتوں ،معاشرہ میں موجود معتبر اور رائج اقتدار سماجی لیڈروں کی خصوصیات اور کلی طور پر پورے معاشرہ پر محیط اعتقادات میں تبدیلی معاشرے کے

اندر نئے مطالبات اور تقاضوں کے پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ چونکہ معاشرہ کے سیاسی قائد اور حکمران ان نئے مقاصد اور قدروں سے دور ہوتے ہیں، اس لئے یہ تضاد اور تعارض یا دوگانگی معاشرے میں بدامنی اور بے ثباتی کا سبب ایجاد کرتی ہے۔

شائد معاشرے کی طرف سے مورد تحسین و ستائش قرار پانے والے سورماؤں کی خصوصیات کی تحقیقات کرنا، اس امر کو سمجھنے کے لئے ایک مناسب طریقہ ہو کہ معاشرہ کے اندر کیا ہو رہا ہے اور کن قدروں کی مقبولیت ہے اور معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنے کے مقاصد کیا ہیں؟ ہر معاشرے میں اور ہر حالت میں ایسے معیار موجود ہوتے ہیں جو مختلف افراد کے بارے میں فیصلہ کرنے میں عام لوگوں کے افکار کے لئے اصول شمار ہوتے ہیں، یہ ایسے معیار ہوتے ہیں جنھیں بعض افراد اجتماعی اُمور میں اپنے لئے استناد قرار دے کر اپنے آپ کو لوگوں میں مقبول بناتے ہیں اور اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ ان معیاروں کی تحقیقات یہ جاننے کے لئے ایک مناسب طریقہ ہے کہ معاشرہ کس قسم کے اقدار اور مقاصد کا پابند ہے۔ اس طرح ان معیاروں میں تبدیلی بھی معاشرہ کے اندر ان اقدار اور مقاصد میں تبدیلی کی علامت ہو گا۔[1]

سماجی بنیادوں پر ایسے نظریات اثر ڈالتے ہیں جو محرک کے اقدار کو عمومی تحریکوں میں تبدیل کر دیں یا آئڈیالوجی کے ایک قانون کی طرح معاشرے کے تمام لوگوں تک اس کو پہنچائے اور

۱۔ مثال کے طور پر فرانس کے معاشرہ میں انقلاب سے پہلے برتری اور فضیلت کا معیار اعلیٰ طبقہ کے لوگوں سے وابستہ ہوتا تھا۔ جبکہ انقلاب رونما ہونے اور ان میں وسعت پانے سے رفتہ رفتہ علمی مطالعہ، تعلیم اور اکاڈمک آثار جیسے دوسرے معیار معاشرے میں وجود میں آ گئے اس قسم کے معیاروں کے وجود میں آنا، لوگوں کی انفرادی قدروں کی طرف توجہ دینے کے لئے تفکرات میں بالیدگی کی علامت قرار پایا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تفکرات فرانس کے انقلابی نعروں کے اصلی بنیاد بن گئے۔ یہ نعرے یوں تھے: ''برابری'' ''برادری'' ''آزادی''۔

معاشرہ انھیں قبول کرے۔اس طرح معاشرے کے اندر رائج اقدار میں تبدیلیاں ایک نئے محرک کے پیدا ہونے کا سبب واقع ہوتا ہے،اور یہ حالت معاشرہ کے سسٹم میں موجود روزمرہ امن وثبات کو درہم برہم کر کے رکھدیتی ہے اور معاشرہ کے سیاسی ڈھانچے کو بے ثباتی ،بدنظمی اور شورش کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے۔ان حالات میں ممکن ہے حکمراں طبقہ دو قسم کا ردعمل ظاہر کرے:

۱۔معاشرے کے نئے مطالبات کو قبول کرے اور اپنے حکومتی سسٹم میں اصلاحات ایجاد کر کے یا معترضین کو کچھ امتیازات دے کر انھیں قابو میں لائے اور معاشرے میں دوبارہ اپنا نظم ونسق برقرار کرے۔[۱]

۲۔نئے مطالبات کو بالکل مسترد کرے اور مطالبہ کرنے والوں پر قابو پانے کے لئے زور وزبردستی اور تشدّد کا سہارا لے۔

پہلی حالت،حقیقت میں ایک انقلاب کو روکنے کی حکمت عملی ہے،اور اس کے بعد معاشرہ پھر سے اپنی پچھلی حالت میں کی طرف لوٹ آئے گا۔لیکن دوسری حالت میں معاشرہ رفتہ رفتہ اور مرحلہ بہ مرحلہ انقلابی حالت سے نزدیک تر ہوتا جائے گا۔مطالبات اور تقاضوں پر قابو پانے کے لئے حکام کی کوشش ان کے طاقت کے منابع کو کھودینے کا سبب بن جاتی ہے،یعنی حکومت لوگوں کی نظروں میں اپنی مقبولیت کو پہلے سے زیادہ کھودیتی ہے۔گویا اب حکام کی کسی بات اور وعدہ پر لوگوکو اعتماد نہیں ہوتا اور لوگ انھیں قبول نہیں کرتے اور جو لائحہ عمل اور تجویز وہ پیش کرتے ہیں لوگ اسے ایک دھوکہ، فریب،جھوٹ،مذاق اور تمسخر سے تعبیر کرتے ہیں ۔اس طرح حکومت اپنے لئے ایسے جواز کی بنیادوں کو کھودیتی ہے،جن کی بنا پر وہ اپنے آپ کو معاشرہ پر حکومت کرنے اور سیاسی اقتدار سنبھالنے کا حقدار سمجھتی تھی۔اب لوگ اس قسم کے نظام کے حکام کو حکمران کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے ،قانون

۱۔ایران میں چالیسویں دہائی کا ''انقلاب سفید'' ان انقلاب دشمنیوں کا ایک نمونہ تھا: مطالبات کا جواب دینے کے لئے جو منصوبہ بنایا جاتا تھا وہ آگے چل کر حکومت کے خلاف اعتراضات اور تحریک کو شدت بخشنے کا سبب بن جاتا تھا۔زمین کے اصلاحات کا وعدہ، پہلوی نظام کے لئے مزید چند برس حکومت کرنے کے لئے ایک سودا تھا، جسے اس حکومت نے قبل از وقت ادا کیا۔

اور حکومت کے اداروں کی اطاعت کے لئے کوئی دلیل نہیں رکھتے۔اس حالت میں نظام اپنے جواز کے بحران سے دوچار ہوتا ہے۔

مذکورہ مباحث سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک سیاسی تحریک کو انقلاب کے عنوان سے پہچاننے میں مندرجہ ذیل مطالب کلیدی رول ادا کرتے ہیں:

- انقلاب، برسر اقتدار سیاسی نظام میں تبدیلی لانے کا سبب واقع ہو۔
- انقلاب رونما ہونے کی صورت میں معاشرے پر سایہ فگن افکار ونظریات میں تبدیلی آنی چاہئے۔

انقلاب کے یہ دو مجموعہ ایک اعتبار سے، ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں (دونوں ملکر موثر واقع ہوتے ہیں) معاشرے کے آئین واقتدار اور لوگوں کی ذہنیتوں میں تغیر ایجاد کرتے ہیں، کیونکہ موجودہ حالت، معاشرہ کی اکثریت کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی اور سیاسی نظام میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس کیا جاتا ہے۔دوسری طرف سے ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنے افکار واعتقادات میں تبدیلی پیدا کر کے نئے مطالبے پیش کرتے ہیں، اس لئے وہ انقلاب کے محرّک شمار ہوتے ہیں، اس طرح لوگوں کی شرکت کے بغیر سیاسی نظام میں تبدیلی رونما ہونا انقلاب نہیں کہلاتا ہے۔لیکن جب ہم بحث کو کتب خانوں اور علمی محفلوں سے نکال کر انسانی معاشرے کے میدان میں لے جاتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کا رونما ہونا اس قدر واضح نہیں ہے۔ برسر اقتدار نظام موجودہ حالت کی پائداری چاہتا ہے اور ہمیشہ اپنے جائز، قانونی اور برحق ہونے کا دفاع کرتا ہے۔اس لئے اپنے مخالفین کے طرز تفکر کو محدود کرنے اور حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے میدان مبارزہ میں اتر آئے مخالفین کو سزا دینے اور کچلنے کے لئے ہر ممکن فرصت سے استفادہ کرتا ہے۔ان اوصاف کے پیش نظر ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ برسر اقتدار نظام کی مخالف تحریکیں جس قدر زیادہ اجتماعی اثر ورسوخ پیدا کریں گی، حکومت کی جانب سے انھیں اتنی سختی وشدت کے ساتھ کچلا جائیگا، یہاں تک کہ انقلاب کے آخری مراحل میں توڑ پھوڑ کی کاروائیاں اور لوگوں کا وسیع پیمانے پر سڑکوں پر آجانا ایک امر ناگزیر ہے اور اس

طرح معاشرہ عوام اور حاکم طبقہ کے درمیان میدان کارزار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

حاکم طبقہ کے لئے مشروعیت اور جواز کا بحران اور اس کے بعد لوگوں کا حکام کے مقابلہ میں صف آرا ہونا، معاشرے کے لئے تعطل کا باعث ہے اور اس کے بعد عملی تشدد کی کاروائی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ نا امنی اور بے ثباتی کی یہ حالت زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی ہے۔ معاشرے کو فوری طور پر اس ھنگامی حالت سے نکل کر اپنی عادی حالت کی طرف آنا ہوگا۔ اسی لئے مجبوراً واقعات تیزی کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔

دانشوروں اور انقلاب سے متعلق ماہرین کے نزدیک ایک معاشرہ کے انقلابی حالات تک پہنچنے کے اسباب اور عوامل قابل بحث ہیں اور اس میں اختلاف ہے۔ یہاں پر ہم ان نظریات کا ایک اجمالی جائزہ لیں گے۔

انقلاب کے حوالے سے تحقیق کے بارے میں مشخص طور پر دو بالکل متفاوت مکتب پائے جاتے ہیں:

ا۔ مکتب تضاد:

مکتب تضاد میں مشخص ترین نظریہ، انقلاب کے بارے میں ''مارکس'' کا نظریہ ہے اور یہ پہلا نظریہ ہے جس نے تاریخی تبدیلیوں کی تحقیقات سے انقلاب کو ایک نا قابل انکار مظہر اور معاشرہ کی ترقی اور تبدیلی کے لئے ایک مثبت اور اہم ترین عامل کے طور پر پیش کیا ہے۔

انقلاب کے بارے میں مارکس کے نظریہ کو سمجھنے کے لئے اسے سیاسی معاشرہ شناسی کے باب میں قرار دینا چاہئے اور اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ہمارے موضوع کے دائرہ سے خارج ہے۔ لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیداوار کا طور طریقہ، معاشرہ کی بنیادی اور اس میں مختلف تغیر کو جنم دیتا ہے۔ پیداوار کے طریقہ کار میں تبدیلی ایک نئے طبقہ کے وجود میں آنے کا سبب ہے اور اس طبقہ اور حکمراں طبقوں کے درمیان ٹکراؤ انقلاب رونما ہونے کا موجب قرار پاتا ہے۔ مثلاً زراعت سے صنعت میں پیداوار کے شیوہ میں تبدیلی بورژوا طبقہ کی پیدائش کا سبب بنی اور ان کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ

بورژوائی انقلاب تھا اور یہ بذات خود مزدور طبقہ کی پیدائش کا سبب بنا اور پھر پرولتر اور بورژوا طبقہ کے درمیان ٹکراؤ اشتراکی انقلاب کو وجود میں لاتا ہے۔

اس بناء پر مکتب تضاد کے دانشوروں کے نظریہ کے مطابق اجتماعی امن وسکون ہر معاشرے کی تاریخ کی منطق کے استثنائی مواقع میں شمار ہوتا ہے، جبکہ ہر معاشرے کے ارتقااور ترقی کی بنیاد ایسے انقلابوں پر منحصر ہے جو مذکورہ منطق سے رونما ہوئے ہوں اور ان کی بنیاد طبقاتی ٹکراؤ اور کشمکش ہے۔[۱]

۲۔مکتب اصالت کار:

اس مکتب کی بنیاد ''امیل دورکیم'' کے نظریات پر تشکیل پاتی ہے۔ دورکیم معتقد تھا کہ معاشرہ افراد کی مقدار کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ ایک علٰحیدہ کیفی اور حقیقت ہے، کہ جو عادی حالات میں افراد کی انفرادی عقل پر اجتماعی رسم ورسوم مسلط ہونے سے پیدا ہوتی ہے اور مختلف افراد اور گروہوں کے درمیان کام کی تقسیم بندی' ایک علٰحیدہ اور منظّم معاشرہ تشکیل دیتی ہے کہ جس مین مختلف اور گوناگون قوتیں اپنے فریضہ اور اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح انجام دیتی ہیں اور ان کے درمیان تعادل برقرار ہے۔ لیکن کام کی تقسیم بندی صرف عادی حالات میں یکجہتی کا سبب بنتی ہے۔ غیر عادی صورت میں کام کی تقسیم' قوتوں کے ایک دوسرے سے ٹوٹنے کا سبب بنتی ہے اور جس کے نتیجہ میں بے نظمی اور عدم توازن وجود میں آتا ہے۔

جب ایک معاشرہ ایسے حالات سے دو چار ہو کہ جس میں لوگ رنجیدہ، پریشان حال

۱۔ طبقاتی جنگ کی بنیاد اور مفہوم کو ارسطو کی کتاب ''سیاست'' میں معلوم کرنا چاہیے۔ اس کتاب میں انقلاب کا متبادل لفظ stassis فتنہ انگیزی کے معنی میں ہے اور یہ تین معنی میں استعمال ہوا ہے:

- حکمران طبقہ میں غیر قانونی اور تشدد آمیز تبدیلی۔
- ملک کے آیئن میں تبدیلی۔
- حکومت یا نظام کی تشکیل میں تبدیلی۔

ارسطو اور مارکس کے نظریہ میں بنیادی تفاوت یہ ہے کہ مارکس کا معاشرہ شناسی کا تاریخی سسٹم انقلاب کو ایک جبری اور قطعی تبدیلی اور ایسے واقعات کا نتیجہ جانتا ہے کہ معاشرے کی تاریخ نے اسے اپنے اندر ذخیرہ کیا ہوتا ہے۔ جبکہ ارسطو کا ایسا نظریہ نہیں ہے۔

اور غضبناک ہوں، تو ایسا معاشرہ اپنے عوام پر دباؤ ڈالتا ہے تا کہ وہ بامعنی طریقہ سے اپنے رنج وغم کا اظہار کریں ۔ چنانچہ یہ معاشرہ انھیں رونے، فریاد بلند کرنے اور یا اپنے آپ کو یا دوسروں کو نقصان پہنچانے پر مجبور کرتا ہے، کیونکہ یہ اجتماعی مظاہرے اور اخلاقی روابط، کہ جنھیں وہ بیان کرتے اور تقویت بخشتے ہیں، ایسے حالات میں وہ اس وقت کے شرائط کے تحت جو قدرت اور توانائی ایک دوسرے گروہ سے چھین لی تھی اس کو واپس کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کی مدد کرتے ہیں تا کہ وہ آرام سے رہیں۔

دورکیم کے نظریات، انقلاب کے بجائے بیشتر اجتماعی تبدیلیوں کے بارے میں ہے، خاص کر اس کی اصلی بحث کا موضوع اجتماعی یکجہتی پر معاشرہ کے صنعتی ہونے کے اثرات پر مشتمل ہے۔ لیکن دوسرے مفکرین نے دورکیم کے مطالعہ سے استفادہ کر کے ''کمائی کی اصلیت کے مکتب'' کی داغ بیل ڈالی ہے۔

''کمائی کی اصلیت کے مکتب'' میں انقلاب کا نظریہ پیش کرنے والے اہم ترین مفکروں کے بارے میں، ہم ذیل میں جائزہ لیں گے:

ا۔ چالمرز جانسن: اس مؤلف کے نظریہ کے مطابق، بنیادی طور پر انقلاب، معاشرے اور اس کے اجتماعی اصول کے درمیان ارزش واہمیت کے لحاظ سے عدم ہماھنگی ہے۔ معاشرے کا نظام اور اس کے سسٹم کا توازن چار منابع کے اثر کے نتیجہ میں بگڑ جاتا ہے:

(الف) خارجی عوامل کی وجہ سے اس کی اہمیت وارزش میں تبدیلی۔

(ب) داخلی عوامل کی وجہ سے اس کی اہمیت وارزش میں تبدیلی۔

(ج) خارجی عوامل کی وجہ سے ماحول میں تبدیلی: مثال کے طور پر وہ اثرات جو صنعتی انقلاب نے مختلف معاشروں پر ڈالے ہیں۔

(د) داخلی عوامل کی وجہ سے ماحول میں تبدیلی: جیسے آبادی کا بڑھنا اور نئے گروہوں کا وجود میں آنا۔

۲۔ سا موئل ھانٹیگٹن: اس نے معاشرے کے اندر تغیر و تحول کے حوالے سے ''سیاسی تعلیم'' نامی اپنی کتاب میں انقلابوں کے رونما ہونے اور ان کے عوامل کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا ہے ۔اس کی نظر میں بنیادی طور پر انقلاب ایسے معاشروں میں رونما ہوتا ہے جو ایک طرف سے ایسے گروہوں کی مشارکت اور سیاسی سرگرمیوں کے شاہد ہوتے ہیں جو اس سے پہلے سیاسی میدان سے دور تھے اور دوسری طرف سے ان معاشروں میں ایسے گروہ کو جذب کرنے کے لئے سیاسی اداروں کا فقدان ہوتا ہے، یعنی ایسے معاشرے جن میں ''سیاسی تعمیر نو' وجود میں آیا ہو۔لیکن سیاسی ترقی ابھی رونما نہ ہوئی ہو۔

۳۔ ماکس وبر: وہ دورکیم کے نظریہ سے ''سنت'' کے مفہوم سے الہام حاصل کرتے ہوئے ابتداء میں مشروعیت اور سیاسی اقتدار کے لئے تین منابع بیان کرتا ہے: سنت، قانون (عقلانیت) اور کاریزما (رسمی اقتدار) متوازن اجتماعی وضیت کی بنیاد ہے ۔خلل ڈالنے والی دو طاقتیں (ایک عقلانیت دوسرے کاریزما) اس حالت کو درہم برہم کرسکتی ہیں۔قوت عقلانیت توانائی اور کارنیرما کی توانائی عقلی توانائی سنت کے خلاف پہلے درجہ کی انقلابی توانائی ہوسکتی ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔

قوت عقلانیت' پہلے اجتماعی ماحول میں تبدیلی کا سبب بنتی ہے ۔اور اس کے بعد لوگوں کے اعتقادات کو درہم برہم کرنے کا باعث بنتی ہے ۔لیکن کاریزما قوت عقلانیت کے برخلاف کہ پہلے، اصول اور ضابطوں کو درہم برہم کر کے ابتدائی مرحلہ میں شخص کی اندرونی زندگی میں انقلاب برپا کرتی ہے۔ ''کاریزما'' ایک ایسے شخص کی صفت ہے جو فوق فطرت' فوق انسانی اور یا کم از کم استثنائی وغیر معمولی توانائی یا خصوصیت کا مالک ہو۔وہ ان خصوصیتوں سے لوگوں کو اس تحریک اور رہبری میں شامل ہونے کے لئے استفادہ کرتا ہے۔ ''کاریزمائی'' قوت، ظاہری واکتسابی مقامات ومراتب، آمریت اور ملاحظات عقلانی سے جدا ہے اور یہ بذات خود ایک پیغمبرانہ انقلاب کی متضمن ہے۔

اور ''وبر' مزید کہتا ہے ہے کہ کاریزمائی قیادت نفسیاتی، روحی، اقتصادی، اخلاقی مذہبی فشار اور

دباؤ کے دوران ظاہر ہوتی ہے۔

۴۔فردگرائی اور نفسیاتی نظریہ: اس نظریہ کے مطابق انقلابی حالت کی پیدائش بنیادی طور پر فرد کی حالت یا اس حالت کے بارے میں فرد کے تصور سے مربوط ہوتی ہے۔موضوع بحث یہاں پر نہ تو طبقات اور اجتماعی گروہوں کے منافع ہیں اور نہ ہی حکومتی طاقت کی تشکیل یا اجتماعی یکجہتی بلکہ ''فرد'' کی عینی یا ذہنی کیفیت و حالت ہے۔

فردگرائی اور نفسیاتی نظریات ، جو فلسفی نکتہ نظر سے ''مکتب اصلیت کمائی'' پر مبنی ہے، کا اصلی مفروضہ یہ ہے کہ انسان کچھ بنیادی مطالبات اور خواہشات رکھتا ہے، اگر اس کے یہ مطالبات اور خواہشات رد کر دیئے جائیں یا وہ ان میں ناکام ہو جائے ،تو وہ تشدّد اور جھگڑے پر اُتر آتا ہے۔سیاسی تشدّد اور انقلابی رفتار کا اصلی سبب یہی جھگڑا ہے۔اس نظریہ کو پیش کرنے والے افراد کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

سوروکین: وہ جبلّتوں کے کچلنے کو انقلابی حالات کے پیدا ہونے کا سبب جانتا ہے۔

توکویل: اس کا عقیدہ سوروکین کے برعکس ہے اور وہ انسان کی زندگی کے حالات میں بہتری اور اس کی توقعات میں افزائش کو سیاسی ناراضگی اور اختلاف (جھگڑے) کی اصلی وجہ تصور کرتا ہے ۔وہ فرانس کے انقلاب کی اصلی وجہ اس ملک کے لوگوں میں انقلاب سے پہلے حد سے زیادہ آرام طلبی کا رائج ہونا سمجھتا ہے۔اس نے کہا ہے:

''یہ صحیح نہیں ہے کہ ہمیشہ انقلاب اس وقت رونما ہوتا ہے جب حالات بگڑ جائیں۔اس کے برعکس، عام طور پر انقلاب اس وقت رونما ہوتا ہے، کہ جب لوگ طولانی مدت تک کسی اعتراض کے بغیر ایک جابر حکومت میں زندگی گزارتے ہوئے، اچانک احساس کریں کہ حکومت نے ان پر دباؤ ڈالنا کم کر دیا ہے، تو اس کے نتیجہ میں وہ حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں''

انقلاب کے بارے میں چند قدامت پسند نظریے بھی پائے جاتے ہیں:

ایڈمونڈ برک، اس سلسلہ میں دلچسپ ترین نظریات رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں معاشرہ عقل کے بجائے دیرینہ سنّت اور تعصبات پر استوار ہے اور انقلاب جوان تعصّبات کو مٹانا چاہتا ہے، معاشرہ کے پیکر کو عظیم نقصان پہنچاتا ہے۔ انسان معاشرے میں صرف معمولی تبدیلیاں ایجاد کر سکتا ہے اور علیحدگی چنانچہ انتہا پسند انقلابیوں کا اپنی آرزوؤں سے ہم آہنگ کی کوششیں معاشرے کے لئے مصیبت کا سبب بن جاتی ہیں لہذا ان کی کوششوں کا نتیجہ صرف ''ملتوں کے بنک اور عمومی سرمایہ'' کو تباہ کرنا ہوتا ہے۔ آزادی کی دولت اور رسم و رسوم کا یہ سرمایہ اتفاقی طور پر ہاتھ نہیں آتا ہے بلکہ تاریخ بشریت کے تجربہ اور تفکر کا نتیجہ اور انفرادی زندگی کی ضمانت ہے۔

برک کہتا ہے:

''اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ ہر انسان کا کام اور اس کی زندگی صرف اس کے شخصی سرمایہ یعنی عقل کے حوالہ کر دی جائے۔ کیونکہ ہماری نظر میں، یہ سرمایہ ہر انسان میں بہت کم ہے اور اس کے برعکس بہتر ہے کہ انسان تمام اقوام اور زمانے کی عقل کے سرمایہ سے استفادہ کرے۔''

انقلاب کی کامیابی و ناکامی، انقلاب کے رونما ہونے کے عوامل اور خصوصیات اور اسی طرح انقلاب کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے دانشوروں کے نظریات کا موازنہ پیش کرنے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ انقلابوں کے رونما ہونے کے تین ممتاز مراحل کی تحقیق، نیز اس سے متعلق تجزیہ و تحلیل کی جائے:

پہلا مرحلہ: ایک ایسے معاشرہ کے حالات اور شرائط جو بالقوہ صورت میں انقلاب رونما ہونے کے لئے موافق و سازگار ہوں۔

دوسرا مرحلہ: انقلاب کی کامیابی کے عوامل۔

تیسرا مرحلہ: وہ عوامل جو انقلاب کے باقی رہنے یا ناکام ہونے کا سبب واقع ہوتے ہیں۔

دوسری فصل:

انقلاب کے تین مراحل

پہلی گفتگو: انقلاب سے پہلے سیاسی اور اجتماعی حالات

دوسری گفتگو: اجتماعی اقتدار کی تشکیل اور انقلاب کا ظہور

تیسری گفتگو: انقلاب کی کامیابی کے بعد کا دور

پہلی گفتگو:

انقلاب سے پہلے سیاسی اور اجتماعی حالات

انقلاب کے لئے ایک معاشرہ کے حالات اور شرائط کا فراہم ہونا ایسے اہم مسائل میں سے ہے کہ جن کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔ کسی زمان و مکان میں ایک مثالی انقلاب کی کامیابی اس وقت ممکن ہوگی جب معاشرہ پر دو بُعدی حالات حکم فرما ہوں۔ ایسے حالات، جن میں برسر اقتدار سیاسی نظام سے اجتماعی طبقہ کٹ کر رہ گیا ہو اور اس کے مدمقابل صف آرا ہو۔ ایسا معاشرہ ایک قسم کی دوگانگی وقدرت سے دوچار ہوتا ہے۔ ابتدا میں سیاسی قدرت کی مشروعیت اور اس کا برحق ہونا موردسوال قرار پاتا ہے اور اس کے بعد سیاسی قدرت کی یاس و نا امیدی سے دوچار ہونے کی وجہ سے لوگ اس نظام سے رفتہ رفتہ عاجز ہوتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف سے بہت حد تک اطمینان و توانائی پیدا کرنے والی اجتماعی طاقتیں، سیاسی نظام سے منہ موڑ کر اس کے مقابلہ میں کھڑی ہو جاتی ہیں، اس طرح سیاسی طاقت اور اجتماعی طاقت کے درمیان فاصلہ تدریجاً بڑھتا جاتا ہے یہاںتک کہ معاشرہ میں ایسے حالات کا برقرار رہنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

''اریک ہافر'' کا اعتقاد ہے کہ اگرچہ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ انقلاب معاشرہ میں شدید تبدیلیاں ایجاد کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ تبدیلیاں ہی انقلاب رونما کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق، انقلابی ماحول، ان مشکلات، تقاضوں اور مطالبات کا نتیجہ ہے جو بنیادی تبدیلیوں کے وقت پیدا ہوتے ہیں[۱]۔

جب تک ایک معاشرہ کی حیثیت اور اس کے اندر پائے جانے والے حقائق آپس میں سازگار ہیں اس وقت تک، معاشرہ انقلاب سے محفوظ ہے اور جب معاشرہ میں توازن کی حالت برقرار ہے تو اپنے ہی افراد کی طرف سے اور خارج سے مسلسل اثرات کو قبول کرتا ہے، ان دونوں کا مجموعہ

۱۔ چالرز جانسن، ''انقلابی تبدیلی'' (انقلاب کے ظہور کے سلسلہ میں نظریاتی تحقیق) ص ۴۶

معاشرہ کو کام کی تقسیم بندی کے طریقہ کو اپنی حیثیت کے مطابق ہم آہنگ ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اس بنا پر سیاسی قدرت اور اجتماعی قدرت کے درمیان ٹکراؤ، انقلابی تعارضات کا اصلی سرچشمہ ہے، اور سیاسی قدرت کا سرچشمہ حکمرانوں اور ماتحتوں کے درمیان روابط کا معمول کی حالت پر برقرار رہنا ہے۔

دوسرے الفاظ میں سیاسی قدرت، معاشرہ کے مختلف قانونی اداروں کا ایک مجموعہ ہے جو مادی وسائل یعنی فوجی، اقتصادی اور قانونی شعبوں پر تسلط رکھنے کے سبب معاشرہ کے امور کو چلانے کی باگ دوڑ اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔ جبکہ اجتماعی قدرت، وہ قدرت ہے جو معاشرہ کے افراد پر معنوی اثر نفوذ کے لحاظ سے اور مشترک قدروں کی بنیاد پر معاشرہ کے افراد کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنی طرف جذب کرتی ہے۔

اس بنا پر ''اجتماعی قدرت'' افراد کی اجتماعی موقعیت اور مقام کا نتیجہ ہے، اور اعتبار و روابط کی بنیاد پر تسلط اور تابعیت کا جواز حاصل ہوتا ہے۔ اجتماعی قدرت مطلقاً معاشرہ کے افراد کے اعتماد و اطمینان پر منحصر ہوتی ہے اور خاص کر اجتماعی قیادت پر اس کا اعتماد ہوتا ہے۔ ''سیاسی طاقت'' بھی جب تک ایسے شرائط کی حامل ہو جس کے اجتماعی طبقہ معتقد ہے، تو سیاسی نظام کم از کم ان کے مطالبات کو پورا کرنے اور متعارف اجتماعی روابط کو تحفظ و دوام بخشنے کی طاقت رکھتا ہے۔

معاشرہ میں قدرت کا وجود ہی خود بخود قدرت پر رقابت کے لئے اکساتا ہے اور اس قسم کی سیاسی رقابتیں تشدّد کے ہمراہ ہوسکتی ہیں۔ اقتدار پر مبنی نظام، ان تعارضات میں سے بعض کو، اس بات پر توافق پیدا کرنے کے لئے کہ، کن افراد کو کونسے منصب کس طرح سونپے جائیں، قدرت کے بارے میں رقابت کے لئے ایک قاعدہ وقانون وضع کرتے ہیں تاکہ دیگر تمام تعارضات کو ایک متعارف حالت میں قرار دینے کی کوشش کریں۔ اگر سیاسی قدرت رکھنے والے افراد، معاشرہ کے اقتدار پر مبنی نظام کے لئے جھگڑا کرنے لگیں، تو اجتماعی قدرت کی باگ ڈور سنبھالنے والی شخصیتیں، اپنی معنوی قوت کے ذریعہ اس کا مقابلہ اور تنبیہ کریں گی اور اگر یہ جھگڑا قابل اصلاح نہ ہو تو شورش و انقلاب برپا ہونے کا امکان ہے۔

مشترک اقدار کا وجود، اجتماعی گروہوں اور سیاسی طاقتوں کے درمیان تعارض پیدا ہونے کے احتمال کو کافی حد تک کم کرتے ہیں۔

اس بنا پر انقلابی حالات کو مشتعل کرنے اور سیاسی۔ اجتماعی تبدیلیوں کو ناگزیر بنانے کے لئے اہم عامل سیاسی نظام پر مسلط اقدار اور اجتماعی گروہوں پر حاکم اقدار کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے امریکی مصنف ''ویلبر مور'' مثالی معاشرہ اور موجود حقیقتوں کے درمیان فاصلہ کا سبب جانتا ہے[۱]، کیونکہ اجتماعی اقدار حقیقت میں ایک معاشرہ کے افراد کے وہی آگاہانہ و مشترک محرکات ہیں جو ایک معاشرہ کے دوام اور ثبات کے لئے سب سے پہلی ضروری شرط ہے۔ مشترک اقدار، مذہبی، دیو مالائی، اجتماعی، اخلاقی، قومی آداب و رسوم، ماورائے طبیعت تخیلات، مختلف آئیڈیل اور بہت سے دوسرے اعتقادات سے متعلق مسائل کے عقائد پر مشتمل ہیں۔

معاشرہ میں نظم برقرار کرنے اور کام کی تقسیم بندی کے لئے اقدار و معیار کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اس سے استفادہ کرنے کی صورت میں افراد کے بارے میں مشخص وظائف اور ذمہ داریاں نبھانے کے لئے زور زبردستی کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی، اقدار پر مبنی نظام افراد کے کردار اور اس کی حیثیت کو ایک معاشرہ کے اندر معین کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مشروعیت کا جواز فراہم کرتا ہے اور اگر اس قسم کے نظام میں حکومت کبھی بحرانی حالات سے دو چار ہو جائے اور پہلے سے معین شدہ مشروع طاقت کا استفادہ کرے، تو اس طاقت کا استعمال بھی مشروع اور قابل قبول تصور کیا جاتا ہے۔

انقلاب سے پہلے اجتماعی حالات کی سب سے اہم خصوصیت، سیاسی نظام کا اجتماعی گروہوں کے درمیان اعتبار اور مقبولیت کو کھو دینا ہے۔ ''ھانا آرنٹ'' کے بقول: ''جب تک معاشرے کے سیاسی نظام کا اعتبار اپنی جگہ باقی اور اس کے شرائط کامل ہیں، کسی قسم کا انقلاب، یہانتک کہ اس کی کامیابی کا احتمال اور تصور بھی ممکن نہیں ہے[۲]۔

1-Wilbert Moore social change Prenticehall New York 1974, P19

۲۔ چالرز جانسن ''انقلابی تبدیلیاں'' (ظہور انقلاب کی نظریاتی تحقیق) ص

جب حکومت پر اعتبار اور اعتماد اس قدر کم ہو جائے کہ سیاسی طاقت کا استعمال بے فائدہ نظر آئے ،تو معاشرہ کا نظم و نسق اور حکمرانی کرنے والے افراد کی طاقت صرف زور وزبردستی تک محدود ہوتی ہے اس کے علاوہ اس حالت کو بدلنے میں درست حکمت عملی اور منظّم تبدیلی بھی مفید نظر نہیں آتی ،اس طرح تغییر و تبدیلی پیدا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ان حالات میں سیاسی قدرت کے وجود کو بچانے کے لئے صرف تشدّد اور زور وزبردستی کا وسیلہ باقی رہ جاتا ہے۔پولیس اور فوج کے افراد میں اضافہ کیا جاتا ہے اور تشدّد کا سہارا لینا گویا تبدیلی کے عمل کو تاخیر میں ڈالنا ہے۔لیکن مسلح افواج پر بھروسہ کرنے والا اجتماعی نظام ،ایک پائدار اور مستحکم نظام نہیں ہے اور مشترک اقدار پر مبنی نظام شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں تشدّد آمیز تبدیلیوں کا رونما ہونا قطعی بن جاتا ہے۔

معاشرے کے اقدار پر مبنی نظریہ اس عقیدہ کو بالکل مسترد کرتا ہے کہ زور وزبردستی سے اجتماعی تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس کے برعکس، یہ نظریہ اس مفروضہ پر مستحکم ہے کہ ایک تشکیل یافتہ نظام میں،تشدّد اور زور کا جائز استعمال چند خاص مواقع تک محدود ہوتا ہے کہ جہاں اقدار پر عمومی توافق ممکن نہ ہو اور ان حالات میں بھی تشدّد کو آخری راہ حل کے طور پر قرار دیا جاتا ہے۔

انقلابی حالات پیدا کرنے والے اہم عوامل کے طور پر مختلف اقتصادی ،سیاسی ،اجتماعی،ثقافتی اور مذہبی عوامل کا نام لیا جاسکتا ہے۔

زمین کی مالکیت حاصل کرنے کے لئے ، بھاری ٹیکس،معاشرہ کے محروم اور فقیر طبقات کے لئے ضروریات زندگی کا حد سے زیادہ گراں ہونا،حکمران طبقہ میں فساد و بے ضابطگی ،فردی و اجتماعی آزادی کا سلب ہونا معاشرہ پر حاکم اقدا کی طرف سے بے اعتنائی ،فوجی اور سفارتی ناکامیاں،اجنبیوں کا بلا واسطہ یا بالواسطہ تسلطّ اور نفوذ اور قحط جیسے عوامل کو انقلابی حالات پیدا کرنے کی وجہ تصور کیا جاسکتا ہے۔

مارکس اور اس کے پیروؤں کے نظریہ کے برعکس اقتصادی محرومیاں انقلابی حالات پیدا کرنے کے لئے ضروری نہیں ہیں اور یقینی طور پر ایسے معاشروں میں انقلاب رونما نہیں ہوتا ہے کہ جو اقتصادی

بد حالی سے دوچار ہیں، بلکہ اس کے برعکس بہت سے معاشروں، من جملہ ایران میں، انقلاب اس وقت رونما ہوا جب اقتصادی حالت نسبتاً اچھی تھی لہذا ایران میں فقر و تنگدستی انقلاب رونما ہونے کا سبب نہیں بنا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انقلاب سے پہلے ایرانی معاشرے میں کوئی بھی گروہ اقتصادی بد حالی کے بارے میں گلہ مند نہیں تھا۔ کسی بھی معاشرے میں دو طرح کے گروہ اقتصادی محرکات کی وجہ سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں، ان میں سے پہلا اور کم اہمیت والا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حقیقی اور مشخص طور پر معاشرہ کے مفلس اور نادار لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بیشک تمام انقلابی معاشروں میں مفلس اور نادار لوگوں کا کوئی نہ کوئی گروہ موجود ہوتا ہے، جو اقتصادی دباؤ اور اپنی محرومیتوں سے نجات پانا چاہتے ہیں لہذا ان کا رد عمل، انقلاب کی انتہائی اہم خصوصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن یہ گروہ کبھی بھی ہمیشہ انقلاب کے ایک اصلی محرک کے حیثیت سے تصور نہیں کیا جاتا، اس امر کا حتی مارکیسسٹ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ٹروٹسکی یوں لکھتا ہے:

''حقیقت میں، صرف محرومیتوں کا وجود ایک بغاوت کو بھڑکانے کے لئے کافی نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عوام کو ہمیشہ انقلاب کی حالت میں ہونا چاہئے تھا۔''[1]

لیکن جس بات کی زیادہ ہے اہمیت اور حقیقت میں اقتصادی انقلاب کے لئے ایک محرک کے عنوان سے جس کا زیادہ اہم کردار ہے، وہ کسی گروہ یا گروہوں کے درمیان اس احساس کا وجود ہے کہ موجودہ حالات ان کی اقتصادی سرگرمیوں میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں یا ان کی سرگرمیوں کو محدود کر رہے ہیں۔

اس بنا پر اقتصادی شکوے عام طور پر واقعی اقتصادی پریشانیوں سے وابستہ نہیں ہوتے، بلکہ بعض ایسے اجتماعی گروہوں سے ان کا تعلق ہوتا ہے کہ، جن کے جائز حقوق سیاسی نظام کے ہاتھوں سلب کئے گئے ہوں۔ اس عامل اور اس عنصر کو انقلاب کی بنیادی علامتوں میں سے ایک تصور کیا جانا چاہئے۔

1-crane brinton'opcit'p'13'

البتہ یہ شکوے، تنقیدیں اور احساس محرومیت کے اشتہارات و اعلانات اور اجتماعی قیادت معمولاً ہڑتال اور احتمالاً ہڑتالوں اور اقتصادی مطالبات کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف سے اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ معاشرے کے طبقات کی اقتصادی بد حالی اور خاص کر اقتصادی امکانات کی غیر عادلانہ تقسیم انقلاب کے رونما ہونے کے عوامل میں سے ہوسکتی ہے، جیسے حکمران طبقہ کی عیش و عشرت کی زندگی بڑے بڑے محلّوں اور مجلّل عمارتوں میں سکونت، لباس فاخرہ اور گراں قیمت گاڑیوں کا استعمال، فضول خرچیوں اور عیاشی پر مبنی دعوتیں، اس کے مقابلہ میں عام لوگوں کا فقر و تنگدستی میں زندگی بسر کرنا اور ان کا گراں بازاری کے عالم میں روزمرہ کی ضروریات سے بھی محروم رہنا۔

انقلاب برپا ہونے کے عوامل کے طور پر طبقاتی اختلاف، ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ عام طور پر مطلق اختیارات کے ساتھ حکومت پر کنٹرول حاصل کرنے والی موروثی اور بادشاہی نظام یا حکومت پر قابض اریسٹوکریٹ طبقہ کے خلاف انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اس قسم کی حکومتیں مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں:

۱۔ حکومت سیاسی دباؤ اور روز افزوں گھٹن کے بل بوتے پر نظام چلاتی ہے۔

۲۔ ایک محدود اقلیت یا بیشتر مواقع پر صرف ایک شخص، تمام سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی شعبوں میں فیصلہ اور نفاذ کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔

۳۔ حکمراں طبقہ میں عام طور پر بدکاری اور خاص طور پر مالی خورد برد اور رشوت خوری وسیع پیمانے پر رائج ہوتی ہے۔

۴۔ ایسی حکومتیں اکثر سرمایہ دار اور عیّاش طبقہ پر بھروسہ کرتی ہیں۔

۵۔ حکام، اپنی حکومت کے تحفظ اور دوام کے لئے اپنے طاقتور اور وفادار فوجیوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

۶۔ چونکہ حکومت کو عوامی حمایت حاصل نہیں ہوتی ہے، لہذا بیرونی طاقتوں کے دباؤ اور اثر ورسوخ کے سامنے ہتھیار ڈال کر بیشتر ان ہی پر اعتماد کرتی ہے۔

۷۔ ذرائع ابلاغ کو اپنے کنٹرول میں لیتی ہے اور وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈا کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو حکومت کی خواہشات کے مطابق نشر کرتی ہے۔

۸۔ معاشرہ کے عام حالات کو فلاح و بہبود بخشنے میں بے توجہی کا ثبوت دیتی ہے اور نتیجہ کے طور پر عام لوگ روز بروز فقیر سے فقیر تر اور اقلیت پر مشتمل حاکم طبقہ اور اس کے دست نگر افراد عیش وعشرت میں زندگی گزارتے ہیں۔

۹۔ معاشرہ پر حاکم اقتدار، من جملہ مذہبی عقائد اور لوگوں کی اکثریت سے مربوط آداب ورسوم سے عدم توجہی اور بے اعتنائی کا اظہار کرتی ہے۔

ایسی حکومت، معاشرہ کو ایک انقلابی تحریک کی طرف راہنمائی کرنے کے لئے ایک بالقوہ مناسب ماحول فراہم کرتی ہے۔ اس قسم کی حکومتیں غالباً کم عرصہ میں ہر ممکن طریقہ سے مثلاً دھونس، لالچ، چالبازی، ٹرور، جسمانی اذیتوں، تشدّد اور زور زبردستی سے دباؤ ڈال کر معاشرہ پر حکومت کرنے کی تو قدرت پیدا کرسکتی ہیں، لیکن ایک ایسا زمانہ آجاتا ہے جب وہ مشکلات کو حل کرنے کی توانائی نہیں رکھتیں اور حالات کو بالفعل صورت میں انقلابی حرکت کے لئے ہموار وسزاوار بنا دیتے ہیں۔

مذکورہ حالات حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت، مختلف مشکلات، خاص کر شدید مالی مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔

۲۔ حکومت، معاشرہ کا نظم ونسق چلانے کے لئے ماہروں اور روشن فکروں میں سے تجربہ کار اور لائق ونالائق افراد کو جذب کرنے کی توانائی نہیں رکھتی۔

۳۔ پیچیدہ سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مشکلات کو حل کرنے سے عاجز اور ناتوان ہوتی ہے۔

۴۔ کمزور قیادت اور نامناسب نظم ونسق کی وجہ سے سیاسی استحکام وتوانائی خوداعتمادی جیسی کیفیت کو کھو

دیتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اجتماعی گروہوں کے صبر و تحمل اور بردباری میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔

۵۔ اکثر اجتماعی گروہوں کی نظروں میں حکومت کی مقبولیت اور مشروعیت ختم ہو جاتی ہے۔

۶۔ رفتہ رفتہ حکومت اجتماعی طبقات سے دور ہو جاتی ہے اور یہاں تک حکومت کی طرف سے فائدہ پانے والے افراد بھی نظام میں کمزوری پیدا ہونے کے سبب حکومت سے تدریجاً دوری اختیار کرتے ہیں۔

ایسے حالات میں سیاسی ادارے معاشرے کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے اپنی قابلیت اور لیاقت کھو دیتے ہیں اور غیر سرکاری اجتماعی ادارے ان کی جگہ اپنا لیتے ہیں۔

ہر انقلاب کی کامیابی کے لئے دو طرح کے اسباب درکار ہیں۔ اگر چہ یہ اسباب براہ راست اور بلا واسطہ طور پر مؤثر نہیں ہیں۔

پہلا سبب، ایسے دباؤ ہیں جو غیر متوازن سیاسی نظام کی طرف سے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ سیاسی نظام دباؤ اور طاقت کے فقدان کے نتیجہ میں موجودہ حالات کی حفاظت کے لئے طاقت اور تشدّد کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرے سبب، کا تعلق، اجتماعی توازن کے حالات میں فوری اور فیصلہ کن تبدیلیاں ایجاد کرنے سے ہے کہ جو سیاسی لیڈروں کی توانائی سے مربوط ہے۔ اگر وہ ضروری تبدیلیاں ایجاد کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، تو معاشرہ مزید عدم توازن کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

لوسیان پای کہتا ہے:

''ہر وہ حکومت جو لوگوں کے تشدّد آمیز اعتراضات سے دوچار ہوتی ہے، احتمالاً ناقص ہے، کیونکہ نسبتاً بڑے مسلح گروہ صرف اس وقت معاشرے میں ظاہر ہوتے ہیں، جب تمام لوگ حکومت سے ناراض ہوں''[1]

۱۔ چالمرز جانسن، ''انقلابی تبدیلیاں'' (ظہور انقلاب کی نظریاتی تحقیق) ص ۴۶

حاکم طبقہ کی سیاست میں عدم اہلیت اور بے لیاقتی اکثر اس بات کا موجب ہوتی ہے کہ معاشرے کے بیشتر افراد اس سے کٹ جاتے ہیں۔ برسر اقتدار خانوادے کی بدکاری نیز ان کا، اجتماعی ترقی کے عام راہوں کو مسدود کرنے اور نالائق رشتہ داروں کو حکومت کے عالی عہدوں پر فائز کرنے کی وجہ سے باقی معاشرہ ان سے الگ تھلگ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اگر ایک اجتماعی نظام کی تبدیلی ایجاد کرنے والے منابع اور عوامل اثر ڈالیں تو ذیل کی دو حالتوں میں سے ایک کا رونما ہونا قطعی ہے: یا جدید دباؤ ہونے کے باوجود تعادل کی کیفیت برقرار رکھنے کے لئے مختلف عناصر کے درمیان باہمی ہماھنگی اور مطابقت ہوگی یا موجودہ نظام لازمی ہماھنگی ایجاد کرنے کے لئے مناسب ظرفیت سے عاری ہوگا، کہ اس صورت میں اقدار اور ماحول کے درمیان فاصلہ پیدا ہو جائیگا اور اس کے درمیان عدم ھماھنگی کی وجہ سے تعادل کی کیفیت کو دھچکا لگے گا۔ ایسی حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دباؤ اس قدر اچانک اور شدید ہو، کہ ذمہ دار اداروں کے لئے اجتماعی نظام کو عام طریقہ کار سے تحفظ بخشنے کا امکان باقی نہ رہے۔ ان عوامل کا تشخیص دینا کہ کیا امن وامان پھر سے بر قرار ہوگا یا یہ کہ انقلاب رونما ہوگا، سیاسی رہبروں کی توانائی وفہم وفراست، من جملہ ان کی لیاقت وبصیرت اور اس حقیقت کے درک کرنے میں منحصر ہے کہ اجتماعی توازن بگڑ گیا ہے یا نہیں۔ جب تک سیاسی قائدین بنیادی اقدامات انجام دیں اور ان کے اقدامات کا نتیجہ ظاہر ہونے تک اجتماعی نظام میں عدم توازن کی وجہ سے ایک قسم کی غیر یقینی کی حالت برقرار ہوگی۔

چنانچہ اگر سیاسی طاقت اس حقیقت کو درک کرنے کے بعد اجتماعی گروہوں کے مطالبات کے مقابلہ میں ضروری لچک کا مظاہرہ نہ کرے یا ان کی مانگ کو پورا نہ کرے، تو ایسی حالت میں سیاسی حکمران اور اجتماعی گروہوں کے درمیان ٹکراؤ ناگزیر ہوگا۔ اور قہراً اس طرح کا تصادم خشونت آمیز اور تشدد پر مبنی ہوتا ہے۔ معاشرہ میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تشدد وجارحیت سے کام لینا اگرچہ ذاتی طور پر قابل مذمت اور نارضایتی کا باعث ہے، لیکن جب سیاسی نظام پرامن طریقہ سے معاشرے کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو، تو ایسی ناگوار حالت یقینی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

خوزہ ارتگائی کے کہنے کے مطابق: ''انسان نے ہمیشہ تشدد سے کام لیا ہے''

بعض اوقات تشدد کو فقط جرم و جنایت سے تعبیر کیا جاتا ہے کبھی تشدد کا عمل بعض افراد کی جانب سے وسیلہ و حربہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے مثلاً جو اپنے برحق حقوق کا دفاع کرنے میں تمام دیگر طریقوں سے استفادہ کرنے کے باوجود ناکام رہے ہوں۔ شاید یہ حقیقت افسوسناک ہوگی کہ بعض اوقات انسان اپنی فطری تمایلات کو تشدّد کے طریقہ سے ظاہر کرتا ہے، لیکن دوسری طرف سے معاشرہ میں اس قسم کی رفتار کا مظاہرہ عقل و منطق کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جب پانی سر سے اونچا ہو جائے تو حالت صبر و تحمل کے حدود سے باہر ہو جاتی ہے۔'' اس نظریے کے مطابق انقلابی حالات میں تشدّد کا استفادہ تنہا مؤثر حربہ شمار ہوتا ہے۔[1]

انقلاب برپا کرنا معاشرہ کے نظام کو بدلنے کے لئے گویا تشدّد قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس سے زیادہ روشن تعبیر یہ ہے، کہ انقلاب ایک خشونت آمیز منصوبہ کو عملی جامہ پہناتا ہے کہ جس میں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ ایک اجتماعی نظام کو بدل کر رکھدے۔ فعّالانہ تبدیلی کے معتقد اجتماعی گروہوں کی حالت جس قدر طاقتور ہوگی اسی اعتبار سے تشدّد اور مسلحانہ اقدامات کی ضرورت کم ہو گی۔ بہت سے ایسے انقلابات کہ، جن کے انقلابی قائد، اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لوگوں کی عظیم اکثریت کو جذب کرنے کی توانائی نہیں رکھتے اور جانتے ہیں، ایک ہماھنگ حرکت اور زیادہ تشدّد کے بغیر، سیاسی نظام کو بیکار اور مفلوج کر دیں وہ عوام کی سرد مہری کی وجہ سے درج ذیل طریقہ کار کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں:

- گوریلا جنگ کا گستاخانہ اقدام۔
- تمام اجتماعی گروہوں کے ساتھ حکمت عملی پر مبنی اتحاد۔

البتہ تشدّد کا استعمال، سیاسی اقتدار کے گر جانے، شکست اور ہتھیار ڈالنے کا تنہا عامل نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے عوامل بھی ہیں جو اجتماعی قوت کے حق میں تبدیلیوں کو سرعت بخشتے ہیں۔

۱۔ چالمرز جانسن ''انقلابی تبدیلیاں'' (ظہور انقلاب کی نظریاتی تحقیق ص ۲۸)

تیزی لانے کے دوسرے عوامل وہ ہیں جو سیاسی نظام کی ناتوانیوں کو فاش کر کے اور اس کی انحصاری قوت میں تزلزل پیدا کر کے انقلاب رونما ہونے کو ممکن بناتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں سرعت بخشنے والے عوامل ہمیشہ برسر اقتدار مسلط سیاسی نظام کے مسلّح قوتوں پر انحصار کو متاثر کرتے ہیں، اس طرح سے کہ یہ عوامل بالقوہ یا منظّم انقلابی گروہوں کو قابل نفرت نظام کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں، اور انھیں ہتھیار اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

سرعت بخشنے والے حسب ذیل تین عوامل کا نام لیا جاسکتا ہے:

ا۔ وہ عوامل جو مسلح طاقتوں پر براہ راست اثر ڈالتے ہیں اور انھیں کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں، جیسے نظم ونسق، کمانڈروں کی تابعداری ضابط اور اصول کی پاسداری اور عسکری قوتوں کی وفاداری۔

۲۔ وہ عوامل جو انقلابی طاقتوں کی روح کی تقویب کا باعث بنتے ہیں، اس طرح کہ اگر یقین پیدا کریں تو حکومت کے مسلح قوی پر کامیاب ہوسکتے ہیں۔

۳۔ ایک انقلابی گروہ کی سیاسی اقتدار کے خلاف کامیاب حکمت عملی اور منظّم کاروائی، جو اس گروہ کے حوصلے بلند ہونے اور اس کی سرگرمیوں کو تقویت بخشنے کا سبب بنتی ہے۔

سرعت بخشنے والے دوسرے عوامل میں سے جنگ میں شکست کھانے کی وجہ سے فوجی قوتوں کا بکھر جانا، فوجی افراد میں بغاوت یا حکومت کے اعلٰی عہدہ داروں میں اختلاف کا پایا جانا اور اس کے علاوہ نفسیاتی اور نظریاتی عوامل ہیں کہ جن کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر اس بات کا یقین واطمینان کہ برسر اقتدار حکومت انقلابیوں سے آمنے سامنے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتی ہیں ممکن ہے اس اعتقاد واطمینان کا سرچشمہ غیبی امداد اور شہادت طلبی کا جذبہ اور انقلابی ارادہ کے، آشکار ہونے پر بیرونی امداد کی اُمید یا عوامی طاقت کا ناقابل شکست ہونے کا اعتقاد، ہو۔

سرعت بخشنے کے عوامل کی ایک اور قسم اسٹرٹجیک ماہیت کی حامل ہے، اس معنی میں کہ، انقلابی قوتیں حکمران طبقہ کے مسلح افواج کو کہ، جو بہت مضبوط پوزیشن میں ہوتی ہے اور بدلتے حالات سے فوری مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے، کو شکست دینے کے لئے ایک منصوبہ مرتب کر کے اسے عملی

جامہ پہنائیں۔ انقلابی حکمت عملی مختلف مواقع پر مختلف ہو سکتی ہیں اور ان کی کیفیت کا انحصار حکومت کے کارآمد مسلح افراد کی تعداد اور اسی طرح انقلابیوں کی استدلالی اور ایجادی قوت پر ہے۔ من جملہ انقلابی حکمت عملی کے طور پر درج ذیل نمونے بیان کئے جا سکتے ہیں:

- انقلابی عوامل کے ذریعہ حکومتی نظام کے اندر نفوذ کر کے سیاسی نظام پر اندر سے کاری ضرب لگانا۔
- محدود لیکن مسلح گروہوں کے ذریعہ گوریلا بغاوت۔
- سیاسی قدرت کی بوروکریسی کی مشنری کو مفلوج کرنے کے لئے عوامی اور عمومی ہڑتال، مظاہروں اور منفی مبارزہ کی صورت میں عام شورش برپا کرنا۔

دوسری گفتگو:

اجتماعی اقتدار کی تشکیل اور انقلاب کا ظہور

جاننا چاہئے کہ برسر اقتدار سیاسی نظام سے عام لوگوں کی عدم رضایت اور معاشرہ کے دو بُعدی (دو دھڑوں میں بٹ جانے سے) ہونے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ انقلاب رونما ہو جائے۔ ایسے حالات میں ممکن ہے ایک قسم کی سیاسی۔اجتماعی تبدیلی، جیسے کودتا، شورش، اصلاحات کے عمل میں کامیابی ہو جائے۔لیکن انقلابی تحریک اور اس کی پیشرفت یا عدم پیشرفت کے لئے تین بنیادی ارکان، یعنی عوام، قیادت اور نظریات کی بھرپور دخالت ضروری ہے۔

ہر انقلاب کا ابتدائی مرحلہ، وہی عام لوگوں کی مشارکت ہے، جو ایک دھماکہ کی صورت میں معاشرہ کے اندر سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر لوگوں کی شرکت اور ان کا اجتماع ایک طاقتور قیادت کے ساتھ نہ ہو، اور قیادت اس تحریک کی بنحو مطلوب ہدایت نہ کر سکے یا سیاسی۔اجتماعی گروہوں کی تشکیل کے لئے ضروری اسباب ایجاد نہ کر سکے، تو انقلاب کی کامیابی کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی ہے۔

اس بنا پر انقلاب اس وقت کامیاب ہے، جب سیاسی۔اجتماعی لحاظ سے تغیر و تبدیلی پیدا ہوا اور یہ قیام اجتماعی مطالبات اور تحریک کو تشکیل دینے کے لئے نئی حکمت عملی اور قیادت کے ہمراہ ہو۔ حقیقت میں ہر انقلاب کی شکست یا کامیابی کا فیصلہ اسی مرحلہ میں طے ہوتا ہے جب اس کی پائیداری یا انحراف، دوام یا زوال مابعد کے مرحلہ میں اسی سے وابستہ ہو۔

ایک جامع اور کامل انقلاب درج ذیل اقدامات پر مشتمل ہوتا ہے:

- تشدّد اور سرعت کے ساتھ موجودہ سیاسی اداروں کی نابودی اور انہدام
- نئے اجتماعی گروہوں کی تشکیل اور ان کی سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کی ضمانت
- نئے سیاسی اداروں کی تاسیس

اس صورت میں برسر اقتدار حکمران نظام کا اندر سے بکھر جانا انقلاب کے بعد کی صورت حال

میں تحول ایجاد نہیں کرسکتا ہے۔

عام طور پر انقلاب ایک جدید طاقت کے حملہ سے شروع نہیں ہوتا ہے، بلکہ معاشرے کی ایسی تمام فعال وغیر فعال طاقتوں کے اچانک سامنے آنے سے شروع ہوتا ہے، جو برسر اقتدار نظام کے حوالے سے اپنا اعتقاد کھو چکی ہے اور اس کی مشروعیت کو زیر سوال لا رہی ہے۔

ایسی حالت میں انقلاب کی پیشرفت یا عدم پیشرفت کا دار و مدار ان پارٹیوں پر ہوتا ہے جو انقلاب میں شرکت کرتی ہیں۔ظاہر ہے کہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے سے معاشرے میں طاقت کا ایک خلا پیدا ہو جائے گا چنانچہ اگر اجتماعی گروہوں میں سے کوئی طاقتور ترین گروہ یا ان کی کوئی حکمت عملی اس خلا کو پُر کر دے تو یہ انقلاب کی کامیابی اور اس کی بقاء کی ضمانت ہے۔عام طور پر معاشرے کی نئی قوتیں حکومت اور اس کا کنٹرول یعنی فوج کا نظام فوری طور پر اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی ہیں، اور اس بات کی سعی کرتی ہیں کہ حکومت کے حساس عوامل پر کنٹرول حاصل کر کے دوسری قوتوں کی حرکت کو روک کر معاشرہ میں لاقانونیت کے حالات کو رونما ہونے سے محفوظ رکھیں۔اگر باہمی اختلافات کی وجہ سے کوئی ایک پارٹی زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی قدرت نہ رکھتی ہو، تو مختلف گروہوں اور پارٹیوں میں اختلاف کی وجہ سے ساری جماعتیں ملکر حکومت کا کنٹرول سنبھالتی ہیں اور آخر کار ان تمام پارٹیوں میں سے وہ پارٹی جو سب سے زیادہ مقبولیت کی حامل ہوتی ہے وہ زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔

اس نظریہ کے مطابق، جو بھی اجتماعی طبقہ سیاسی نظام میں شمولیت اختیار نہیں کرتا، وہ، خود ایک بالقوہ انقلاب ہوتا ہے۔اس معنی میں کہ فطری طور پر معاشرہ کے ہر گروہ کو چھوٹے یا بڑے مراحل سے گزرنا چاہیئے تاکہ انقلاب کی آمادگی کے مرحلہ تک پہنچ جائے۔اس حالت میں انقلاب کی سرعت کا انحصار ایسے گروہوں کی تعداد اور ان کی حکمت عملی پر ہوتا ہے، جو معاشرہ کے بطن سے پیدا ہو کر انقلاب میں شرکت کرتے ہیں۔کیونکہ ہر پرانی حکومت کی سرنگونی کا پیش خیمہ مظاہرے اور عوامی شورش ہوا کرتی ہے، اس لئے نئی اجتماعی طاقتوں کو چاہیئے ان مظاہروں کی ہدایت کرتے ہوئے انھیں صحیح جہت

فراہم کریں۔ انقلاب اپنے مختلف مراحل میں بہت ایسے مواقع سے روبرو ہوتا ہے کہ جس میں ہر گروہ اپنی منظور نظر آرزوں اور تمناؤں کو پروان چڑھانا چاہتا ہے اور برسر اقتدار سیاسی نظام سے اپنی مادی و معنوی مطالبات کو پورا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں درج ذیل تین اجتماعی گروہ ظاہر ہوتے ہیں: شدت پسند انقلابی، اعتدال پسند افراد اور قدامت پسند لوگ۔ شدت پسند انقلابی، اکثر نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشرہ کے محروم افراد ہوتے ہیں، یہ لوگ انقلابی تحریکوں کے اصلی مرکز کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان کا اصلی مقصد انقلاب کو فروغ دینا اور لوگوں کو اس میں زیادہ سے زیادہ شرکت کی دعوت دینا ہوتا ہے کہ اس کے لئے حکمت عملی اور آئڈیولوجی پر مشتمل دلائل پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی طاقت کو بڑھاتے ہوئے مختلف جہتوں سے اجتماعی اقتدار و حاکمیت میں جدید سیاسی نظم کے لئے لوگوں کے مختلف گروہوں کی زیادہ سے زیادہ مشارکت کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

شدت پسند طاقتیں، تمام اجتماعی گروہوں کو سیاست کے میدان میں کھینچ کر انقلابی حرکت کو سرعت بخشتی ہیں۔ چونکہ تیسری دنیا میں لوگوں کی اکثریت دیہات میں زندگی بسر کرتی ہے۔ اس لئے ریڈیکل افراد کوشش کرتے ہیں کہ شہر کے باشندوں کے علاوہ دیہاتوں کے باشندوں کو بھی متحرک کریں۔ اس کے لئے وہ مختلف ذرائع اور گوناگوں وسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض مواقع پر اقتصادی و اجتماعی عوامل فقیر اور نادار طبقہ کے لئے اور دیہات کے باشندوں کے لئے بہت موثر ثابت ہوتے ہیں اور بعض دوسرے مواقع پر مشترک مذہبی اور قومی محرّکات اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اعتدال پسند افراد، بنیادی طور پر تند و تیز انقلابی حرکتوں اور حکومت کی سرنگونی کے موافق نہیں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نہ سیاسی نظام سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور نہ خشونت کی پالیسی کو اپنا کر حکومت کے مقابلہ میں آتے ہیں۔ ان کا تعلق عام طور پر معاشرہ کے متوسط، شہری، آرام طلب اور تعلیم یافتہ طبقہ سے ہوتا ہے اور سن و سال کے لحاظ سے بھی عام طور پر ادھیڑ عمر کے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شدت پسندوں کے مقابلہ میں، قدرت پر قبضہ کرنے کے بعد اعتدال کا راستہ انتخاب کرتے ہیں اور فطری طور پر ایک لیبرل نظام یعنی ڈیموکریٹک حکومت تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس امر کو

ایک فوری اور ضروری قانونی نظم کے عنوان سے توجیہ کرتے ہیں اور یہی چاہتے ہیں!

جبکہ قدامت پسند اصولی طور پر ہر قسم کی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ خود دو گروہوں پر مشتمل ہیں: پہلا گروہ وہ ہے جو برسر اقتدار سیاسی نظام سے وابستگی کی وجہ سے ہر قسم کی تبدیلی کو اپنے فائدہ کے خلاف سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو نئے نظام کا چہرہ واضح نہ ہونے کی وجہ سے تغیر و تبدیلی سے خائف ہوتا ہے اور موجودہ حالت کے تحفظ کو مبہم تبدیلیوں پر ترجیح دیتا ہے۔[1]

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انقلاب اس وقت برپا ہوتا ہے جب سیاسی نظام اور اجتماعی گروہوں کے درمیان فاصلہ ناقابل برداشت حد تک بڑھ جائے۔ اجتماعی گروہوں کے سیاسی نظام سے نا اُمیدی اور اعتماد نفس کی وجہ سے معاشرہ کو ایک انقلابی حالت کی طرف تحریک کیا جاتا ہے اور تدریجاً بیشتر اجتماعی گروہ سیاسی اقتدار سے اپنی وفاداری کو سلب کر کے اجتماعی قوت اور گروہ کی طرف جذب ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں انقلابی قیادت اور رہبری ایک غیر معمولی اور نہایت اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہاں پر انقلابی قائد کی خصوصیات کا درج ذیل تین حالتوں میں جائزہ لیا جا سکتا ہے[2]

۱۔ انقلابی ''ideologue'' (نظریہ پرداز) یا مکتب فکری کا بانی یا انقلابی نظریہ کا منصوبہ ساز۔

۲۔ انقلاب کا بانی یا سورما اور تمام انقلابی کارروائیوں کا کمانڈر انچیف۔

۳۔ انقلاب کی کامیابی کے بعد انقلابی حکومت کا زمامدار اور معاشرہ سازی کا معمار۔ نظریہ پرداز (ideologue) اور انقلاب کی فکری راہنمائی کرنے والا نہ انتخابی ہوتا ہے اور نہ انتصابی،

۱۔ ان ترکوں کے مانند جو ۱۸۷۶ء کے آئین کو برقرار کرنے کا تمائل رکھتے تھے یا حتی کاسترو، جس نے اپنے مختصر اعتدال پسندانہ دورہ کے دوران ۱۹۴۰ء کے آئین کی برقراری کا اعلان کیا اور یا ایرانی لیبرل جو ۱۹۰۶ء کے آئین کو پھر سے لاگو کرنے کا دفاع کرتے تھے۔

۲۔ ڈاکٹر شریعتی، ''امت و امامت'' ص ۵۷۱۔۵۷۹

یعنی لوگ اس کے اس عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت نہیں کرتے ہیں، بلکہ اس کے نظریات کے حامی وطرفدار ہونے کی وجہ سے اس کے معتقد ہوتے ہیں اور اس کے پیغام کی حقانیت اور اس کے نظریہ کے حقیقی ہونے کی وجہ سے اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ ایک صاحب نظر فرد (ideologue) یا فکری انقلاب کے قائد سے لوگوں کا برتاؤ ایک علمی نظریہ، فکری مکتب یا مذہبی قائد کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس کی فکر کی اصالت، مکتب کی حقانیت، علمی، اخلاقی اور عملی اقدار کی پابندی، لوگوں کے اس کی نسبت ایمان واعتقاد پیدا کرنے کا سبب قرار پاتا ہے، جو بعد میں ایک قسم کی عمومی عقیدت ومحبت نیز، وفاداری اور جان نثاری کے جذبے میں تبدیل ہوتا ہے۔

لیکن انقلاب کا قائد، سورما یا انقلاب کے کمانڈر کا دوسرا رخ، وہ شخصیت ہے، جو ایک انقلابی معاشرہ میں انقلابی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر انقلاب کی فوری کامیابی کے لئے ایک حکمت عملی تیار کرتا ہے۔ عام طور پر ایسا قائد معاشرہ میں اجتماعی اقدار کی پناہ گاہ شمار ہوتا ہے۔ وہ غالباً غیر معمولی ذہانت اور گوناگوں استعداد اور تخلیقی قوت کا مالک ہوتا ہے اور اجتماعی حالات اسے بھی معاشرے کے اکثر افراد کی طرح برسر اقتدار سیاسی حکام سے متنفر کردیتے ہیں۔ وہ انقلابی گرہوں میں کافی مقبولیت حاصل کر کے قیادت ورہبری کی منزل پر فائز ہوجاتا ہے اور اس کے بعد تبدیلیوں کے طریقہ کار میں کلیدی رول ادا کرتا ہے اور اس کے لئے مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

انقلابی قیادت ورہبری کی صورت ایک طاقتور ترین صورت ہے جو آئیڈ لوگ (ide lo gue) کی صورت کے بعد اور معمار کی صورت سے پہلے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یعنی انقلابی قائد اپنی توانائی اور فہم وفراست سے مکتب کے کلمات میں جان ڈالتا ہے اور اپنی فکر واندیشہ سے انقلابی سرگرمیوں کو تشکیل دیتا ہے۔ انقلابی عقائد ونظریات اس کے وجود کا جزو لاینفک ہیں، اور ایمان وعقیدہ جو انقلاب کی آئیڈیالوجی کی ایک ''کتاب'' تھی، اس کے اندر ایک ''انسان'' کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ انقلاب کی ''بولتی ہوئی کتاب'' بن جاتا ہے، ایک فکر کا انسانی مجسمہ، اس کی ذہنی معنویت ''عینی حقیقت'' اور جو کچھ وہ بننا چاہتا ہے بن جاتا ہے۔ وہ انقلاب کی حکمت عملی، مبارزہ کے طور

طریقے درست اور منظّم پالیسیوں کے زاویے اور علمی نعروں کے خطوط معین کرتا ہے وہ اپنی بینش اور وسعت نظر کے ذریعہ موجودہ ماحول، امکانات، حالات اور متصادم گروہوں کو سنجیدگی سے پرکھتا ہے۔ اسی طرح وہ انقلاب کو تعطل، ہلاکت، نابودی اور خطرات سے نجات دلاتا ہے اور غیر معمولی علمی صلاحیت اور اپنی خاص استعداد، نیز فہم وفراست سے انقلابی معاشرہ کی ھدایت کی کشتی کے لنگر کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور ناکامی کے عوامل کا انکشاف کرتے ہوئے، صبر آزما منازل سے گزرتے ہوئے اور اپنے معاشرہ اور اپنی قوم کی تاریخی سرنوشت پر مسلط ہوتا ہے اور آخر کار دشمن پر قابو پاکر انقلاب کو کامیابی کی طرف ھدایت کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ اسی (انقلابی قائد) کا کارنامہ اور کرشمہ ہے جو انقلاب کو بالقوہ حالت سے بالفعل حالت میں تبدیل کردیتا ہے، نیز لوگوں کو حکومت کرنے کے حق سے سرفراز کرتا ہے اور انقلاب کے بعد سیاستمداروں کو حکومت کا حق بخشتا ہے۔

لیکن انقلاب کے بعد حکومت کے لئے کسی سربراہ یا حاکم کا معین کرنا، جیسا کہ ہر سیاسی نظام کا طریقہ ہے خود انقلاب برپا کرنے والی خاص کمیٹی سے مربوط ہوتا ہے۔ یعنی ممکن ہے حکومت کا سربراہ، قائد انقلاب یا انقلابی کمیٹی یا انقلابی پارٹی کی طرف سے نصب کیا جائے اور یا ان کی طرف سے تجویز ہونے کے بعد لوگوں کے ذریعہ اس کو منتخب کیا جائے۔ اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ ایسے مواقع پر گفتگو کے اندر نہ تو بہت زیادہ قاطعیت ہو اور نہ ہی اس کا انداز بہت معمولی ہو بلکہ جس چیز کا امکان موجود ہے وہی پیش کرنا چاہئے۔ اس مرحلہ میں انقلابی قائد کو ایک ایسے مثالی معاشرہ کی تعمیر شروع کرنی چاہئے کہ جس کا اس نے لوگوں سے وعدہ کیا ہے۔ اسے سرنگون اور مسمار شدہ سیاسی نظام کے کھنڈرات پر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھنی چاہئے کہ جس کا تصور انقلاب کے دوران پیش کیا گیا ہے، ایسا نظام جو معاشرہ کی کھوئی ہوئی آبرو کو پھر سے زندہ کرے اور اپنے اقتدار کو اجتماعی مقبولیت اور مشروعیت کی بنیاد پر مستحکم و استوار کرے۔

قیادت کی یہ تین صورتیں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں۔ انقلابی قیادت کی یہ قسم مثالی اور کامیاب ترین قسم ہے۔ ایسی منزلت پر فائز ہونے کے لئے رہبر کو غیر معمولی اور استثنائی فہم

وفراست اور خصوصیات کا مالک ہونا ضروری ہے تا کہ نہ صرف اپنے رقیبوں کو میدان سے نکال باہر کرے، بلکہ معاشرے کے اکثر گروہوں کے نزدیک اپنی وسیع مقبولیت اور محبوبیت کو بھی ثابت کرسکے۔ایسا نہ ہونے کی صورت میں قیادت کے لئے ایک شوریٰ یعنی کمیٹی قائم کرنی ہوگی یعنی چند افراد مشترکہ طور پر رہبری کے مذکورہ تین صورتوں کی ذمہ داری اور فرائض کو سنبھالیں گے۔رہبروں کی بینش، وسعت نظر، فہم وفراست اور نظم وانضباط نیز قوم وملت کے بارے میں ان کی مشترکہ حکمت عملی رہبری کے امور کو آسان بناتی ہے۔آئیڈیالوجی کے متعلق آگاہی کی مقدار، مبارزہ نیز سیاسی قوت اور اس کی تمرین کامیابیوں وناکامیوں کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم بڑھتی رہتی ہے۔

رہبری کے اہم ترین امور میں سے، اشتباہات کو درک کرنا اور کامیابی کے لئے نئے حالات پیدا کرنا اور اس سے عبرت حاصل کرنے کے لئے گزشتہ امور کی طرف رجوع کرنا ہے۔نیز اپنے موقف میں شکست اور ناکامی کو عام معیار کے مطابق مسئلہ کی منصوبہ بندی کے لئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔جب بھی کسی مسئلہ کے بارے میں وضاحت لوگوں کی سطح کو بلند کرے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ انقلاب کی بنیاد عقل وشعور اور فہم وفراست پر ہے اور انقلاب قدم بہ قدم بلوغ اور پختگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

خاص کر رہبر کے اطراف میں رہنے والے تمام افراد، کہ جن کا فریضہ لوگوں کو ہر اس چیز سے آگاہ کرنا ہے کہ جو خطرناک اور معاشرہ کی صفوں میں انتشار واختلاف پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں انھیں حصول آزادی کی راہ میں قومی اور عمومی مبارزہ کے لئے وفادار ہونا چاہئے۔ہوشیاری اور انفرادی اعمال کی نسبت سے خشونت (تشدد) اور تحقیر کی ایک قسم وہ ہے جو عادتاً انقلابی ہے۔لیکن خشونت اور حقارت کی ایک اور قسم جو پہلی قسم سے حیرت انگیز حد تک شباہت رکھنے کے باوجود مکمل طور پر انقلاب مخالف، خودغرضانہ، اور ہرج ومرج ایجاد کرنے والی ہے، اگر انقلابی قیادت، فوری طور پر اس خشونت سے برسرپیکار نہ ہو، تو بیشک یہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد تحریک کی شکست وناکامی کا سبب بن سکتی ہے۔[1]

۱۔''روئے زمین پر دوزخی'' تالیف فرانس فانون، ترجمہ ڈاکٹر علی شریعتی، ص ۶۴

بنیادی طور پر، انقلابی قائدین کی نظر میں، انقلاب، بشر کی توانائیوں کا امتحان ہے۔ اس معنی میں کہ عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ انقلابی معاشرہ میں ایک ناممکن امر ممکن ہو جاتا ہے اور انسان نہ صرف انقلاب کی توانائی رکھتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں حق وحقوق اور فرائض کا بھی مالک ہے۔ انقلاب کا بیج تبدیلی چاہنے والے اشخاص کی جانب سے بویا جاتا ہے۔ اس کام کو، قائدین ایک تجربہ کار اور ماہر باغبان کے مانند انجام دیتے ہیں، باغبان کبھی بھی فطری توانائیوں کے خلاف عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ آب وہوا اور موسم سے سازگار سرزمین میں وہ تخم ریزی کرتے ہیں اور ان کے اس عمل کا آخری ثمرہ حقیقت میں انسان وطبیعت کے درمیان تعاون کا پھل ہے۔

قائدین انقلاب اس بات کو جانتے ہیں کہ ان کی کامیابی کا دارومدار ان کے مقاصد کے واضح ہونے، طریقہ کار کے انتخاب میں سنجیدگی اور خاص کر لوگوں کی آگاہی سے مربوط ہے۔ ممکن ہے سیاسی نظام کے خلاف عوام کی نفرت سے فائدہ اٹھا کے ایک مختصر مدت تک مبارزہ کو جاری رکھا جائے ۔لیکن عوامی سطح شعور اور فہم کو بلند کئے بغیر میدان انقلاب میں حقیقی کامیابی ملنا ممکن نہیں ہے اور یہ آگاہی انقلابی نظریات وافکار کی تعلیم وتربیت، کہ جو کسی بھی انقلاب کی کامیابی کے لئے رکن سوم شمار کیا جاتا ہے، کے ذریعہ ممکن ہے۔

''آئیڈیالوجی'' کی اصطلاح کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے۔ فارسی میں کبھی اسے ''مکتب'' کے مترادف جانا جاتا ہے لیکن اکثر وبیشتر اسے ایک خاص آئیڈیوجی کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عام معنی میں آئیڈیالوجی، رفتار وکردار کے قوانین کا وہ بنیادی تجزیہ ہے جو تمام انسانی روابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

مختلف اجتماعی گروہوں کے درمیان جدائی ڈالنے والا قابل تغییر عنصر، ان کی آئیڈیالوجی یا دوسرے الفاظ میں ہر ایک گروہ کی اقداری ساخت ہے۔ ایک مشترک آئیڈیالوجی کے بغیر معاشرہ کے پراکندہ گروہ آپس میں ہرگز متحد ہونے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں اور معاشرہ میں موجود کشمکش کے نتیجہ میں معاشرہ کے اجتماع پر اثر ڈالے بغیر منحل اور نابود ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب افراد کے پوشیدہ

روابط آشکار ہو کر آئیڈیالوجی کے ہتھیار سے مسلح ہو جائیں، اور اس آئیڈیالوجی کا دائرہ اپنی ماہیت میں عمومیت کی وجہ سے مزید اور وسیع ہو جائے، تو اس وقت اپنی محدودیت کے دائرہ سے بالاتر ہو کر معاشرے کے تمام گروہوں کو بھی اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور آخر کار اپنی رقیب آئیڈیالوجیوں کو میدان سے خارج کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں معاشرہ دو مشخص اور متقابل گروہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک وسیع گروہ جو انقلاب پر مسلّط آئیڈیالوجی کی کامیابی سے برسر اقتدار سیاسی نظام میں تبدیلی پیدا کر کے، مسلّط اقدار کو نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرا گروہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو نئی جدوجہد کے ساتھ مقابلہ کر کے موجودہ نظام اور اس کی فعلی حیثیت کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آئیڈیالوجی معاشرہ کے پریشان حال اور ناراض افراد کی روحانی ضرورتوں کو دو صورتوں سے پورا کرتی ہے:

الف) موجودہ سیاسی نظام کو کیسے تبدیل کیا جائے۔ (تخریب)

ب) اس کی جگہ پر کس طرح کے نظام کو بروئے کار لایا جائے۔ (تعمیر)

برسر اقتدار سیاسی نظام کے تسلّط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے شائد انقلاب ایک لازمی شرط ہو، لیکن وہ انقلاب ایک ایسی آئیڈیالوجی کا حامل ہونا چاہیۓ جو موجودہ اقدار کے ارکان کو تبدیل کرنے کے لئے ایک مطلوب پروگرام کو مدنظر رکھتا ہو۔ بعض محققین، آئیڈیالوجی کی اصطلاح کو اقدار کی تعمیر کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں، جبکہ آئیڈیالوجی اقدار کی تعمیر سے ایک خاص تفاوت رکھتی ہے۔ آئیڈیالوجی کا اس وقت اقدار کی تعمیر سے تبدیل کیا جانا ممکن ہے، جب وہ اجتماعی نظام میں ہم آہنگی برقرار کرنے کی قدرت رکھتی ہو۔ آئیڈیالوجی، صرف موجودہ اقدار کی ساخت سے مقابلہ کر کے اس کی جانشینی کو پیش کرتی ہے۔

آئیڈیالوجی، پرانی اقدار کی ساخت کے مقابلہ میں رقیبوں کے مانند پرچم بلند کرتی ہے اور ایک متعادل اور فعال ماہیت پر مشتمل ایک معاشرے کے اقدار اور اس کے نظام کی توصیف بیان کرتی

ہے۔جب بھی ایک معاشرہ میں ثقافتی، امور سیاسی سرگرمیوں کی توجیہ نہ کر سکتے ہوں، تو آئیڈیالوجی نئے اقدار اور جدید تمایلات کو پیش کرنے کے لئے اہم منابع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔بعض اوقات آئیڈیالوجی محدود اعتقادات پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا نفسیاتی اعتبار سے استعمال نارسائیوں کے تمام عامل کے عنوان سے ایک موضوع کو قصور وار ٹھہراتا ہے کہ جس کا مقصد عوام کی قلبی رنجیدگی کو کم کرنا ہوتا ہے۔اگرچہ یہ سادہ آئیڈیالوجی، اجتماعی کشمکش کو دور کرنے کی عامل شمار ہوتی ہے، لیکن عام طور پر اپنی وسعت نہیں پائی جاتی کہ معاشرے کے بیشتر معترضین کو اپنی طرف جذب کر سکے۔بعض اوقات ایک آئیڈیالوجی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی پا کے ایسی عام ہو جاتی ہے کہ نہ صرف سیاسی سرگرمیوں کے لئے ایک روش میں تبدیل ہو جاتی ہے، بلکہ موجودہ اقدار کی تعمیر کی جگہ لینے کے لئے ایک قابل قبول حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔جب ایک آئیڈیالوجی کا مقصد اجتماعی کام کی تقسیم کے لئے ایک نمونہ پیش کرنا ہو، جو واضح طور پر اس کے موجودہ اور گزشتہ حالات سے متفاوت ہو تو وہ آئیڈیالوجی ایک انقلابی آئیڈیالوجی کہلاتی ہے۔بعض انقلابی آئیڈیالوجی صرف بعض اجتماعی اہمیتوں میں تبدیلی لانے کی درپے ہوتی ہیں، جیسے بعض اہم مراکز پر قبضہ کرنے کے طریقہ کار سے مربوط ، یا اقتصادی روابط اور یا متعارض اہداف کو حل وفصل کرنے سے متعلق اقدار۔اس قسم کی تبدیلیاں دینی اعتقادات پر حاکم اقدار، سیاسی تعمیر یا سن وسال اور جنس پر مبنی اقدار کے درمیان تفاوت پر توجہ نہیں دیتی ہیں، لیکن بعض انقلابی آئیڈیالوجی ایسی ہیں کہ جو اقدار کی تعمیر کے سلسلہ میں گہری تبدیلیوں پر توجہ رکھتی ہیں۔

جب آئیڈیالوجی ارتقا کے اس درجہ پر فائز ہو جائے کہ ایک انقلابی آئیڈیالوجی میں تبدیل ہو جائے تو یہ مقصد، وسیلہ اور روش نامی، تین عناصر پر مشتمل ہوگی۔ایک انقلابی آئیڈیالوجی ہرگز یہ قبول نہیں کرتی ہے کہ اپنے مقصد کو موخر کرے یا اسے کسی دوسرے زمانہ پر موکول کردے۔انقلابی آئیڈیالوجی، یعنی موجودہ حالات میں فوری تبدیلی کا پروگرام۔

انقلابی آئیڈیالوجی، کبھی مذہبی ماہیت کی حامل ہوتی ہے اور اپنے حامیوں کے بارے میں الٰہی

امداد سے وابستہ ہونے کی معتقد ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ دینی اقدار کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کی آئیڈیالوجی بھی انقلابیوں کی جدوجہد اور ان کی بھرپور کوشش پر بھروسہ رکھتی ہے اور معتقد ہے کہ صرف ان کی کوششوں ہی سے الٰہی امدادان تک پہونچ سکتی ہے۔[1]

انقلابی آئیڈیالوجی تین قسم کی ہے:

۱۔ ایک غیر متداول، لیکن تاریخ اور معاشرہ کے ذہنوں میں ثقافتی اور مطلوب روایتی اقدار کے مجموعہ کے طور پر پہچانی جائے جس کی ایک مثالی نظام کو احیاء کرنے والی آئیڈیالوجی سے دی جاتی ہے۔

۲۔ وہ آئیڈیالوجی کہ جو دوسرے معاشروں میں کامیاب تجربہ سے استوار ہو اور انقلابی حضرات جس کو نمونہ کے طور پر انتخاب کرتے ہوں اور اس کو عملی مشکل دینے کے درپے ہوں۔

۳۔ ایسی آئیڈیالوجی کی تبلیغ کی جاتی ہے جو اس سے پہلے کسی مثالی اور جدید معاشرہ میں موجود نہیں تھی اور نہ ہی ان کے درمیان شناختہ شدہ ہے۔

ایک ناامن، اور دو قطبی معاشرہ میں۔ جس کے ایک قطب پر اجتماعی گروہ اور دوسرے قطب پر سیاسی حکومت مستقر ہو۔ ایسی حالت میں فقط ایک انقلاب کامیاب ہوسکتا ہے کہ جس کی تعریف پہلے بیان ہو چکی ہے اور اس کے تین بنیادی رکن ہیں بشرطیکہ نہایت ہی ھماھنگی، تناسب اور فعا طور پر لانہ (لوگ، قیادت اور آئیڈیالوجی) مؤثر انداز میں عمل کریں۔ جس قدر اجتماعی گروہوں کی فعاالانہ شرکت میں وسعت ہوگی، جس قدر آئیڈیالوجی معاشرۂ کے مطالبات اور مثالی اقدار کی توجیہ وتفسیر کرنے پر قادر ہوگی اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور جس قدر قیادت ورہبری اپنے مذکورہ تینوں چہروں کے ساتھ آئیڈیالوجی کے سلاح سے مسلح ہوگی اور لوگوں کی حمایت اور پشت پناہی سے، مناسب حکمت عملی کو بروئے کار لائیگی، تو بہت ہی کم نقصانات کے ساتھ انقلاب کے فوری کامیابی کے امکانات میں اضافہ ہوگا۔

۱۔ ﴿إنّ الله لایغیّر مابقوم حتی یغیروا ما با نفسهم﴾ (رعد/۱۱)

''خدا کسی قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کرلے''

تیسری گفتگو:

انقلاب کی کامیابی کے بعد کا دور (نئے نظام کی تشکیل کا مرحلہ)

انقلاب کے قائدین اور انقلابی گروہوں کے لئے انقلاب کے مشکل اور پیچیدہ ترین مراحل نیز انقلاب کی کامیابی کے بعد سیاسی اقتدار پر غلبہ حاصل کرنے کا دور ہوتا ہے۔ معروف ضرب المثل ہے: ''تخریب کاری تعمیر کی بہ نسبت زیادہ آسان ہوتی ہے۔'' جو انقلاب کے بارے میں بھی درست ہے۔ انقلابی حضرات اس مرحلہ میں پیچیدہ ترین مسائل، مشکلات اور دباؤ سے دوچار ہوتے ہیں۔ جو بھی انقلاب اپنی آرزؤں اور انقلابی اداروں کو بنیادی نقصان پہنچائے بغیر اس مرحلہ کو طے کر لے، تو گویا اس نے انقلاب کو انتہائی کامیابی و کامرانی اور اس کے سالہا سال تک باقی رہنے کی ضمانت فراہم کر لی ہے۔ ان مراحل میں جن اہم ترین مسائل سے انقلابیوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

الف) برسر اقتدار سیاسی نظام کی شکست کے بعد، اجتماعی قوتیں اس کی قائم مقام ہوتی ہیں اور اب قبل از انقلاب کے زمانہ کے برخلاف، ذمہ داری کا احساس کئے بغیر مخالف پارٹیوں کی طرح اس نظام کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اس مرحلہ میں گزشتہ سیاسی نظام کے زوال کے نتیجہ میں انقلابی قوتیں مجبور ہیں کہ سیاسی نظام کی مسئولیت اور ذمہ داریوں کو فوری طور پر نبھایا جائے اور انھیں عملی جامہ پہنایا جائے۔ جبکہ کچھ وجوہات، من جملہ حکومت چلانے والی مشنری سے عدم آشنائی، ناتجربہ کاری اور باتجربہ اور آزمودہ کار افراد کی عدم موجودگی کی وجہ سے بہت ساری مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اجتماعی معاشرہ کو نئے نظام سے گزشتہ نظام کی بہ نسبت کچھ زیادہ توقعات ہوتی ہیں جو مشکلات اور مسائل کو دوچندان کر دیتی ہیں۔

دوسری جانب سے، گزشتہ برسر اقتدار سیاسی نظام کے زوال، یعنی حکومتی سسٹم کو چلانے والی مشنری کی مکمل نابودی نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے طولانی مدت درکار ہے تاکہ گزشتہ نظام سے

مربوط تمام اقدار، ادارے، سسٹم اور اس سے وابستہ افراد اقتدار سے خارج ہو جائیں اور ان کی جگہ ایک جدید نظام آ جائے۔ اس لئے جدید سیاسی اقتدار کو چاہئے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی بعض توانائیوں کو گذشتہ نظام کے آثار کو ختم کرنے کے لئے صرف کرے۔

ب) سیاسی نظام کے زوال کے ساتھ انقلابیوں کی جنگ اور ان کی جدو جہد ختم نہیں ہوتی ہے، بلکہ دوسری صورت میں اور احتمالاً گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ شدّت کے ساتھ جاری رہتی ہے یہ جنگ اندرونی اور بیرونی دو محاذوں پر لڑی جاتی ہے:

ا۔ اندرونی محاذ: وہ یعنی معاشرہ کے اندر دو مخالف گروہوں سے برسر پیکار ہوتے ہیں:

پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو گزشتہ حکومت سے وابستہ رہا ہوتا ہے، چونکہ انھیں اس نظام سے فائدہ پہونچ رہا تھا اب مذکورہ حکومت کے زوال کے بعد وہ اپنے منافع کو خطرہ میں دیکھتے ہیں لہذا نئی انقلابی حکومت کی مخالفت پر اُتر آتے ہیں۔ ان مخالفین میں سلطنت طلب لوگوں کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے، جو فرانس، روس اور ایران کے انقلابوں میں موجود تھے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے۔ جو پہلی حکومت کی سرنگونی کے سلسلہ میں تمام دوسرے انقلابی گروہوں سے کلی طور پر اتحاد و اتفاق رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان کے ساتھ تعاون بھی کرتے تھے اور بعض موقع پر ان کے درمیان باضابطہ اتحاد بھی قائم ہو جاتا تھا، لیکن گزشتہ حکومت کی جگہ پر قائم ہونے والے نئے نظام اور آئین سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ ان گروہوں میں سے ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی مرضی اور معیار کی حکومت قائم کرے فطری طور پر ایسے گروہ اپنے گزشتہ اتحادیوں سے برسر پیکار ہوں گے اور اگر انھیں اپنے موقف میں جزئی کامیابی یا کم از کم ان کے ساتھ اتحاد نہیں ہو سکا تو یہ لوگ مخالفین سے جا ملتے ہیں اور برسر اقتدار انقلابیوں کے خلاف کھل کر میدان میں آ جاتے ہیں۔

۲۔ بیرونی محاذ: سیاسی حاکمیت کے حدود سے باہر بھی انقلابیوں کو دو قسم کی مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑھتا ہے:

پہلی قسم، ان معاشروں کی ہوتی ہے جو حاکمیت اور اپنے اقدار کے آئیڈیل کے اعتبار سے سر

نگون ہوئی سیاسی حکومت سے کافی حد تک مشابہت رکھتے ہیں اور مذکورہ نظام کی شکست کے نتیجہ میں اس چیز سے خائف رہتے ہیں کہ کہیں انقلابیوں کی کامیابی ان کے معاشرہ کے مخالف گروہوں کو انقلاب برپا کرنے پر مجبور نہ کردیں اور وہ بھی اپنے مشابہ معاشرہ میں کامیابی کے ساتھ رونما ہوئے حالات کی تقلید کرنے لگیں۔ اسی خوف کی وجہ سے انقلابیوں کی مخالفت کر کے نئے انقلابی معاشرہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اس کی بقاء واستحکام نیز تشکیل پانے میں رکاوٹ ڈالیں۔

مخالفت کی دوسری قسم ان معاشروں کی پیداوار ہے جن کے سرنگون ہوئی حکومت کے ساتھ انتہائی قریبی تعلقات تھے یا اس گزشتہ حکومت سے ان کے منافع وابستہ تھے اور اس نئی حکومت کی وجہ سے ان کے منافع خطرات میں پڑ گئے ہیں، ان منافع کے پیش نظر وہ گزشتہ حکومت کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے اور چونکہ مذکورہ سیاسی نظام کے گرنے اور اس کی جگہ نئے اقتدار کے آجانے سے ان کے منافع خطرے میں پڑ گئے ہیں، لہذا فطری بات ہے کہ ایسے معاشرے انقلابیوں کی مخالفت کرنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھیں گے۔

مذکورہ گروہوں کی مخالفت کے طریقہ کار میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا ہے اور غالباً انقلاب کی کامیابی کے تین بنیادی ارکان ان کی مخالفانہ کارروائیوں کے نشانہ ہوتے ہیں۔ وہ انقلاب کے معتقد اجتماعی گروہوں اور ان کی قیادت میں اختلاف وافتراق پیدا کر کے اور اسی طرح آئیڈیالوجی کو مسخ یا اس کے عملی ہونے کے سلسلہ میں ضعف ایجاد کر کے اس کے مختلف ابعاد کے وجود میں رکاوٹ آنے سے روکتے ہیں اور انقلاب کے معنی ومفہوم کو کھوکھلا کر کے انقلاب کے معتقدین میں یاس وناامیدی اور بدظنی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دنیا کے اکثر بڑے اور کامیاب انقلابات میں، جب انقلاب مخالف خارجی طاقتیں اختلاف پیدا کر کے یا اندرون ملک انقلاب دشمنوں کی حمایت کر کے انقلاب کو منحرف یا شکست دینے میں مایوس ہوجاتے ہیں تو وہ براہ راست فوجی کاروائی پر اُتر آتے ہیں، لیکن اس قسم کی اکثر فوجی کاروائیوں کا نتیجہ برعکس نکلا ہے، کیونکہ یہ خارجی حملہ اور تحمیلی جنگ، معاشرہ کے مزید متحد اور منسجم نیز جدید نظام

اور نئی حکومت کی ترقی کا سبب واقع ہوتے ہیں اور سیاسی نظام پر داخلی دباؤ کو کم کرتے ہیں۔

اکثر و بیشتر انقلابوں میں باوجود اس کے کہ شدت پسند گروہ، جن کے افکار و نظریات کی بنیاد پر انقلاب وجود میں آتا ہے، مبارزہ کا مرکزی کردار ادا کرتے ہیں، لیکن کامیابی کے فوراً بعد اقتدار پر قبضہ نہیں کرتے بلکہ سریر مملکت پر قدم جمانے کے زیادہ تر چانس، اعتدال پسند گروہوں کے ہوتے ہیں، کیونکہ:

ایک تو: اعتدال پسند افراد معاشرہ کے ان گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے گزشتہ حکومت سے روابط کم تھے اور اس نظام کے دوام اور پائداری میں کوئی خاص رول ادا نہیں کرتے تھے، نتیجہ کے طور پر بدظنی اور فوری طور پر انھیں مسترد کرنے کے مواقع نہیں ہوتے۔

دوسرے: اعتدال پسند افراد اپنی قدامت پسندانہ طبیعت کی وجہ سے، گزشتہ نظام سے قریبی وابستگی نہ رکھنے کے علاوہ ان کے سرسخت مخالف بھی نہیں تھے لہذا کسی طرف سے سخت دباؤ میں بھی نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف خاص اجتماعی حالات کی وجہ سے تجربہ اور مہارت حاصل کرنے کے امکانات بھی رکھتے ہیں۔ جبکہ شدت پسند گروہ، جو زیادہ تر جوان ہوتے ہیں اور تقریباً ایک طولانی مدت تک ایک برسر اقتدار نظام سے برسر پیکار رہتے ہیں، لہذا کسی عہدہ یا ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے ضروری تجربہ اور مہارت کی ان کے یہاں کمی ہوتی ہے۔

تیسرے یہ کہ: کامیابی کے ابتدائی مراحل میں، شدت پسند افراد اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ایک مدت تک حکومتی نظم و نسق کو اعتدال پسندوں کے سپرد کر دیں، تاکہ سیاسی۔ اجتماعی نظام کے ٹوٹ جانے کو روک لیں تاکہ کسی بھی طرح کی افراتفری پھیلنے سے ملک کو محفوظ رکھیں اور خود بچے کچھے انقلاب دشمن عناصر کا صفایا کر سکیں۔ کیونکہ وہ اس کام میں زیادہ تجربہ رکھتے ہیں اور دوسری جانب سے منصوبہ بندی اور بعد والے مرحلہ میں حکومت چلانے کے لئے کسی مضبوط اور وفادار امیدوار کی شناسائی کر سکیں۔

اس کے باوجود، چونکہ اکثر اعتدال پسند اپنی اعتدال پسندی کا تحفظ کرتے ہیں، لہذا انقلاب کے بعد معاشرے کے نظم کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے اور جلدی ہی اقتدار کی کرسی سے بے

دخل کر دیئے جاتے ہیں۔

ان کی ناکامی کے بنیادی اسباب حسب ذیل ہیں:

۱۔انقلاب کے بعد والے مسائل کو درک اور حل کرنے میں توانائی کا فقدان۔

۲۔ایک آزاد انقلابی معاشرہ میں آگاہی اور سیاسی تحرّک کے بڑھنے کی وجہ سے لوگوں میں پائی جانے والی، مطالبات اور اجتماعی دباؤ کو حل کرنے میں ناتوانائی و ناکامی۔

۳۔ہدایت و قیادت اور جدید اجتماعی گروہوں کو جذب کرنے میں ناکامی۔ کیونکہ اس سلسلہ میں مقبولیت حاصل کر کے یا پوری طاقت سے اقتدار کو تمرکز بخشنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اعتدال پسند ان دونوں خصوصیتوں سے محروم ہوتے ہیں۔

۴۔معاشرہ کے مخالف گروہوں کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے اور ان پر گرفت مضبوط کرنے میں ناکامی۔

۵۔سیاسی و اجتماعی جواز اور مقبولیت کے فقدان کی وجہ سے، حساس اور زبردست مواقع پر مناسب انقلابی فیصلہ کرنے کی جرئت نہ ہونا۔

یہ مسائل سبب بن جاتے ہیں کہ اعتدال پسند اپنی کارکردگی میں ٹال مٹول اور سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور سازش رچنے کا ان پر الزام لگ جاتا ہے اور آخر کار انقلابی افراد (جو وسیع عوامی حمایت کے حامل ہوتے ہیں) کے توسط سے اقتدار سے ہٹائے جاتے ہیں۔

جب اعتدال پسند اقتدار سے ہٹائے جاتے ہیں، تو حکومت شدت پسند انقلابیوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور انقلاب مخالف عناصر کی مخالفت میں شدّت پیدا ہو جاتی ہے اور اس مخالفت کا نتیجہ شدید ٹکراؤ ہوتا ہے اور بعض اوقات مسلحانہ جھڑپوں کی نوبت آجاتی ہے۔

تختہ الٹنے کی سازشیں، داخلی بغاوتیں، ٹرور اور دحشت کا ماحول پیدا کرنا من جملہ ان اقدامات میں سے ہے جنھیں انقلاب دشمن عناصر انقلابیوں کو شکست دے کر قدرت پر قبضہ کرنے کے لئے انجام دیتے ہیں۔ جب یہ اقدامات کامیاب نہیں ہوتے ہیں تو پھر تازہ وجود میں آئی انقلابی حکومت پر

ملک کے باہر سے جنگ کو مسلط کرنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ یہ جنگ حقیقت میں انقلاب کو سرنگون کر کے شکست دینے کے لئے دشمن کی آخری تلاش ہوتی ہے، جبکہ یہ جنگ بذات خود عوام کی جانب سے متحد ومجسم ہو کر حکومت کی حمایت کرنے کا سبب واقع ہوتی ہے، کیونکہ لوگ خود کو بیرونی دشمن کے مقابلہ میں قرار پاتے ہیں اور اپنے لئے فرض جانتے ہیں کہ اندورونی اختلافات کو چھوڑ کر بیرونی دشمن کے حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

مقابلہ کے اس مرحلہ میں انقلابیوں کی کامیابی اور انقلاب دشمنوں کی شکست برسر اقتدار سیاسی وانقلابی نظام کے استحکام کا سبب واقع ہوتی ہے۔ مذکورہ سیاسی۔ اجتماعی مشکلات اور اندورونی وبیرونی مخالفتوں پر انقلابیوں کی کامیابی کی اہم شرط صرف انقلاب کے بنیادی تین ارکان (قیادت عوام اور آئیڈیا لوجی) میں اتحاد ویکجہتی ہے۔ جس قدر انقلاب کی قیادت میں وسعت ومقبولیت اور اس کی لیاقت میں اضافہ ہوگا نیز اس کی مشروعیت بڑھے گی جس قدر، انقلاب کی کامیابی میں حصہ لینے والے گروہوں کے درمیان اتحاد ویکجہتی پیدا ہوگی اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور جس قدر انقلاب کی آئیڈیا لوجی میں ھمہ گیری پیدا ہوگی اور اس کا دائیرہ وسیع تر ہوگا نیز انقلابی معاشرہ کی اجتماعی زندگی کے وسیع تر ابعاد کے لئے جواب گو ہوگا، انقلاب کی کامیابی اور اس کے دوام کی ضمانت بھی بڑھتی جائے گی۔

جب تک ایک انقلابی تحریک اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تلاش وحرکت کی حالت میں ہوتی ہے اس کی مثال اس جاری پانی کے مانند ہے جو اپنی طراوت اور شفافیت کو حفظ کرنے کے علاوہ پہاڑوں اور چٹانوں سے ٹکرا کر زلال تر اور شاداب تر ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جب انقلاب فتح وکامیابی پانے کے بعد ایک جگہ رکنے کی حالت پیدا کرتا ہے تو اس کی مثال اس رُکے ہوئے پانی کے مانند ہوتی ہے جو مکدر و آلودہ ہو جاتا ہے[1]

ایک تازہ انقلاب کو جمود میں تبدیل کرنے والے عوامل میں سے ایک عامل یہ ہے کہ برسر اقتدار

1-Armold Toynbee, A study of history, Oxford, University Press, London 1949

سیاسی حکومت کو سرنگون کرنے کے فوراً بعد اس کے مقاصد کو اس ملک کی سرحدوں تک محدود کرنا نیز قانونی حکومت (قدیم یا جدید قانون) کو برقرار کرنے تک محدود کرنا ہے۔ اگرچہ قانونی اداروں کی تاسیس انقلابی نظام کو مستحکم اور پائیدار کرنے میں مدد کرسکتی ہے اور ناپائداری کو کم کرسکتی ہے لیکن یہ خطرہ موجو د ہے کہ انقلاب کی بقاء اور ترقی، جس کے لئے انقلابی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے، میں روکاوٹ پیدا کرے۔ خاص کر اقدار کی جنگ کے لحاظ من جملہ اخلاقی، ثقافتی، اداری اور اجتماعی اقدار سے مقابلہ کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر یہ کہ قیادت اپنی غیر معمولی ذہانت اور فہم وفراست سے انقلابی تحریک کو، کہ جس میں لوگوں کی فعالیت درکار ہے انقلابی معاشرہ اور انقلاب کی پائیداری کے لئے نظم وقانون کی برقراری کے درمیان ایک قسم کی آشتی اور ھماھنگی پیدا کرسکے۔

چھوتھی گفتگو:

اسلامی انقلاب کی آفتیں

انقلاب کو شکست اور زوال سے بچانے کی اصلی شرط تمام ابعاد میں اس کی سب آرزؤں خاص کر انقلاب کے پیغام کو ملک کی سرحدوں سے باہر وسعت بخشنے اور صادر کرنے میں اس کی پائیدار حرکت کا جاری رکھنا ہے۔اس بنا پر جس قدر مقصد بلند تر اور دست رس سے بالا تر ہو، انقلاب کے مضمحل اور تباہ ہونے کے امکانات کم تر ہوں گے۔لہذا اس راہ میں، انقلاب کی آفتوں سے مقابلہ کرنا اہم مسائل میں سے ہے، اور انقلابیوں کو چاہئیے کہ اسے پہچان کر دور کرنے کی کوشش کریں۔

باوجود اس کے کہ انقلاب کی آفتوں کو انقلابیوں کے ساتھ انقلاب دشمن عناصر کے طریقہ کار کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ اس سے متفاوت ہے۔انقلاب کی آفتوں کا سرچشمہ فطری، نفسیاتی اور اجتماعی عوامل ہیں جو انتہائی غیر محسوس صورت میں انقلابی معاشرہ کو متأثر کر کے رکھدیتے ہیں اور انقلاب کے معنیٰ و مفہوم کو اندر سے کھوکھلا کر کے اس پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔انقلابوں کی اہم آفتیں حسب ذیل ہیں:

الف) موقع پرستوں کا نفوذ: یہ گروہ، تمام انقلابات میں، اپنی بھیس بدل کر اور حقیقی انقلابیوں کو دھوکہ دے کر، معاشرہ کی مختلف آرگنائزیشنوں، اداروں حتی قیادت کی دست گاہ میں بھی نفوذ کرتے ہیں۔یہ لوگ بظاہر اصلی انقلابیوں سے انقلابی تر دکھائی دیتے ہیں، لیکن چونکہ انقلاب کے نصب العین پر کسی قسم کا اعتقاد نہیں رکھتے، اس لئے انقلاب میں انحراف اور اس کی ماہیت کو بدلنے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔اس طرح کے موقع پرست دو قسم کے ہوتے ہیں:

پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو جاہ طلبی، فرصت طلبی اور اجتماعی اجارہ داری کے علاوہ کسی خاص قسم کا عقیدہ نہیں رکھتا، اور ہر طرح کے سیاسی نظام کے ساتھ (اپنے مفاد کے لئے ساز و باز کر

لیتے ہیں) اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں اور حکمران طبقہ کو پھنسانے کے لئے اپنی پالیسی بدلنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو حاکم طبقہ کے نظریہ کے ساتھ متضاد عقیدہ رکھتے ہیں اور جب انقلابیوں کے ساتھ کھلم کھلا مخالفت کی وجہ سے نا اُمید ہو جاتے ہیں تو بھیس بدل کر سیاسی نظام میں نفوذ کر جاتے ہیں اور مناسب موقع دیکھ کر انقلاب پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

ب) متروک و مسترد ثقافتی اقدار کی طرف تدریجاً پلٹنا: بدیہی ہے کہ ہر انقلابی معاشرہ میں برسر اقتدار سیاسی نظام کے زوال سے، اس پر مسلط تہذیبی اقدار کا فوری طور پر خاتمہ نہیں ہوتا ہے مذکورہ اقدار کا جاری رہنا معاشرہ پر مسلط اقدار کی مدت اور ثقافتی، اجتماعی اور تربیتی مسائل پر ان کے نفوذ پر منحصر ہے۔ جس قدر انقلاب کی کامیابی کے لئے مبارزہ کی مدت کم ہوگی، گزشتہ نظام کی اقدار کے آثار زیادہ پائیدار ہوں گے۔

حسن پرستی، تجمل گرائی، آرام طلبی، اخلاقی برائیاں، امتیازی سلوک، بے انصافی اور رشوت ستانی جیسی عادات انقلابیوں کی نظر میں قابل مذمت ہیں۔ گزشتہ ثقافتی اقدار کے خلاف مسلسل اور طولانی مبارزہ عمل میں نہ آنے کی صورت میں، ان اقدار کے تدریجاً اور دوبارہ پھولنے پھلنے نیز انقلاب کی اصلی اقدار سے انحراف اور اس کے آلودہ ہونے کا سبب واقع ہوتی ہے۔

ج) انقلابی قوتوں کا خستہ ہو جانا اور ان کا انقلابی جذبات سے عادی ہونا: انقلاب کی آفتوں میں سے ایک اور آفت انقلابیوں میں کاہلی پیدا ہونا ہے۔ انقلاب کی کامیابی اور مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے بعد انقلابیوں کی کنارہ کشی، مشکلات سے دوچار ہونے نیز ان کا حل تلاش کرنے میں ناکامی، اسی طرح انقلابیوں کی کنارہ کشی کے نتیجہ میں انقلابی نظریات کے متحقق ہونے میں نا اُمیدی، انقلاب کی خطرناک آفتوں میں سے ہیں۔

انقلاب کے تینوں ارکان میں خرابیاں پیدا ہونا، جیسے: قیادت میں کمزوری اور اس میں انحراف یا قدرت طلبی اور انقلابی مطمع نظر سے صرف نظر آئیڈیالوجی کی انحرافی تفسیر و تاویل یا انقلابیوں کے

تقاضوں کو پورا کرنے میں آئیڈیالوجی کی ناتوانائی، خلاصہ یہ کہ انقلاب کے معتقد اجتماعی گروہوں کا میدان مبارزہ سے نکل جانا بھی انقلاب کی آفتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر انقلابی طاقتیں میدان مبارزہ میں مشکلات، دباؤ، مخالفتوں کا شکار ہو جائے اور انقلاب کی آفتوں سے مقابلہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، تو مطلق العنانیت کے وجود میں آجانے کا خطرہ ہوتا ہے، چونکہ ایسے حالات میں اکثر اجتماعی گروہوں کی یہی چاہت ہوتی ہے۔

د) انقلابی اقدار کو بعد والی نسلوں میں منتقل کرنے کی ناتوانی: پہلی نسل یا انقلاب لانے والے افراد انقلاب کے وقت (انقلاب سے پہلے یا انقلاب کے بعد) حاضر ہونے کی وجہ سے انقلاب کے حالات اور اس کے شرائط کے بارے میں ایک خاص قسم کا تاثر اور شعور رکھتے ہیں اور اسی تاثر اور شعور نیز انقلاب کے لئے بھاری قیمت چکانے کی وجہ سے، انقلاب کے نصب العین کے تحفظ کے لئے جان نثاری اور قربانی دینے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ اس نسل کے فرزندان فطری طور پر اس قسم کی حالت اور جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔

اگر انقلاب کی پہلی نسل مطلوب اور مناسب صورت میں بعد والی نسل کو انقلابی تربیت دے کر اسے انقلاب کو جاری رکھنے کے لئے آمادہ نہ کر سکے، تو اس صورت میں دونسلوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے جو انقلاب کے لئے شدید اور بنیادی بحران کا باعث ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ:

ایران کے اسلامی انقلاب کا تجزیہ

پہلی فصل: انقلاب سے پہلے سیاسی اور اجتماعی حالات کا پس منظر

دوسری فصل: اسلامی انقلاب کی کامیابی کے عوامل

تیسری فصل: انقلاب میں تیزی آنے کے عوامل

چوتھی فصل: اسلامی انقلاب کے نتائج

پہلی فصل:

انقلاب سے پہلے سیاسی اور اجتماعی حالات کا پس منظر

پہلی گفتگو: سیاسی طاقت

دوسری گفتگو: اجتماعی قدرت

اسلامی انقلاب کا پس منظر اور اس کے شائع

پہلی گفتگو:

سیاسی طاقت

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے صرف وہ معاشرے انقلاب کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، جن کا حکومت سے رابطہ نہیں ہوتا، اور برسر اقتدار سیاسی حکومت معاشرہ کے ان طبقوں سے دور رہ کر عوامی حمایت کو کھو دیتی ہے اور معاشرہ میں دو قطبی (دو بعدی) حکمرانی کارفرما ہوتی ہے۔ ایران میں بہت پہلے سے ایسے حالات وجود میں آچکے تھے: اس معنی میں کہ کم ایسا وقت آیا ہے کہ سیاسی حکومت عوامی محبوبیت اور مقبولیت کی حامل رہی ہو اور اصولی طور پر لوگوں کی محرومیت اور ثقافتی استضعاف کی وجہ سے سیاسی حکومتیں اپنے آپ کو اس قسم کی مقبولیت کی محتاج بھی نہیں سمجھتی تھی۔

ایران میں سیاسی اقتدار کا اصلی محور ہمیشہ سے سلاطین تھے اور بادشاہت کا سلسلہ ایران میں بہت قدیمی اور طولانی رہا ہے کہ جس میں حکومت کی باگ ڈور خاندانی بنیادوں پر حاصل کی جاتی تھی اسلامی انقلاب کا پس منظر اور اس کے نتائج نیز اپنے داخلی یا خارجی دشمن سے برسر پیکار ہو کر ان پر غلبہ کر کے حکومت کا کنٹرول ہاتھ میں لیا جاتا تھا۔ اکثر سلاطین گستاخ، خونریز اور خودغرض ہوا کرتے تھے اور ان کے سلسلہ کا جاری رہنا زمانہ کے حالات، قابلیت اور اپنے دشمنوں کو کچلنے کے حوالے سے ان کی لیاقت پر منحصر ہوتا تھا۔ اس ملک کی پوری تاریخ میں، بہت سے سلاطین جو قدرت وثروت کے مالک بنے ہیں، اپنی شہرت واقتدار کے عروج پر پہنچنے کے باوجود المناک حادثہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران صرف تین بادشاہ اپنی طبیعی موت سے مرے ہیں اور باقی یا قتل ہوئے ہیں یا جلاوطنی کے عالم میں انھیں موت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ محمد رضا شاہ اور اس کا باپ شاہی سلسلہ کے آخری دو شخص تھے کہ دونوں جلاوطنی کے عالم میں دنیا سے

چل بسے۔

گزشتہ دوصدیوں کے دوران مغربی سامراج کے آغاز اور اس کے پھیلاؤ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں یورپی ملکوں کے نفوذ کے نتیجہ میں ایران بھی اپنی اسٹریٹجک حالات اور زیر زمین منابع کے پیش نظر یورپی ممالک کی توجہ کا مرکز بنا۔ یہ توجہ بذات خود سیاسی اقتدار کی تبدیلی کا ایک اور اہم سبب قرار پایا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ اور روس کے درمیان منافع کا تضاد اور اس جنگ کے بعد دو بڑی طاقتوں، امریکہ اور سوویت یونین کے تحت دنیا کا دو بلاکوں میں تقسیم ہو جانا، امریکہ کے لئے عالمی سیاست کی کھیل میں قدم رکھنے کا سبب بنا اور اس سبب نے دنیا کو دو طاقتوں کے درمیان رقابت کے میدان میں تبدیل کر دیا۔ ایران بھی ان رقابتوں سے محفوظ میں نہ رہ سکا۔ یہ رقابتیں ایران کی سیاسی اقتدار کے ثبات اور بے ثباتی کے حوالے سے نہایت اہم عوامل کے تناظر میں دیکھی جاتی ہیں۔

پہلوی خاندان کا سلسلہ جو ۱۳۰۴ہجری شمسی (۱۹۲۵ء) میں ایک غنڈے اور خودغرض راہزن و قزاق کے توسط سے وجود میں آنے کے بعد اس کے بیٹے پر ختم ہوا، ایران میں بادشاہت کا آخری سلسلہ تھا۔ رضا شاہ کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے ایران پر قاچار خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کے بادشاہ نسبتاً قوی، ظالم اور مطلق العنان ہوا کرتے تھے، جو آخر میں چل کر کمزور ہو گئے سلسلۂ قاچار کا آخری بادشاہ احمد شاہ تھا جو معزول شدہ محمد علی شاہ کا بیٹا تھا۔ احمد شاہ ان میں سب سے کمزور بادشاہ شمار ہوتا تھا۔ احمد شاہ کی سلطنت پہلی جنگ عظیم اور انقلاب روس کی ہم عصر قرار پاتی ہے۔

روس میں بلشویکوں کے اقتدار پر قبضہ کرنے سے پہلے، زار روس کا ایران میں کافی اثر رسوخ تھا اور ایران کے شمالی علاقے، عملی طور پر روس کے اثر رسوخ اور اس کے قبضہ میں تھے۔ قزاق نامی ایران فوج بھی روسی افسروں کی کمان میں تھی۔ رضا خان، جو چودہ سال کی عمر میں قزاق سے ملحق ہوا تھا، نے کم ہی مدت میں اپنی جرأت اور بیباکی کے سبب سے روسی

افسروں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے اواخر میں، جب روس میں انقلاب رونما ہوا، ایک برجستہ ترین قزاق افسر کی حیثیت سے معروف ہو چکا تھا، جو براہ راست روسی کمانڈروں کے تحت نظر رہ کر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ روس میں انقلاب رونما ہوتے ہی، انگریزوں نے، جو تمام دنیا من جملہ ایران میں بلشویکی افکار کے پھیلنے کے بارے میں فکر مند تھے، فوراً اقدام کر کے، روس کے اندر افراتفری پیدا کر دی اور زار روس کے افسروں کی پراکندگی ایرانی قزاق فوجیوں پر کمانڈ کرنے والے روسی افسروں کو معزول کرنے کے اسباب فراہم کر دیئے اور ان کی جگہ پر ایرانی افسروں کو تعینات کر دیا۔ اس وقت ایران کی سرزمین کا ایک حصہ انگریز فوجوں کے قبضہ میں تھا اور وہ ایران میں روسیوں کے اثر رسوخ کو ختم کرنے کے ضمن میں اس علاقہ میں روس کی جدید بلشویکی حکومت کے خلاف مقابلہ کرنے کے لئے ایک فوج منظّم کرنا چاہتے تھے۔ رضا خان نے اس حوالے سے انگریزوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا جس کی وجہ سے قزاق سپاہیوں کے ایک حصہ کی کمان اس کو سونپی گئی۔

انگریزوں کی سامراجی حکومت نے، تاریخ ایران کے اس مرحلہ میں وثوق الدولہ کے ۱۹۱۹ء کی قرارداد کو ناکام ہوتے دیکھ کر (جس قرارداد کے مطابق ایران رسمی طور پر تحت حمایت برطانیہ، دوسرے الفاظ میں برطانیہ کی نو آبادی بن جاتا تھا) بین الاقوامی سطح پر رونما ہوئے استثنائی حالات، خاص کر زار روس کی حکومت کے زوال اور امریکی حکومت کے دیگرگوں ہونے سے، اسلامی ملکوں، جیسے ایران اور خلافت عثمانیہ میں اپنے سامراجی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سیاست کو اپنانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک خودسر بظاہر مستقل اور درحقیقت مکمل طور پر برطانیہ کی زیر تسلط ایک مرکزی حکومت تشکیل دے اور مغربی تہذیب کے زیر اثر سیاست کو بروئے کار لا کر معاشرہ پر حاکم اسلامی تہذیب وتمدن کا مقابلہ کرے اور اس کے ضمن میں برطانیہ کے منافع کو بھی تحفظ بخشا جائے۔

انگریز، تمبا کو تحریک میں شکست سے دو چار ہونے اور مشروطہ تحریک میں مذہبی علماء کی قوت کا مشاہدہ کرنے کے بعد علماء کی مخالفت کو وثوق الدولہ کی ۱۹۱۹ء کی قرارداد کی شکست کا سبب جانتے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلامی معاشروں میں صرف مذہب کی طاقت کو حذف کرنے اور مذہبی رہنماؤں کی سیاست میں مداخلت کو روکنے کے بعد ہی اپنے سامراجی منافع کو تحفظ بخش سکتے ہیں اور یہ وہ مأموریت تھی کہ جسے ۱۲۹۹ش بہ مطابق ۱۹۲۰ء کی تختہ الٹنے کی سازش میں رضا خان کو سونپی گئی۔ رضا خان نے انگریزوں کی راہنمائی سے تختہ الٹنے کی سازش کا اقدام کیا۔[۱] لیکن پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت احمد شاہ کو ہٹانے کے بجائے اسے تجویز پیش کی گئی کہ دو باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے، یا تختہ الٹنے والی حکومت کی تائید یا پھر استعفیٰ دے۔ بدیہی ہے کہ قاچار بادشاہ نے تختہ الٹنے والی حکومت کی تائید کو استعفی پر ترجیح دیدی لیکن عملی طور پر اپنے تمام اقتدار اور اختیارات کو کھو بیٹھا۔

چار سال کے بعد، رضا خان نے اپنے اقتدار کی بنیادوں کو ہر لحاظ سے مستحکم کرلیا، اور سلطنتی نظام کو جمہوری نظام میں تبدیل کرنے کا اس کا رجحان ناکام ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ سلسلئہ قاچار کو ہٹا کر اس کی جگہ خود کو ایران کا قانونی بادشاہ معرفی کرے۔

سلطنت و اقتدار کی منتقلی بظاہر قانونی صورت میں اور دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ انجام پائی۔ اس اسمبلی نے ۱۲۸۶ ہجری شمسی (۱۹۰۵ء) کے آئین، کہ جس کے مطابق سلطنت کا حق فقط قاچار خاندان کو تھا، میں تجدید نظر کر کے رضا شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور ایران کی

۱۔ انگریزوں کی طرف سے رضا خان کو تختہ الٹنے کی سازش کے لئے انتخاب کرنے کے طریقہ کار کے بارے میں عمیق اور مستند آگاہی حاصل کرنے کے لئے کتاب ''ظہور وسقوط سلطنت پہلوی'' مؤسسہ مطالعات وتحقیقات سیاسی۔ انتشارات اطلاعات تہران ۱۳۷۰ھ ج ۲، ص ۱۴۴ کے بعد ملاحظہ کریں۔

بادشاہت کو اس کے خاندان کی وراثت و جائداد میں دے دیا گیا۔ رضا خان ۲۵ آذر ۱۳۰۴ ہجری شمسی مطابق ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء) کو رضا شاہ پہلوی کے نام سے تخت شاہی پر متمکن ہوا۔

اس خاندان کے لئے ''پہلوی'' نام کا انتخاب قابل توجہ نکتہ تھا۔ ''پہلوی'' ایران کی قدیم زبان کا نام ہے اور رضا خان نے اپنے لئے اس نام کا انتخاب کر کے ثابت کیا کہ وہ ایران کے قدیمی رسومات کو موجودہ ایرانی معاشرے میں رائج نیز اسلامی رسومات پر ترجیح دینا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کے سولہ سال سے زائد مدت کے دوران انگریزوں کی ہدایت پر کچھ ایسے کام انجام دئے جنھیں اس کے بعد اس کے بیٹے نے جاری رکھا۔ ان کاموں میں بہت سے اقدام ایرانی معاشرہ کے مذہبی رسومات کے خلاف تھے، ان میں سے من جملہ ''پردے پر پابندی'' اور عورتوں کے لئے برقعہ اور نقاب کو ہٹا کر اس کی جگہ مغربی طرز کا لباس پہننے پر مجبور کرنا، جلوس عزاداری اور مجالس پر پابندی اور علماء کا روحانی لباس اتارنے کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں، ایران کی اسٹریٹیجک پوزیشن اور جنگی ساز و سامان کو ایران کے راستے روس کی سرزمین تک پہنچانے کی ضرورت کے پیش نظر متحدین نے اپنے سپاہیوں کو ایران میں رکھنا ضروری سمجھا اور فیصلہ کیا کہ ایران کی سرزمین کو جس بہانے سے بھی ممکن ہو سکے اپنے قبضہ میں رکھیں۔ بیرونی طاقتوں، خاص کر برطانیہ کی فوج کے ایران میں موجود ہونے کے پیش نظر خود انگریزوں کے برسر اقتدار لائے ہوئے رضا شاہ کی جیسی طاقتور حکومت کا وجود بھی لوگوں کو کھٹکنے لگا۔ اس بات کے پیش نظر ایران میں جرمنی کے اثر رسوخ کے پھیلنے اور رضا شاہ کے لئے جرمنی کی طرف رجحان کا بیہودہ بہانہ بنا کر یہ الٹی میٹم دے دیا گیا کہ جرمنی کے افراد ایران سے نکل جائیں ،حکومت ایران کی طرف سے اس الٹی میٹم کو پانے کے باوجود متحدین نے ایران کی سرزمین پر قبضہ کئے رکھا اور رضا شاہ کو استفی دینے پر مجبور کیا گیا۔ انگریز، کہ جنھوں نے رضا شاہ کو اقتدار پر آنے کے اسباب فراہم کئے تھے وہ خود اس کے ایران سے جلاوطن ہونے پر اصرار کرنے لگے، اور روس اور برطانوی فوجیوں کے توسط سے ایران پر قبضہ کرنے کے تھوڑی ہی مدت کے بعد رضا شاہ کو مشرقی

افریقہ کے جنوبی ساحل مورشیش لے جانے کے لئے بندر عباس میں ایک برطانوی کشتی لنگر انداز ہوئی۔[1] بعد میں رضا شاہ کو جزیرۂ مورشیش سے جنوبی افریقہ میں ''جہانسبرگ'' کے مقام پر منتقل کیا گیا اور دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ سے ایک سال پہلے جنوری ۱۹۴۴ء میں جلاوطنی کے عالم میں انتقال کر گیا۔ محمد رضا اور اشرف نامی دو جڑواں بھائی بہن ۱۲۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو رضا خان کی پہلی بیوی سے اس وقت پیدا ہوئے، جب رضا خان صرف ایک قزاق افسر تھا۔ رضا خان نے سلطنت سنبھالنے کے بعد محمد رضا کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اسے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے سوئیزرلینڈ بھیجدیا۔

محمد رضا بچپن میں ایک کمزور اور بیمار بچہ تھا۔ رضا شاہ اپنے بیٹے کو اپنے جیسا ایک سخت مزاج اور قوی مرد بنانا چاہتا تھا، اس لئے اسے عسکری (فوجی) مدرسہ میں بھیجا۔ عسکری مدرسہ کے ماحول نے محمد رضا کی ذہنیت کو یکسر بدل دیا۔ ۱۳۲۰ء ہجری شمسی (۱۹۴۱ء) میں رضا شاہ کے استعفی اور اس کی جلاوطنی کے بعد، متحدین، خاص کر انگریزوں نے تین ہفتہ کے صلاح ومشورہ کے بعد رضا شاہ کے جانشین کے طور پر اس کے بیٹے محمد رضا پر اتفاق کرلیا۔ اس وقت وہ ایک خام اور ناتجربہ کار جوان تھا اور اپنے ذمہ لئے گئے فرائض کو انجام دینے کے لئے ایک قوی مشاور کا محتاج تھا۔ انگریزوں نے اس کی سرپرستی کے لئے محمد علی فروغی کو وزیر اعظم کے طور پر منتخب کیا۔[2]

فروغی چھ مہینے سے زیادہ اس عہدہ پر باقی نہیں رہ سکا اور بیماری کی وجہ سے اپنے عہدہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ فروغی کے جانشین اور اس کے بعد بننے والے وزرائے اعظم کہ جنہوں نے ایران کی زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لی اکثر برطانیہ کے سفارت کی طرف سے منتخب ہوتے تھے اور محمد رضا شاہ

۱۔ رضا شاہ کے زوال کے بارے میں بیشتر معلومات حاصل کرنے کے لئے، مصنف کی کتاب ''پہلوی حکومت کے دوران خارجی سیاست پر ایک نظر'' انتشارات داد گستر ص ۶۸۔۷۰ کا مطالعہ فرمائیں۔

۲۔ فروغی، فراماسونری کا ایک بہت بڑا استاد تھا، یہ وہی شخص تھا جو قاچار سے پہلوی خاندان میں سلطنت کے منتقل ہوتے وقت بھی وزیر اعظم تھا اور اس منتقلی میں بھی وہ اہم رول ادا کرچکا تھا۔

جو انگریزوں کی طرف سے کیئے گئے اپنے باپ کے ساتھ برتاؤ کا خود گواہ تھا، ان کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

محمد رضا کی سلطنت کی مدت کو چار معین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور: ۱۳۲۰ سے ۱۳۲۵ ھ ش تک (۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک) کہ اس دوران ایران خارجی افواج کے زیر تسلط تھا۔

دوسرا دور: ۱۳۲۵ ھ ش سے ۱۳۳۲ ھ ش تک (۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک) سات سال کی مدت کا دور تھا۔ اس دوران بادشاہ نے ایران سے فرار اختیار کی اور مصدق کی حکومت کا زوال آیا۔

تیسرا دور: دو سال کی مدت۔ شاہ کے ایران لوٹنے کی تاریخ سے لفٹننٹ جنرل زاہدی کے وزیر اعظم کے عہدہ سے معطل کیئے جانے تک کا زمانہ۔

چوتھا دور: یہ دور ۱۳۳۴ ھ ش (۱۹۵۵ء) کے بعد کا دور ہے، جس میں محمد رضا اپنی خود خواہی اور اقتدار کے نقطہ عروج تک پہنچنے کے بعد ۱۳۵۷ ھ ش (۱۹۷۹ء) میں زوال سے دوچار ہوا۔

ایک مجموعی تقسیم بندی کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ محمد رضا شاہ ۱۳۳۴ ھ ش (۱۹۵۵ء) تک یعنی پہلے چودہ سال کے دوران اپنے باپ کی جیسی قدرت حاصل نہ کر سکا۔ لیکن ۱۳۳۴ ھ ش (۱۹۵۵ء) کے بعد قریب قریب ۲۳ سال تک اس نے تقریباً ایک با اختیار، ظالم اور مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔

محمد رضا شاہ کی حکومت کے پہلے چودہ سال کا دور ایران کی سیاسی تاریخ کا پُر آشوب ترین دور شمار ہوتا ہے اس دور کے ابتدائی برسوں میں ایران خارجی افواج کے قبضہ میں تھا، شاہ کے ہاتھ میں عملاً کوئی خاص اختیار نہیں تھا اور ایران کی پارلیمنٹ کے اکثر نمائیدے قابض حکومتوں کے اثر رسوخ اور ان کے ایما پر منتخب ہوتے تھے اور ان ہی کے حکم کی اطاعت کرتے تھے۔

اس دوران آیت اللہ کاشانی اور نواب صفوی کی رہبری میں مذہبی سیاسی، طاقتوں کے سرگرم ہونے کے علاوہ دو اور سیاسی طاقتیں وجود میں آگئیں کہ ان میں سے ایک ڈاکٹر محمد مصدق کی قیادت میں

جبہہ ملی (قومی محاذ) لیبرل افراد پر مشتمل تھی اور دوسری کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جبہہ ملی نے اجنبیوں کے ملک پر قبضہ اور ایران کے داخلی مسائل میں ان کی مداخلت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے بیگانہ مخالف جذبات کا استفادہ کر کے فروغ پایا اور کمیونسٹ پارٹی نے سوویت یونین کی حکومت کی کھلم کھلا حمایت سے، خاص کر سرخ فوج کے زیر قبضہ ملک کے شمالی صوبوں میں چند مراکز پر اپنا قبضہ جمالیا۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر قابض فوجیوں کی طرف سے ایران چھوڑنے کا مسئلہ پیش آیا۔ متحدین کے رہبروں نے جنگ کے دوران تہران میں منعقدہ ایک کانفرنس میں وعدہ کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے چھ ماہ بعد ایران چھوڑ دیں گے، لیکن سوویت یونین کی حکومت ایران کے شمال میں پٹرول استخراج کرنے کی اجارہ داری میں شکست کھانے کی وجہ سے ایران کو چھوڑنے کی صورت میں ایران میں اپنے اثر نفوذ کو کلی طور پر کھو دیتی۔ اس لئے سوویت یونین نے یہ فیصلہ کیا کہ اس ملک میں اپنے لئے ایک مضبوط اڈہ قائم کرے۔ اس نقشہ پر عملی جامہ پہنانے کے لئے صوبہ آذربائیجان میں ''حزب ڈیموکریٹ'' کے نام پر ایک مستقل کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل دی۔ ایران کو چھوڑنے سے پہلے سوویت یونین کی سرخ فوج کی مدد سے یہ پارٹی آذربائیجان پر مسلط ہوئی۔

اس زمانہ میں ''قوام السلطنہ'' نام کا تجربہ کار اور برجستہ سیاسی شخص، کہ جس نے محمد رضا کی سلطنت کے ابتدائی ایام میں ابھی تازہ سر اٹھایا تھا اور اس کا رقیب شمار ہوتا تھا، نیز وزیر اعظم کے عہدہ پر بھی فائز تھا۔ اس نے روسیوں کے ساتھ اچھے تعلقات کا ڈھونگ رچا اور شمال کے پٹرول کے اختیارات کا وعدہ دینے کے بہانے اور آخر کار ''حزب تودہ'' کے تین وزیروں کو اپنی کابینہ میں لے کر، روسیوں کو ملک چھوڑنے پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ قابل ذکر بات ہے کہ روسی، امریکہ کی طرف سے بھی دباؤ میں تھے اور ایک اطلاع کے مطابق امریکہ کی طرف سے انھیں دھمکی دی جاچکی تھی لہذا وہ ایران چھوڑنے پر راضی ہوگئے۔ سرخ فوج کے ایران سے نکلنے کے ساتھ ہی آذربائیجان میں روس کی کٹھ پتلی حکومت کا بھی زوال آگیا۔

قوام السلطنہ بیک وقت آذربائیجان کے مسئلہ کو حل کرنے اور سوویت یونین کی فوج کو ایران

سے نکالنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی فکر میں لگا تھا، اس لئے اس نے ''حزب ڈیموکریٹ'' نام کی ایک سیاسی پارٹی تشکیل دی اور پارلیمنٹ میں قطعی اکثریت کو حاصل کرنے کی امید سے انتخاب کرایا۔ لیکن شاہ، جو قوام السلطنہ کے عزائم سے آگاہ، نیز اس سے خطرہ محسوس کر رہا تھا اس نے پس پردہ اس کے خلاف سازش کرنا شروع کر دی۔ پارلیمنٹ کے اکثر نمائندے قوام السلطنہ کی حزب ڈیموکریٹ کے تھے، کہ جو اور بظاہر اس کے حامی تھے، لیکن ان میں سے بہت سارے ایسے نمائندے تھے جن کا پس پردہ شاہی دربار سے رابطہ تھا۔ نتیجہ کے طور پر پارلیمنٹ میں شمال کے پٹرول کا امتیاز سوویت یونین کو دیئے جانے کا منصوبہ رد ہونے کے بعد پارلیمنٹ میں قوام السلطنہ کے خلاف تحریک نے زور پکڑ لیا اور سرانجام یہ تحریک اس کی حکومت کے زوال پر منتہی ہوئی۔ اس طرح قوام السلطنہ کے منصوبوں کے بارے میں شاہ کا خوف دور ہوا لیکن دوسرے خطرات اور پریشانیاں اس کے لئے موجود تھیں۔

قوام السلطنہ کے زوال کی تھوڑی مدت کے بعد شاہ کے خلاف پہلا قاتلانہ حملہ ہوا اور قاتلانہ حملہ میں حملہ آور کی ناکامی نیز اس کے مارے جانے کی وجہ سے اس راز سے پردہ نہ اٹھ سکا کہ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ (اگرچہ ''حزب تودہ'' پر اس قتل کی سازش میں ہاتھ ہونے کا الزام لگایا گیا اور اسی بہانہ سے اسے غیر قانونی قرار دیا گیا) اس دوران لیبرل۔ قومی گروہ نے ڈاکٹر مصدق کی قیادت میں ''جبهہ ملی'' (قومی محاذ) کے نام پر اپنی سیاسی پارٹی کا اعلان کر دیا اور برطانیہ کی تیل کی کمپنی کے خلاف ایران کے حقوق کے نام پر نیا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو وسعت بخشی۔ ان کے مدمقابل آیت اللہ کاشانی کی قیادت میں علمائے مبارز کی تحریک اور ساتھ ہی ساتھ فدائیان اسلام، ملک میں اسلامی احکام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہوئے حکومت کی کارکردگی پر اعتراض کرنے لگے۔ اس طرح یہ دونوں تحریکیں شاہ کے لئے ایک نیا خطرہ بن گئیں۔

وزیر دربار، ھژیر کا قتل کی وجہ سے شاہ کے لئے اندورونی اور بیرونی دباؤ بڑھ گیا اور اس امر کا سبب بنا کہ وہ ۱۳۲۹ھ ش (۱۹۵۰ء) میں اس وقت کے فوج کے کمانڈر، لفٹننٹ جنرل حاج ''علی رزم

آرا'' کو وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے منتخب کرے۔ اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ ''رزم آرا'' شاہ کی مرضی کے خلاف وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے منتخب ہوا تھا، کیونکہ شاہ اپنی اندورونی کمزریوں کے پیش نظر ایک مضبوط وطاقتور وزیر اعظم کے وجود سے خائف تھا اور رزم آرا کہ جس نے فوج کی سر براہی کے دوران اپنی کارکردگی کی وجہ سے اپنی ذھانت وہوشیاری کا لوہا منوا چکا تھا، اور وزارت عظمی کا عہدہ سنبھالتے وقت اسے فوج کی حمایت بھی حاصل تھی اور شاہ، جو ہمیشہ فوج کو حکومت کے دست نگر رکھنا چاہتا تھا اس کے لئے ان دو طاقتوں کا یکجا ہونا ایک زبردست خطرہ کا باعث تھا۔ اس کے علاوہ رزم آرا نے خارجی تعلقات کے استوار کرنے میں بھی کافی مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ انگریزوں کے ساتھ حفیہ معاہدہ کے علاوہ روسیوں کے اعتماد کو بھی حاصل کر چکا تھا۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے شاہ اس کے بارے میں قوام السلطنہ کی بہ نسبت زیادہ خطرہ محسوس کرتا تھا۔ حقیقت میں رزم آرا کے منصوبوں سے محمد رضا شاہ کو اپنی سلطنت سے بے دخل کئے جانے کے قرائن واضح طور پر نظر آنے لگے۔ یہ افواہ پھیل چکی تھی کہ رزم آرا ایک مناسب موقع سے فائدہ اٹھا کر فوجی بغاوت کے ذریعہ محمد رضا شاہ کا تختہ الٹنا چاہتا ہے اور اس کی جگہ پر اس کے بھائی علی رضا کو تخت پر بیٹھانا چاہتا ہے۔

رزم آرا کی حکومت میں جو اہم ترین مسئلہ پیش آیا اور جس کی وجہ سے تختہ الٹنے کے منصوبہ میں تاخیر ہوئی، وہ تیل کا مسئلہ اور ''جبہہ ملی'' کی طرف سے جنوب کے تیل کے امتیاز کو لغو کرنے کی کوشش تھی۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں رزم آرا نے انگریزوں کو راضی کرنے اور اسی غرض سے تیل کا ایک معاہدہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ مذاکرات بھی کئے اور اس سلسلہ میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی رہا۔ لیکن انگریزوں کے ساتھ اپنے طے پائے معاہدات کو پارلیمنٹ میں پاس کرانے سے پہلے ہی اس کا قتل ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا یہ قتل فدائیاں اسلام کے گروہ کے ایک شخص کے ہاتھوں انگریزوں کے ساتھ سازش کرنے کی وجہ سے، اعتراض کے عنوان سے انجام دیا گیا تھا۔[1]

۱۔ رزم آرا کے قتل کے بارے میں متضاد بیانات اور مدارک پیش کئے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حقیقت میں وہ خلیل طہماسی (فدائیاں اسلام کے رکن) کی گولی سے قتل نہیں ہوا ہے بلکہ اپنے محافظین میں سے ایک کی گولی سے مارا گیا ہے بلکہ اس سے اہم تر یہ کہ دربار کے ایماء پر قتل کیا گیا ہے۔ محمد ترکمان کی کتاب ''اسرار قتل رزم آرا'' انتشارات موسسہ خدمات فرہنگی رسا ۱۳۷۰ھ (۱۹۹۱ء) ملاحظہ ہو۔

رزم آرا کا قتل، شاہ پر قاتلانہ حملہ کے بعد، نیز دوسری جنگ عظیم کے بعد ایران میں دوسرا اہم سیاسی قتل تھا، جس نے اس زمانہ کے سیاستمداروں کو وحشت زدہ کر دیا تھا لیکن شاہ دوسری جہتوں سے اپنے وقت کے طاقتور وزیر اعظم کے قتل پر بہت حد تک راضی دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ رزم آرا کے قتل ہو نے سے اس کی سلطنت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ٹل گیا تھا۔ شاہ کی خوشحالی زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکی۔ رزم آرا کے قتل کے بعد جو سیاسی طوفان ایران میں کھڑا ہوا اس نے شاہ کی سلطنت کی بنیادوں کو بھی ہلا کے رکھ دیا اور اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ نیشنل پارلیمنٹ میں پٹرول کی صنعت کو قومی بنانے کا بل پاس کرے اور بل پاس کئے جانے کے بعد، جبہہ ملی کے قائد ڈاکٹر مصدق، جو خود شاہ کے زبر دست مخالفوں میں سے شمار ہوتے تھے، کو وزیر اعظم کے طور پر منتخب کرے۔

ڈاکٹر مصدق، جو ایرانی عوام کے قومی اور انگریز مخالف جذبات کے نتیجہ میں وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا، مختلف جہتوں سے شاہ کے لئے دردسر اور پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ مصدق کی قومی پشت پناہی، جو مذہبی قائدین، خاص کر آیت اللہ کاشانی کی حمایت سے وجود میں آئی تھی اس کے لئے ایک بلا مقابلہ طاقت بن چکی تھی اس چیز نے شاہ سے ہر قسم کے مقابلہ کی توانائی اور خودخواہی کے زعم کو چھین لیا اور اسے اس کی سلطنت کے آغاز سے تب تک کی کمزورترین حالت سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ مصدق کی حکومت، جو دو سال سے کچھ زیادہ دیر تک باقی رہی، محمد رضا شاہ کی سلطنت کا بدترین اور شرم آورترین دور شمار ہوتا تھا، مصدق نے عملاً شاہ کے تمام اختیارات چھین لئے تھے۔ جب مصدق نے اپنی زمامداری کے وسط میں، ملک کے وزیر دفاع کے عہدہ کے لئے شاہ کی مخالفت کے بہانے سے استعفی دیا، تو شاہ ۳۰ رتیر ۱۳۳۱ (۲۱ جولائی ۱۹۵۱ء) کو آیت اللہ کاشانی کی قیادت میں ایک عوامی بغاوت سے دوچار ہو گیا اور کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر مصدق کو پھر سے حکومت سنبھالنے کی دعوت دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس دفعہ چونکہ ڈاکٹر مصدق نے مزید اختیارات کے ساتھ زمام حکومت سنبھالی تھی، اس نے فوج اور پولیس کے اختیارات کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا، اس کے بعد شاہ کے بھائی بہنوں حتی شاہ کی ماں کو بھی حکومت کے مسائل میں بے جا اور غیر قانونی مداخلت کرنے کے الزام میں ملک بدر

کروادیا۔شاہ کی جڑواں بہن اشرف کا ملک بدر ہونا،دوسروں کی بہ نسبت زیادہ شاہ کے لئے حوصلہ شکن تھا،کیونکہ اشرف دوسروں کی بہ نسبت زیادہ شاہ پر اثر نفوذ رکھتی تھی اور نازک اور بحرانی حالات میں اس کی ہمت افزائی کرتی تھی۔مصدق نے اشرف کو ملک بدر کر کے اپنے لئے زوال کے مقدمات فراہم کر لئے،کیونکہ یہ متحرک اور حیلہ گر عورت ملک بدر ہونے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھی اور اس کے توسط سے امریکی جاسوسی ایجنسی cia کے ساتھ پہلا رابطہ برقرار ہوا اس رابطہ کے بعد cia نے برطانیہ کی انٹیلیجنس سروس کے تعاون سے مصدق کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ٹھان لی،اس ایجنسی کا''کرمیٹ روزویلٹ''[۱] نامی ایک نامور رکن اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مأمور ہوا۔

قابل ذکر بات ہے کہ مصدق کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں،امریکی تیل کی کمپنیوں کے نفوذ اور ایرانی تیل کے ذخائر سے ایک حصہ ان کو ملنے کی وجہ سے،امریکہ کسی حد تک مصدق کی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا تھا،لیکن جب تیل کے مسئلہ کے سلسلہ میں امریکہ کی ثالثی نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوئی تو امریکی بھی مصدق کی حکومت کے مقابلہ میں آگئے۔بدیہی ہے کہ یہ ثالثی امریکی منافع کے حق میں تھی۔لیکن بظاہر جو چیز مصدق کی حکومت کے ساتھ امریکہ کی مخالفت اور CIA کے اس قضیہ میں مداخلت کا سبب بنی،کمیونسٹوں کے ایران میں پیر جمانے اور اس ملک میں کمیونسٹوں کی کودتا کا بہانہ تھا۔اسی کے ساتھ مصدق کی حکومت کو مزید زوال کی طرف لے جانے کا درحقیقت اصلی سبب تھا اور وہ یہ کہ مصدق کا،اس کا روحانیوں کی حمایت سے محروم ہونا تھا۔یعنی وہی لوگ جو مصدق کے لئے حکومت واقتدار حاصل کرنے میں اہم رول ادا کر چکے تھے،اس کے خودخواہانہ رویہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس سے دور ہو گئے اور اس کی مخالفت پر اُتر آئے۔لوگوں کی سیاسی میدان سے دوری اختیار کرنے کے نتیجہ میں برطانیہ اور امریکہ کی تختہ الٹنے کی سازش آسانی کے ساتھ کامیاب ہوگئی۔

۱۔کتاب''سقوط ناگہانی''تالیف مائیکل لدین۔ویلیام لوئس،نقل شدہ کتاب''اعترافات شاہ مخلوع''میں ترجمہ منوچہر مہرجو،انتشارات ہفتہ ۱۳۶۲ھ ش(۱۹۸۳ء)ص ۷۴-۷۵

امریکہ اور انگلستان ایران کے مسائل پر اس مرحلہ میں مکمل طور پر متفق ہو چکے تھے اور اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جنرل فضل اللہ زاہدی، جو کچھ مدت تک مصدق کی کابینہ کا وزیر داخلہ تھا، کو منتخب کیا اور اس طرح اپنے منصوبہ کے پہلے مرحلہ کو عملی جامہ پہنانے کے طور پر شاہ کو مجبور کیا تا کہ مصدق کو وزارت عظمی کے عہدہ سے معزول کر کے اس کی جگہ پر جنرل زاہدی کو منتخب کرنے کا حکم جاری کرے۔ یہ حکم ایسے حالات میں جاری ہوا، جب ڈاکٹر مصدق نے ایک ریفرنڈم منعقد کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کو منحل کر کے پارلیمنٹ ممبروں سے ہر قسم کی محاذ آرائی کی طاقت کو چھین لیا تھا۔ مصدق نے اپنی معزولی کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس حکم کو سلطنتی گارڈ کے ایک افسر کرنل نصیری (جو بعد میں بادشاہ کی خوفناک خفیہ پولیس کا سربراہ بن گیا تھا) کے ذریعہ راتوں رات حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش سے تعبیر کیا۔ شاہ مصدق کے اس ردعمل سے خوف و وحشت میں پڑ گیا تھا اور اس ڈر سے کہ کہیں مصدق خود شاہ کی گرفتاری کا حکم بھی جاری نہ کر دے، ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن تختہ الٹنے کی سازش کا منصوبہ بنانے والوں نے اس منصوبہ کے دوسرے مرحلہ کو سڑکوں اور گلی کوچوں میں شورس برپا کر کے اور مسلح افواج کے ایک حصہ سے استفادہ کر کے عملی جامہ پہنایا اور اس طرح مذہبی قیادت سے محروم اور عوامی حمایت سے بھی کسی حد تک ہاتھ دھونے کی وجہ سے مصدق کی حکومت کو سرنگون کر دیا گیا۔

مصدق کی حکومت کے گرنے کی خبر جب روم میں شاہ کو پہنچی، تو فراری اور ملک بدر شاہ نے اس واقعہ کے بارے میں خبر رسان ایجنسیوں کی اس خبر پر یقین نہیں کیا۔ جب اس کے لئے یہ قضیہ واضح و روشن ہو گیا، اور پوری طرح سے اس کو یقین ہو گیا تو شاہ نے، جو اس سے پہلے دوبارہ سلطنت کے حصول کا تصور بھی نہیں کر رہا تھا، ایک منظم منصوبہ کے تحت اچانک زبان کھول کر قومی جذبات کو ابھارنے کے لئے وطن پرستی کے اقدام کی صورت میں ایران سے اپنے فرار کی توجیہ کی۔ اس نے تختہ الٹنے والوں کی قدردانی کو فراموش نہیں کیا اور یوں کہا: ''مجھے تاج و تخت آپ سے ملا ہے۔'' روزویلٹ اپنی کتاب میں لفظ ''آپ'' سے شاہ کا مقصود امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں جانتا ہے۔[۱]

جنرل زاہدی نے، جس نے مصدق کی حکومت کے زوال کے بعد شاہ کے حکم سے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا تھا، پہلے اقدام کے طور پر اپنی حکومت کے بارے میں شاہ کو ٹیلیگرام کے ذریعہ خبر دی اور اسے ایران واپس آنے کی دعوت دی۔ مصدق کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا، بعد میں اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور اسے تین سال قید کی سزا سنادی گئی۔ شاہ نے اپنی شرمناک فرار کے بعد کہ جس کی مدت ہفتہ سے کم تھی ایران واپس آ کر برطانیہ اور امریکہ کے توسط سے مصدق کی حکومت کو سرنگون کرنے کو ایک قومی انقلاب سے تعبیر کیا اور اپنے آپ کو لوگوں کا منتخب بادشاہ عنوان سے پیش کیا۔

ایک طاقتور فوجی حکومت کے قیام اور اس حکومت کے ذریعہ تیل کے مسئلہ کو برطانیہ اور امریکہ کے منافع کے مطابق حل کرنے کے بعد ایران میں ایک طولانی سیاسی استحکام کی پیشنگوئی کی گئی تھی اور زاہدی، جس نے اپنے خیال میں شاہ کے تاج و تخت کو نجات دی تھی اور اسے جلا وطنی سے واپس بلایا تھا، یہ تصور کرتا تھا کہ وہ ایک لمبی مدت تک ایران کا وزیر اعظم رہے گا۔ لیکن کمزور اور بدظن شاہ، جو ہر مقتدر وزیر اعظم کو اپنے اور اپنی سلطنت کے لئے خطرہ محسوس کرتا تھا، یہاں تک کہ اپنے نجات دہندہ سے بھی ڈرتا تھا۔

فوجی انقلاب (کودتا) کو ایک سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا، شاہ نے وزیر اعظم کو کمزور کرنے اور اس کی قدرت کو محدود کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان دنوں شاہ نے اپنے لئے ایک نیا سہارا ڈھونڈ لیا تھا: جس منصوبہ کے تحت امریکیوں نے اس کو دوبارہ سلطنت واقتدار کی کرسی پر لانے کے لئے ایک سیاسی کھیل کھیلا تھا، اسی کے تحت وہ روز بروز زیادہ سے زیادہ ان کے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ ۲۸ مرداد (۱۹ اگست) کے فوجی انقلاب کے بعد ایران اور امریکہ کے درمیان (دوسرے الفاظ میں شاہ اور امریکہ کے درمیان) نئے تعلقات کے ایک جدید دور کا آغاز کہا جا سکتا

۱۔ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے رجوع کریں:

Kermit Roosevelt, Counter.coup:the struggle for the control of Iran, Mc Graw Hill co,1979

ہے۔فوجی انقلاب کے بعد دو سال سے کم عرصہ میں شاہ، نے امریکیوں کی موافقت وحمایت کے ضمن میں، زاہدی کو وزارت عظمی کے عہدہ سے ہٹانے کے مقدمات فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ زاہدی کو اچھی تنخواہ اور اختیارات کے ساتھ ایران کے خصوصی سفیر کی حیثیت سے یورپ کے ملک سویزرلینڈ بھیجدیا گیا اور اس طرح شاہ نے اپنے نجات دہندہ کو محترمانہ طور پر ملک بدر کر دیا۔

حقیقت میں محمد رضا شاہ کی مطلق العنان حکومت کا دور، اس کے باپ کی مطلق العنان حکومت کے مانند، اسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ حسین علاء، جو، کچھ مدت تک شاہ کا وزیر دربار اور اس کا مورد اعتماد شخص تھا، کوارد بہشت ۱۳۳۴ھ ش (مئی ۱۹۵۵ء) میں وزیر اعظم بنادیا گیا۔ دو سال کے بعد ڈاکٹر منوچہر اقبال، جو ہر لحاظ سے شاہ کا مطیع اور فرمانبردار تھا اور خود کو ان کا گھریلو غلام سمجھتا تھا، کو حسین علاء کے قائمقام کے طور پر مقرر کر دیا۔ اقبال کی وزارت اعظمیٰ کی مدت میں، جو تقریباً چار سال تک جاری رہی، حکومت مکمل طور پر شاہ کے حکم کے تحت چلتی رہی اور فرمائشی پارلیمنٹ کو کسی طرح کوئی اختیار نہیں تھا۔

۱۳۳۹ ہجری شمسی (۱۹۶۰ء) میں، بین الاقوامی سیاست، خاص کر امریکہ کی عالمی سیاست میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ شاہ بھی اپنی حکومت کے طریقہ کار میں نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوا، اور اپنی آمرانہ حکومت کو بظاہر دنیا پسند روپ بخشنے کے لئے اپنے وزیر اعظم اقبال اور وزیر دربار علم کو ایک دوسرے کی رقابت میں ''ملّیون'' اور ''مردم'' کے نام پر دو سیاسی پارٹیاں تشکیل دینے کا حکم دیا، باوجود اس کے کہ سب جانتے تھے کہ ان دونوں پارٹیوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخاب میں ان دو پارٹیوں کی رقابت اور پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر کے اپنی حکومت کو جاری رکھنے کے لئے اقبال کی کوششوں کی وجہ سے ملک میں ایک بڑا سیاسی بحران پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں شاہ مجبور ہوا کہ وہ انتخابات کو باطل قرار دے۔ اقبال نے وزیر اعظم کے عہدہ سے استعفی دے دیا اور بیسویں نیشنل پارلیمنٹ کا دوسرا انتخاب ۱۳۴۰ھ ش (۱۹۶۱ء) کے اواخر میں عمل میں آیا۔ اس وقت امریکہ میں صدارت کے عہدے پر کنیڈی آیا تھا اور امریکہ کی داخلی اور بین الاقوامی سیاست میں

اچھا خاصا بدلاؤ آچکا تھا۔ امریکی سیاست کے لیبرلزم کی طرف تمائل نے ایران کی نسبت امریکی سیاسی پالیسی پر بھی اثر ڈالا اور امریکی صدر کی شاہ کی نسبت، کہ جس پر ڈیکٹر اور جابر ہونے کا الزام تھا، کسی حد تک ان کے تعلقات میں سرد مہری کا سبب بنی جس کے نتیجہ میں ایران میں شریف امامی کی حکومت کا زوال آ گیا اور اس کی جگہ پر ڈاکٹر علی امینی کو منتخب کیا گیا۔

ڈاکٹر امینی نے اپنے آپ کو امریکہ کی نئی حکومت کے لئے ایک قابل اعتماد فرد کے طور پر معرفی کیا تھا، یہاں تک یہ افواہ گرم ہوئی کہ وہ امریکیوں کی ہدایت اور براہ راست ان کے اثر رسوخ کے نتیجہ میں وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھا۔ اردبہشت ۱۳۴۱ھ ش (مئی ۱۹۶۲ء) میں محمد رضا شاہ کے واشنگٹن کے سفر کے دوران، امریکی صدر کی طرف سے شاہ کے اعزاز میں دی گئی ضیافت کی ایک محفل میں کنیڈی کا ڈاکٹر امینی کو ایک شائستہ اور لائق وزیر اعظم کے طور پر تجلیل کرنا اس افواہ کی مزید تقویت و تائید کا سبب بنی۔ جبکہ ان لفظی حمایتوں کے باوجود امریکی حکومت امینی کی حکومت کی اقتصادی مدد کرنے سے اجتناب کرتی تھی، جس سے اس کی حکومت کے زوال کا وقت قریب آ گیا۔ شاہ نے بیس سال تک سلطنت چلانے کے بعد سیاسی چالوں کو سیکھ لیا تھا، اس نے اسی سفر کے دوران کنیڈی کو اپنے اعتماد میں لانے میں کامیابی حاصل کر لی اور جن منصوبوں کو کنیڈی امینی کے ذریعہ عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ انھیں خود شاہ نے قبول کر لیا۔

شاہ نے امریکہ سے واپسی کے بعد امینی کی پیشرفت کی راہ میں تدریجاً روڑے اٹکانے شروع کر دیئے اور اسی سال مرداد (اگست) میں اسے استفی دینے پر مجبور کر دیا۔

امریکیوں نے جن پروگراموں کی منصوبہ بندی کی تھی اور امینی کی حکومت کو ان پر عمل درآمد کرنے کی ہدایت اور ہمت افزائی کرتے تھے، ان میں سے ایک زرعی اصلاحات کا پروگرام تھا۔ دوسری طرف سے شاہ نے اپنے آپ کو امینی طرز حکومت کی پالیسی سے بچانے کے لئے اور اپنے آپ کو زرعی اصلاحات کا موجد جتلانے کے لئے، امریکی پسند کے کچھ اور پروگرام بھی زرعی اصلاحات میں شامل کر لیئے اور ان پروگراموں کے مجموعہ کو ''انقلاب سفید'' کے عنوان سے ایک نام نہاد ریفرنڈم کے

ذریعہ قوم کی طرف سے منظور کروایا۔

شاہ تصور کرتا تھا کہ ایک مطیع اور قابل اعتماد حکومت کو مقرر کر کے اور ''انقلاب سفید'' کے منصوبہ کو پیش کر کے، اکثر لوگوں کی حمایت خاص کر امریکیوں کی کہ جو، ایران میں پوری طرح نفوذ کر چکے تھے، کی حمایت کو اپنی طرف مبذول کرلیا ہے۔ شاہ اپنے آپ کو اقتدار کے عروج پر اور غیر متنازع حکمران جانتا تھا۔ امریکہ کی طرف سے فوجی ساز وسامان کی افزائش اور عسکری قوت کے استحکام کے بعد شاہ کی مخالف سیاسی طاقتیں اور پارٹیاں ''جبھہ ملی'' سے لیکر حزب تودہ تک سبھی پوری طرح سے ہوا اور بے اثر ہو گئیں تھیں۔ شاہ اپنے آپ کو اس زمانے میں تنہا مرد میدان جانتا تھا اور کسی کو خواب وخاطر میں بھی نہیں لاتا تھا۔ اس تاریخ کے بعد وہ تمام اختیارات اور طاقت کو اپنے کنٹرول میں لے کر ہر لحاظ سے ایک ظالم اور مطلق العنان سلطان بن گیا تھا۔ اس نے امریکہ پر روز افزوں اعتماد کر کے ،خاص کر جانسن اور نکسن کی صدارت کے دوران، جن کے اس کے ساتھ قریبی اور صمیمی روابط تھے ،اپنی حکومت کی بنیادوں کو خوب مستحکم کیا۔[1]

منصور کے قتل کے بعد شاہ نے اس کی کابینہ کے ''ہویدا'' نامی ایک وزیر کو وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے منتخب کیا۔ ہویدا کو اس وقت تک کوئی خاص شہرت حاصل نہیں تھی۔ ہویدا کا وزیر اعظم کے عہدے کے لئے انتخاب سابقہ وزیر اعظم حسن علی منصور کے قتل کا جلد بازی میں ایک ردعمل تھا۔ اور سب جانتے تھے کہ اس کی حکومت پائیدار نہیں ہو گی۔ لیکن شاہ کی اطاعت اور خدمت گزاری میں ہویدا سب سے آگے نکلا اور اسی خصوصیت کی بنا پر بارہ سال سے زیادہ عرصہ تک ایران کے وزیر

۱۔ یہاں پر اس نکتہ کا ذکر ناضروری ہے کہ ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ھ ش (۱۹ اگست ۱۹۵۳ء) کے فوجی انقلاب کے بعد امریکیوں کا روز افزوں اثر و رسوخ اس مغربی بڑی طاقت کے انگریز سامراج کی جانشین کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ انگریزوں کی حکمت عملی میں ایک تبدیلی ہے جس کے تحت وہ براہ راست سیاسی میدان میں نہیں آنا چاہتے تھے کیونکہ پہلوی حکومت کے تقریباً پورے دور میں حکومت کا سسٹم اور حکمرانی میں تقریباً کوئی تبدیلی نہیں آئی اور یہ صورت حال اس نظام کے ۲۲ بہمن ۱۳۵۷ھ (۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) کو سرنگون ہونے تک باقی رہی یہ سیاسی ڈھانچہ عمدہ طور پر برطانیہ اور فراماسونری سسٹم کے زیر تسلط تھا اور وہ اس کی حکومت کے منافع کے محافظ تھے اور امریکی حکومت کبھی اس سسٹم میں نفوذ کر کے اسے تسخیر نہ کر سکی۔ بلکہ اس ڈھانچہ پر تکیہ کرنے میں مجبور ہوئی اور برطانیہ کی حکومت سے توافق کر کے ایران میں اپنا کام چلاتی رہی ۔اس سلسلہ میں مزید تفصیلات حاصل کرنے کے لئے مصنف کی کتاب ''پہلوی حکومت کی عالمی سیاست پر ایک نظر'' کا مطالعہ فرمائیں۔

اعظم کے عہدہ پر فائز رہا۔ یہ ایران کی معاصر تاریخ میں ایک وزیر اعظم کا طولانی ترین دور شمار ہوتا ہے۔ اس دور کو شاہ کے مطلقہ اقتدار کے عروج کا دور کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اس دور میں حکومت پوری طرح مطیع، پارلیمنٹ بے اختیار اور مطبوعات واخبارات سنسر اور حکومت کے دباؤ میں ہوتے تھے۔ ساواک، یعنی شاہ کی خفیہ پولیس ہر قسم کی مخالف تحریک کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتی تھی حکومت کی مخالفت کرنے کی بات تو بہت دور تھی، معمولی سی تنقید کرنے کی بھی کسی میں جرأت نہیں ہوتی تھی۔

اس دوران میں کچھ واقعات یا تبدیلیوں کا رونما ہونا، جنھیں اتفاقات کا نتیجہ یا بین الاقوامی حالات کا سازگار ہونا سمجھا جاسکتا ہے، شاہ کی قدرت، ثروت اور غرور میں اضافہ ہونے کا سبب بنا اور رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں یہ فکر تقویت پانے لگی کہ وہ ایک غیر معمولی مخلوق ہے اور زمین پر ایک رسالت انجام دینے کے لئے مامور ہوا ہے۔ اس مدت کے دوران شاہ پر ایک بار پھر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ بال بال بچ گیا۔ چونکہ وہ اس قاتلانہ حملہ میں نجات پانے کو ایک قسم کا معجزہ اور خدا کی خاص عنایت سے تعبیر کرتا تھا، اس سے اس کا یہ اعتقاد مزید مستحکم ہونے لگا کہ وہ زمین پر ایک رسالت کی انجام دہی کے لئے مامور ہوا ہے۔ شاہ اپنے ان عقائد کو مذہبی رنگ بھی دیتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عقائد لوگوں کے لئے بھی قابل فہم وہضم تھے اور اسی کے ساتھ وہ رفتہ رفتہ لوگوں کی مذہبی قیادت بھی خود سنبھالنا چاہتا تھا، جبکہ وہ ہرگز ایک حقیقی مسلمان نہیں تھا اور ان فرائض کو انجام نہیں دیتا تھا، جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہیں[۱]!

خدا کے بارے میں شاہ کے عقائد، کہ جنھیں وہ مذہبی عقائد کے عنوان سے ظاہر کرتا تھا، کا دراصل سرچشمہ ایران کے وہ قدیم ادیان تھے جو اسلام سے پہلے تھے اور ایران کے قدیم رسم ورسومات کو پھر سے زندہ کرنے کا اس میں اس قدر شوق تھا کہ اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے مربوط ایران کے سرکاری کلنڈر کو تبدیل کر کے توہمات پر مبنی بادشاہ کورش ہخامنشی کی تاج پوشی کی تاریخ

۱۔ سابق لیفٹنٹ جنرل حسین فردوست کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''ظہور وسقوط سلطنت پہلوی'' ج۱، انتشارات اطلاعات طبع دوم، ۱۹۸۹ء (۱۳۶۸ھ ش)

پر مبنی کلنڈر کو رائج کیا۔

ایران کی تاریخ کو اسلام سے قبل قدیمی دور سے منسلک کرنے کے لئے جو ایران میں بادشاہی نظام کی ڈھائی سو سالہ تاج پوشی کی پرانی رسم تھی، اس کی سالگرہ نہایت باشکوہ اور پرخرچ طریقہ سے منائی گئی، وہ شاہ کے اس طرز تفکر کی مظہر تھی۔ اس جشن میں، جسے اس وقت کا عظیم جشن نام دیا گیا ہے۔ نو بادشاہوں، پانچ ملکہ، اکیس شاہزادوں اور مختلف ممالک کے صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظموں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور اس جشن کو منعقد کرنے کے لئے تخت جمشید کے قریب بے تحاشا قومی سرمایہ خرچ کر کے ایک مزیّن شہر تعمیر کیا گیا۔ اس جشن کو منعقد کرنے کے دوران ،شاہ اپنے آپ کو اقتدار کے عروج اور لاثانی سلطان تصور کرتا تھا، جبکہ یہ جشن سلطنتی نظام کے زوال کا آغاز ثابت ہوا، کیونکہ بظاہر اس پرشکوہ اور عظیم شہنشاہی جشن کا اکثر لوگوں کی غربت اور بدبختی سے تضاد، مخالفین نظام کے لئے پروپیگنڈا کا ایک حربہ بن گیا۔

کسی صحیح اور دور اندیشی پر مبنی اقتصادی پروگرام کے بغیر پٹرول کی آمدنی میں اچانک اضافہ نے بظاہر ملک میں ایک فوری ترقی کی لہر تو پیدا ہوگئی، لیکن نکسن پلان۔[۱] کے تحت بڑے فوجی پروجیکٹوں پر عمل درآمد کرنا اور بڑے بڑے فوجی اسلحہ خریدنا اور دوسرے تمام بلند پرواز، جاہ طلب اور بے فائدہ منصوبے ملک میں گراں بازاری اور فساد پھیلنے کا سبب بنے اور اس طرح گونا گوں مشکلات اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے۔

فوج کو تقویت دینے اور امریکہ کے ایران کو اسلحہ بیچنے کی سیاست نے ملک کے اجتماعی واقتصادی حالات کو وسیع پیمانے پر متاثر کرنے کے علاوہ ایرانی معاشرہ کے طبیعی نظم ونسق کو درہم برہم کر کے رکھدیا۔ خاص کر شاہ کو پیچیدہ فوجی اسلحہ خریدنے کی کھلی ڈھیل نے شاہ کے نفسیات پر عمیق

۱۔ ویتنام میں امریکہ کی شرمناک شکست کے بعد ''نکسن پلان'' پیش کیا گیا۔ اس پلان کے مطابق کسی شورش زدہ علاقہ میں امریکی فوج بھیجنے کے بجائے یہ طے پایا کہ شاہ جیسی کٹھ پتلی حکومتوں سے استفادہ کیا جائے اور اس قسم کی حکومتوں کو فوجی ساز وسامان سے مسلح کر کے امریکہ کے منافع کی حفاظت کی ذمہ داری بھی انھیں سونپ دی جائے۔

اور بنیادی اثر ڈالا۔ رفتہ رفتہ شاہ یہ باور کرنے لگا کہ وہ امریکہ یا برطانیہ کے ماتحت نہیں ہے بلکہ ان کا شریک اور معاون ہے۔ یہ تصور ایک طویل مدت تک شاہ کے دل و دماغ پر چھایا رہا اور کبھی اس حد تک تصور کرتا تھا کہ اس شراکت میں اس کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ اپنے آپ کو مغرب کا حامی اور ان کے منافع کا ضامن سمجھتا تھا اور یہ امر اس میں جھوٹی خود اعتمادی پیدا ہونے کا سبب بنا اور اپنے آپ کو عظیم سمجھنے کا تصور اس میں بڑھنے لگا!

اس مدت کے دوران، شاہ اور اس کے حامی دکھاوے کے کاموں میں سرگرم تھے۔ طاقت، حکومت کے امور اور حساس وکلیدی عہدے، خاص گروہوں، من جملہ فراماسونری نیٹ ورک بہائی افراد، کہ جو ایک ہزار قبیلوں اور رشتہ داروں پر مشتمل تھے، کو سونپے گئے۔ یہ عہدے اور منصب استعداد وقابلیت کے بجائے روابط اور تعلقات کی بنا پر افراد کو دئے جاتے تھے۔ بعض اوقات نئے چہرے بھی اس دائرہ میں داخل ہوتے تھے، لیکن ان، اہم عہدوں پر فائز ہونا ان کی صلاحیت کے بجائے صاحب اقتدار اشخاص سے ان کے روابط پر منحصر ہوتا تھا۔

ایک تنہا مرد

جس قدر شاہ کی سلطنت کی مدت بڑھتی جاتی تھی وہ متشدّد اور بے رحمی کا خوگر ہوتا جارہا تھا اور سلطنت میں رفتہ رفتہ اپنے باپ کے طریقہ کار کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ نہ اس کے باپ کے زمانہ کے حالات اس کے دور کے مطابق تھے اور نہ مسائل ومشکلات سے مقابلہ کرنے کی اس میں اپنے باپ رضا خان کی جیسی جرأت اور توانائی موجود تھی۔ وہ صرف عام شرائط اور حالات کے اس کی مرضی کے مطابق ہونے کی صورت میں اپنی قدرت کا مظاہرہ کرسکتا تھا، یعنی جو کام ہر کوئی انجام دے سکتا ہے۔ لیکن ہنگامی حالات، شورش اور خطرات کے مقابلہ میں وہ خود اعتمادی کو کھو کر تنہا کوئی فیصلہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ یہی خود اعتمادی کا فقدان اور اور اس طرح کا خوف کہ کوئی اسے اقتدار سے الگ

ا۔ محمد رضا شاہ کی شخصیت اور نفسیاتی خصوصیات کو جاننے کے لئے ہاردین زونیس کی کتاب ''شکست شاہانہ، روانشناسی شخصیت شاہ'' ترجمہ عباس مخبر، انتشارات طرح نو ۱۳۷۰ھ ش (۱۹۹۱ء) ملاحظ ہو۔

نہ کردے اس بات کا سبب بنا کہ وہ وزرات عظمی اور نظام کے اہم عہدوں پر طاقتور افراد کو انتخاب کرنے سے پرہیز کرتا تھا، یہاں تک آخری برسوں میں اس کی سلطنت کے تمام لائق اور بااثر افراد اس سے دور ہو گئے تھے اور اس کے حامیوں اور مشاوروں کا دائرہ چند مطیع اور لالچی افراد تک محدود ہو کر رہ گیا تھا جو شاہ کی خوشنودی اور اپنے منافع کے تحفظ کے علاوہ کچھ نہیں سوچتے تھے۔

مجموعی طور پر شاہ نے جس طریقہ کار کو اپنی سلطنت کے لئے انتخاب کیا تھا اس نے اسے عملی طور پر معاشرہ سے کاٹ کر چند مطیع ،لالچی یا ضعیف و بزدل افراد کے دائرے میں محصور کر کے رکھدیا۔ایران میں ،امریکہ کے ایک سفیر ''رچرڈ ہلمز'' نے شاہ کی سلطنت کے اس دور کے آغاز میں اس کی شخصیت اور ذہنیت کے بارے میں ایک دلچسپ خاکہ کھینچا ہے اور اپنی ایک سرکاری رپورٹ میں یوں لکھا ہے:

''یوں تو ممالک کے تمام رہبر تنہا ہوتے ہیں ،لیکن شاہ ان میں تنہا ترین فرد ہے،اس کی حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر،اچھے اور سچے مشاوروں کا فقدان ہے۔اس طرح الگ تھلگ ہونے کا سبب کسی حد تک شاہ کے ذاتی اخلاقیات اور دوسروں کے جاہ طلبانہ مقاصد کی نسبت اس کی بدظنی سے بھی مربوط ہے۔شاہ کے گزشتہ تجربوں کی وجہ سے تقویت پانے والی یہ بدگمانیاں لائق اور بااثر افراد کے اس سے دور ہونے کا سبب بنیں۔اگر شاہ کے حامیوں میں سے کوئی لائق اور باصلاحیت شخص مل بھی گیا تو وہ ایرانیوں کی عادت اور رسم کے مطابق شاہ کو پسند نہ آنے والے بیان سے اپنے کو دور رکھتا تھا۔مختصر یہ کہ شاہ مغرور اور خود پرست ہوتے ہوئے بھی اندر سے کھوکھلا ہے۔''

انقلاب کے دوران شاہ کی سرنگونی میں مدد کرنے والے اہم عوامل میں سے اس کا دوسروں کے بارے میں سلب اعتماد اور حکومت کے پورے سسٹم اور مسلح افواج کو اپنی ذات سے وابستہ رکھنے کے لئے بہت جزئی امور میں اسکی مداخلت تھی۔شاہ نے کئی جاسوسی اداروں کو ایجاد کر کے،حکومت اور مسلح افواج کے محکموں کو کئی جہت سے اپنے کنٹرول میں رکھا تھا،اگر چہ یہ افواہ تھی کہ،ان آرگنائزیشنوں

کے سرپرست آپس میں ھماھنگی کر کے ہی رپورٹ مرتب کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ایران کے مسلح افواج کے نظام میں کوئی طاقت براہ راست کسی قسم کا کام انجام نہیں دے سکتی تھی۔ شاہ، فوجی کمانڈروں کو الگ سے اپنے پاس بلاتا تھا، کنٹرول کرنے کے لئے قائم کئے گئے سسٹم کے مطابق ہر فوجی کاروائی کے نفاذ کے لئے کئی راہوں سے عبور کرنا ضروری تھا۔ فوجی کمانڈر، بلکہ ایک لشکر کی مختلف بٹالین کے کمانڈروں کی بھی آپس میں ہم آہنگی نہیں تھی، بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ مسلح افواج کی وحدت و یکجہتی کا دارومدار شاہ کی ذات سے مربوط تھا، یہی وجہ ہے کہ شاہ کے ملک سے چلے جانے کے بعد فوج ایک دم سے تتر بتر ہوئی۔

تحقیق کے خلاصہ کے طور پر ایران میں برسر اقتدار سیاسی طاقت، جو ایک معاشرہ میں دو قطبی سیاست کی واضح مثال ہے، میں انقلاب رونما ہونے والے نا قابل انکار سیاسی، اجتماعی تبدیلیوں کے عوامل، حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایران کے سیاسی اقتدار کی مہار مکمل طور پر ایک خود پرست خودسر کمزور بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے حامی فیصلوں میں کوئی خاص مداخلت نہیں کرتے تھے اور وہ نالائق اور مطیع افراد تھے۔

۲۔ حکومت کا ایک مسلح، تربیت یافتہ اور وفادار فوج پر بھروسہ تھا۔ ایک ایسی فوج جس کے کمانڈر شاہ کے مکمل مطیع اور فرمانبردار تھے اور ان کی وفاداری کی دلیل صرف ان کی آسائش اور حد سے زیادہ ان کا رفاہ تھا۔ البتہ اس فوج نے میدان کارزار میں کوئی امتحان نہیں دیا تھا تاکہ شاہ کی سیاسی طاقت کے دفاع میں ان کی وفاداری کا اندازہ لگایا جاسکتا۔

۳۔ ساواک کا خوفناک جاسوسی ادارہ قتل و غارت اور جسمانی اذیت و آزار کے ذریعہ ہر قسم کی مخالف آواز کو دباتا تھا۔

۴۔ اس حکومت کا بھروسہ غیر ملکی طاقتوں، خاص کر برطانیہ اور امریکہ پر تھا۔ برطانیہ اور اس کے بعد امریکہ کا حکومت کے اداروں حتی خفیہ پولیس میں نا قابل انکار حد تک اثر رسوخ بڑھ گیا تھا۔ دوسری جانب سے شاہ اپنے تاج و تخت انھیں کی مرہون منت سمجھتا تھا اور اس کی بقا کو بھی ان کی حمایت سے

وابستہ جانتا تھا۔

۵۔ حکومت کے اداروں میں فساد اور رشوت ستانی کا بول بالا تھا اور بیورو کریسی نے روزمرہ امور کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی طاقت ان سے چھین لی تھی۔

۶۔ اگرچہ پٹرول کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے حکومت کی اقتصادی طاقت میں بظاہر نمایاں ترقی پیدا ہوگئی تھی، لیکن صحیح ترقیاتی منصوبے اور اقتصادی پروگراموں کے فقدان کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی اور ناراضگی حد درجہ بڑھ چکی تھی۔

۷۔ سیاسی طاقت لوگوں اور معاشرے کے اکثر گروہوں سے مکمل طور پر الگ تھلگ ہو کر رہ گئی تھی اور لوگوں کی حمایت کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی جاتی تھی۔ شاہ کی صرف یہ خواہش تھی کہ لوگ حکومت کی مخالفت نہ کریں اور اس کی یہ خواہش بھی لوگوں کو تشدّد اور جسمانی اذیت و آزار دیکر حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

۸۔ حکام کی نا اھلی اور فیصلہ کے غلط سسٹم کی وجہ سے کہ، جو عام طور سے ایک فرد سے مختص تھا، کے پیش نظر، سیاسی نظام پوری طرح معاشرہ کے سادہ ترین اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں عاجز اور ناتوان تھا۔

۹۔ شاہی نظام کو بچانے کے لئے ، زیادہ تر پروپیگنڈا ، سٹیج ، ظاہر داری تحفظ ، ملک کے اندر اور باہر دولت کا بے تحاشا وبیجا مصرف نیز جشن وتقریبات جیسے امور کا سہارا لیا جاتا تھا۔

۱۰۔ اقدار معاشرہ، رسم ورواج اور عقائد، کہ جن کی جڑیں مذہب میں پیوست تھیں، کی طرف نہ صرف بے اعتنائی برتی جاتی تھی بلکہ مختلف طریقوں اور ذرائع سے ان کو نابود کر کے ان کی جگہ غیروں کے اقدار نیز رسم ورواج کو مسلّط کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر اجتماعی دھڑے اور عوام، سیاسی سسٹم سے مأیوس اور نا اُمید ہو گئے اور مذہبی قائدین کے گرد جمع ہو کر ایک طاقتور اجتماعی اقتدار کو وجود میں لانے کی کوشش کی اور ایک مختصر مدت کے اندر سیاسی نظام کو سرنگون کرنے کے اسباب فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسری گفتگو:

سماجی طاقت

جیسا کہ پہلی فصل میں بیان ہوا، کہ اجتماعی قدرت کا سرچشمہ ان لوگوں کا ارادہ ہوتا ہے جو ایک سرزمین میں مشترک اقدار اور منافع کی بنیادوں پر زندگی گزارتے ہیں کوئی بھی معاشرہ مشترک اقدار کے بغیر تشکیل نہیں پاسکتا ہے اور نہ قائم رہ سکتا ہے اگر تشکیل بھی پاجائے تو پائدار نہیں ہوتا بلکہ بڑی تیزی کے ساتھ پراگندہ ہوجاتا ہے۔ مشترک اقدار مادی یا معنوی ابعاد میں ہوسکتی ہیں، لیکن جو معاشرہ قہری یا فطری طور پر صرف مادی اقدار اور منافع کی بنیاد پر تشکیل پایا ہو، وہ نہ صرف ضروری ربط نہیں رکھتا ہے بلکہ احتمالی خطری کے مقابلہ میں مطلوب اجتماعی دفاع کی طاقت سے بھی محروم ہوتا ہے۔

ایران کی سرزمین میں، جو جغرافیائی حالات کے پیش نظر ایک حساس اور سوق الجیشی علاقہ ہے ،قدیم زمانہ سے ایسے لوگ زندگی بسر کررہے ہیں اور مختلف قبائل اور قوموں کی طرف سے اکثر حملوں اور غارت کے نشانہ بنے ہیں۔

اسکندر مقدونی، مسلمان اعراب، چنگیز خان مغل، تیمور خان گورکانی اور ترکان سلجوقی وغیرہ جیسے قبیلوں اور قوموں نے ایران پر حملے کر کے حکومت کی ہے۔ جذب ہوئے ہیں اور یا نکال باہر کئے گئے ہیں۔

ایرانیوں نے ان حوادث اور روابط کے نتیجہ میں تاریخی عوامل کے اقتضا کے مطابق مختلف قوموں اور ملتوں سے آشنائی پائی اور ان کے ساتھ کبھی دوستانہ اور کبھی مخاصمانہ روابط پیدا کئے۔ یہ روابط اور تعلقات اس امر کا سبب بنا کہ ایرانی ان کے بعض افکار اور رسومات کو قبول کریں اور انھیں اپنی آنے والی نسلوں میں منتقل کریں اور اس کے مقابلہ میں بہت سی اپنی رسومات کو دوسرے اقوام میں منتقل کریں۔ ایرانی وطن دوستی اور اقدار کے خواہاں تھے اور اپنی ثقافتی ہویت کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے دوسری قوموں میں ضم نہیں ہو پائے ،لیکن ان کی یہ دلچسپی اور محبت ہرگز اندھی تقلید پر مبنی

نہیں تھی جو حقائق کو درک اور قبول کرنے میں مانع ہو اور ان کی ثقافتی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی، بلکہ ایرانیوں نے دوسرے اقوام سے ثقافتی میل جول کے نتیجہ میں اپنے معاشرے کی تہذیب و تمدن کو مالا مال کیا اور اسے مثمر ثمر بنایا۔

ہخامنشیان کی حکومت کے آغاز سے، جس میں ایران ایک حکومت اور فرمانروائی کے تحت قرار پایا، آج تک پچیس صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس مدت کے دوران ایرانیوں کا اہم ترین اور عظیم ترین ثقافتی میل جول چودہ صدی پہلے، تازہ وجود میں آئے اسلامی مکتب اور تمدن کے ساتھ وجود میں آیا جو پورے مشرق وسطی میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی اور انقلاب کا سبب بنا۔ اسلام نہ صرف ایرانیوں کے لئے بلکہ عربوں کے لئے بھی ایک جدید مظہر تھا اور یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی تہذیب میں مکتب اسلام کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کی وجہ سے عربی تمدن کے ایک حصہ کے عنوان سے تبدیلی آئی ہے بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات جس قدر ایرانیوں کے لئے تازہ تھیں اور نئی اقدار لے کر آئی تھیں، عربوں کے لئے بھی اس قدر تازہ تھیں۔

بنیادی طور پر اسلام کی پیدائش سے پہلے عربوں کے پاس ان کے زمانہ کے مہذب اور ترقی یافتہ معاشروں جیسے ایران و روم کو پیش کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی، اور خانہ بدوش اور صحرا نشین عرب جو ابتدائی ترین طریقہ پر زندگی بسر کرتے تھے، ایک نمایاں تمدن کے بانی نہیں ہو سکتے تھے۔

حقیقت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی اقدار سے مالا مال اسلام کا آسمانی والہی مکتب تازہ مسلمان عربوں کے ایران پر حملہ اور ایرانیوں سے روابط پیدا کرنے کے نتیجہ میں، ان میں منتقل ہوا۔

بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار اور طاقت کے بل پر دوسری قوموں، من جملہ ایرانیوں پر غالب آیا ہے، اس کی کوئی تاریخی بنیاد اور حقیقت نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایرانی ہر زمانہ میں ظالم اور جابر حکام سے تنگ آکر بے کس ولاچار ہوئے ہیں، انھیں اجنبیوں کے حملوں اور تمام مصیبتوں کے سامنے تنہا چھوڑا گیا ہے اور ان کے ساتھ تعاون نہ کرنے کی وجہ سے ان کی شکست و ناکامی کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں۔ ساسانیوں کی حکومت کے اواخر میں بھی، ایران پر حکمران

طبقہ کے ناگفتہ بہ سیاسی، اجتماعی حالات، زرتشی پیشواؤں کی طرف سے حمایت ہونے والے ڈکٹیٹروں کے درباریوں کی بدکاریوں اور لوگوں کی غربت اور بدبختی نے، مشیت و امداد الٰہی پر ایمان و عقیدہ رکھنے والے شہادت و قربانی کے لئے آمادہ مسلمان سپاہیوں کے مقابلہ میں، ایرانی فوج کی شکست کے لئے مناسب حالات پیدا کئے۔

ایرانیوں نے اسلام کو دل و جان سے گلے لگایا اور یہ استقبال اس حد تک تھا کہ آج عربستان کے علاوہ کسی بھی ملک میں ایران کے برابر مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے[۱]!

اس استقبال کا سبب ایرانیوں کا اسلام کے تئیں مناسب جذبات تھے، انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی چیز کو اسلام میں پایا[۲]

یہ لوگ فطری طور پر عقلمند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم تہذیب و تمدن کے مالک بھی تھے، اسلامی لشکر کی طاقت کے سامنے تسلیم اور مرعوب ہونے سے پہلے اسلام کی روح اور معنویت پر توجہ رکھتے تھے، اسی لئے وہ خاندان نبوّت کے ساتھ دوسری قوموں سے زیادہ والہانہ محبت رکھتے ہیں۔لہذا انہوں نے اسلام کے مختلف مذاہب میں سے شیعہ مذہب کا انتخاب کیا اور عام طور پر فقہ جعفری کی پیروی کی۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام کی پیروی نے ایرانیوں میں جڑ پکڑ لیا ہے، کیونکہ انہوں نے اسلام کی روح کو خاندان رسالت میں پا کر انھیں اپنے سوالات اور واقعی ضرورتوں کا جواب گو پایا ہے۔لیکن ایرانی، اسلام کو قبول کرنے کے باوجود سیاسی اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عربوں سے مغلوب نہیں ہوئے اور اپنی تہذیب و تمدن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس کا تحفّظ کیا۔ ایرانیوں نے مصریوں کے برعکس، کہ جنھوں نے اسلام کے ساتھ عربی زبان کو بھی قبول کیا، اپنی قومی زبان کا تحفّظ

۱۔ایران میں ۹۸ فیصدی مسلمان آبادی ہے اور ۹۰ فیصدی شیعہ مذہب کے پیرو ہیں۔

۲۔اس بحث کی تفصیل استاد آیت اللہ شہید مرتضی مطہری کی مایہ ناز کتاب ''خدمات متقابل ایران و اسلام'' کے حصّہ ''ایرانیوں کا اسلام قبول کرنا'' میں بیان ہوئی ہے۔

کیا اور عربی زبان سے استفادہ کر کے، فارسی زبان کو مالا مال کیا تو اس طرح فارسی زبان محفوظ رہی۔

ایرانیوں نے عباسی حکومت کے اواخر میں خلفائے عرب کہ، جو اسلام کے نام پر حکومت کر رہے تھے لیکن اسلام کی واقعی تعلیمات کے برخلاف عمل کیا اور وہ اُس سے کوسوں دور تھے، کے تسلط سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور اُن سے نبرد آزما ہوئے۔ اور اس کی اجازت نہیں دی کہ اعراب اپنی قوم پرستی پر مبنی رسومات کے تحت اسلام کے نام پر ایرانیوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کریں۔ اس چودہ صدیوں کی طولانی مدت کے دوران ایرانیوں نے اسلام کو قبول کر کے اسے اپنی آغوش میں لے لیا، یہ دین مبین، ان کی زندگی میں نفوذ پیدا کر کے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا حصہ بن گیا۔ انہوں نے اسلام کے آداب و رسوم میں پرورش پائی، زندگی بسر کی، خاندان کی تشکیل کی، اپنے فرزندوں کی تربیت کی اور انفرادی و اجتماعی روابط کو برقرار کیا اور اپنے مردوں کو دفن کیا۔ تاریخ، ادبیات، عدلیہ، تہذیب و تمدن، اجتماعی رسومات بالاخر ان کی ہر چیز اس دین کے ساتھ اس طرح منسلک ہوئی کہ اسلام کی لاینفک اقدار ان کے معاشرہ کے اکثر اور اصلی حصہ پر مسلط ہوئیں۔ قابل ذکر بات ہے کہ ایرانیوں نے بھی اس کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب و تمدن کے پھیلاؤ، رشد و ارتقاء اور اس کی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں قابل قدر خدمات انجام دیں[۱]!

ایران کے مختلف قبیلوں اور اجتماعی گروہوں کے درمیان قومی اتحاد و یکجہتی کا اہم ترین بلکہ تنہا عامل اسلامی اقدار کا ان میں اثر و نفوذ تھا۔

مغربی اصطلاح کی ''قومیت'' ایسے لوگوں میں اتحاد و یکجہتی کا سبب نہیں بن سکتی ہے جن کی زبانیں لہجے، نسلی بنیادیں اور قومیتیں، فارس، کرد، ترک، عرب، ترکمن اور بلوچ کے مانند مختلف ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے بارے میں ایرانیوں کے خدا سے صرف رابطہ کو ایک عامل کے طور پر

۱۔ حقیقت میں اگر اس ملت کے تقریباً متفقہ مشترک رسم و رواج اور مذہبی عقائد کو نظر انداز کیا جائے تو ان کو قریب لانے کا کوئی دوسرا اہم مشترک عامل نہیں پایا جا سکتا ہے۔

بحث نہیں کی جاسکتی ہے، بلکہ اس عامل نے ان کے تہذیب وتمدن، زبان اور ان کے اجتماعی تعلقات کو اس طرح متاثر کیا ہے، کہ ان کے مذہب اور اس کی خصوصیت کی معرفت حاصل کئے بغیر ایرانیوں کے عمومی تہذیب وتمدن کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسی لئے ان کے اکثر اجتماعی طبقات کی پسندیدہ اقدار ان کے مذہبی عقائد سے وجود میں آتی ہیں۔ ہم بعد میں اس کے بارے میں بیان کریں گے کہ انقلاب رونما ہونے اور شاہ کی حکومت کے زوال کا اصلی سبب شاہ کے توسط سے ایرانی ملت کی اُن دیرینہ اجتماعی اقدار سے چشم پوشی کر کے انھیں پامال کرنا تھا، جن کا سرچشمہ مذہب تھا۔

چونکہ مذہب اہم ترین ثقافتی عوامل میں شمار ہوتا ہے اس لئے یہی عامل ایرانیوں کو ملک کے آخری حصہ تک شہروں اور دیہات میں معاشرہ کے مختلف قوموں اور قبیلوں کو غریب، امیر، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ سے آپس میں اتحاد پیدا کیا۔ ایرانیوں کے اجتماعی تعلقات میں مذہب کے عمیق اثر ورسوخ اور جڑ پکڑنے کے پیش نظر مذہبی احکام اور عبادتوں کی زیادہ پابندی نہ کرنے والے افراد بھی ،اعیاد اور عزاداری جیسے مذہبی رسومات کے پابند ہوتے ہیں۔

مذکورہ وضاحت کے پیش نظر وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی معاشرے کی اجتماعی طاقت ان کے مذہب میں پوشیدہ ہے اور مذہبی اقدار اور معیاروں سے عاری کوئی بھی تحریک سیاسی اور اجتماعی مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ایران کی سرزمین اور ملت کی قدیمی اور طولانی تاریخ کی ورق گردانی کریں بلکہ ہم اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ، ایران کے لوگوں کے حوادث اور واقعات سے بھری کئی ہزار سالہ تاریخ نے اپنی نازک اور حساس موقعیتوں اور جنگوں اور متعدد کشمکشوں کے نتیجہ میں صابر و بردبار، ثابت قدم اور دوراندیش بناڈالا۔ کہ جس۔ نے اپنی انھیں خصوصیات کے پیش نظر تاریخ کے خطرناک حوادث اور نشیب وفراز کے مقابلہ میں اپنے وجود کا تحفظ کرتے ہوئے ترقی کی ہے۔

گزشتہ آخری دوصدیوں کے دوران یورپیوں کی طرف سے ثقافتی، سیاسی اور فوجی یلغار کے

نتیجہ میں، پوری دنیائے اسلام اور مشرق وسطی میں ایسے حوادث اور نشیب وفراز رونما ہوئے ہیں، جن کا انعکاس اور اثر ایران میں بھی وسیع پیمانے پر محسوس کیا گیا۔

قدرتمند اسلامی حکومتوں کے تدریجی زوال نے مغربی سامراج کے لئے اثر ونفوذ کا موقع فراہم کیا اور یہ امر اسلامی ملکوں کے لئے پھر سے اپنے مخالف تمدن سے ٹکراؤ کا سبب بنا۔ ''آرنالڈ ٹوین بی'' کے بقول کہ اسلامی تمدن اپنے دفاع میں لگا ہوا تھا اور مغربی تمدن اپنے احیاء اور بیداری کے ساتھ ساتھ حملہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے جس کے نتیجہ میں آپس میں ٹکراؤ ہوا۔ آخرکار یہ مقابلہ اور ٹکراؤ اسلامی معاشروں کی کمزوری اور ان کی اپنے آپ سے بے خبری اور مغربی معاشرہ کی ثقافتی و سیاسی برتری پر ختم ہوا۔

یہ امر ایرانیوں کی ذہنیت پر بھی اثر انداز ہوا۔ معاشرہ کا ایک عظیم حصہ بالخصوص غریب اور محروم شہری اور دیہاتی طبقے جو اپنے عقائد اور مذہبی رسم ورواج کے پابند تھے، نے جب اپنے عقائد کے بارے میں خطرہ محسوس کیا، تو اپنے آپ کو، سیاسی، اجتماعی سرگرمیوں سے دور کرلیا اور خاص مذہبی مسائل جیسے تقیہ کا سہارا لے کر کنارہ کشی اختیار کرلی اور اس طرح اجتماعی مسائل اور حوادث کے مقابلہ میں لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔ معاشرہ کے لوگوں کا ایک چھوٹا گروہ، جو تعلیم یافتہ اور آگاہ تھا، معاشرہ پر گزرنے والے ان حوادث کے مقابلہ میں لاپروا نہیں رہ سکتا تھا، خاص کر یورپ میں تعلیم حاصل کرنے والے، مغربی معاشروں کی علمی اور صنعتی ترقی اور ان کے مادی چمک دمک کا مشاہدہ کرکے اس کے دل دادہ ہوگئے، اور اپنی ثقافتی ومذہبی اقدار کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے نئے معیاروں پر اپنے معاشرے کی تعمیر اور اپنی قوم اور اسلامی معاشرہ کی پسماندگی کو دور کرنے میں لگ گئے۔ یہ لوگ بھی دو حصوں میں تقسیم ہوئے: پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ لیبرلزم اور فرانس کے انقلاب سے متاثر ہوئے تھے اور مکمل طور پر مغربی معاشرہ کی پیروی کرنے کے معتقد تھے۔ اس نظریہ کے سرکردہ لوگوں میں سے تقی زادہ تھا۔ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ سر سے پیر تک مغربی ہونا چاہئے تاکہ مغربی معاشروں کو حاصل ہوئی خوشبختی، آرام وآسائش اور ترقی تک رسائی ہوجائے۔ یہ گروہ خاص کر دولتمند اور خوشحال

طبقہ پر مشتمل تھا اور مغربی معاشروں سے ان کے روابط نے خاص کر ان کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک میں بھیجنا آسان بنایا۔ دوسری جانب سے یہ گروہ لیبرل لزم کو اپنی ذہنیت اور مزاج کے موافق سمجھتا تھا۔

دوسرا گروہ بھی عام طور پر روشن فکر اور جذباتی جوانوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ معاشرے میں حکام کی طرف سے ہونے والی بے انصافیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ان لوگوں نے حالیہ صدی کے اواخر میں خاص کر ۱۹۱۷ء میں رونما ہونے والے روسی انقلاب کے بعد اپنے شمالی ہمسایوں سے رابطہ برقرار کرنے کے نتیجہ میں مارکسیسٹ، لیننسٹ نظریہ سے متاثر ہو کر ایران میں اشتراکی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ یہ لوگ اسلامی معاشرہ پر مسلط اقدار، خاص کر مذہبی معیاروں سے انکار کر کے انھیں خرافات جانتے تھے اور روس میں رونما ہوئے اشتراکی معاشرہ کے مانند ایک معاشرہ کو وجود میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے کارل مارکس کے الحادی مادیت سے متاثر افکار کی تبلیغ کرتے تھے۔

ان کے مقابلہ میں ایک اور گروہ جو اکثر روحانیوں اور علماء پر مشتمل تھا وہ اسلامی معاشرہ کی پسماندگی کا سبب اسلامی تمدن کی پیروی کرنا نہیں جانتے تھے بلکہ اس سے دوری اختیار کرنے کو جانتے تھے اور اعتقاد رکھتے تھے کہ اگرچہ اسلامی معاشرے نے اپنے ظواہر کو حفظ کیا لیکن ان کے اندر معنوی اور حقیقی اقدار باقی نہیں رہی ہیں۔ سید جمال الدین اسد آبادی کی تحریک سے شروع ہو کر تشکیل پانے والا یہ نظریہ اسلامی معاشرہ اور امت کی واقعی کامیابی ونجات اور اسلام کی طرف پلٹنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں وسیع پیمانہ پر جدوجہد اور کوششیں کی گئی ہیں کہ جن کے ارتقائی سلسلہ کو تمباکو، مشروطیت اور تیل کی صنعت کو قومیانے کی تحریک میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ سید جمال الدین اسد آبادی کے بعد پیش قدم افراد میں شیخ فضل اللہ نوری، سید حسن مدرس، آیت اللہ کاشانی اور نواب صفوی قابل ذکر ہیں۔

ملت ایران کی اجتماعی طاقت کو بہتر طور پر پہچاننے کے لئے اس سرزمین کے لوگوں کی سماجی ساخت اور ترکیب کے بارے میں اجمالی طور پر آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

انقلاب سے پہلے ایران کے اجتماعی حالات:

موجودہ صدی کے اوائل میں، ایران کی آبادی کا ایک بڑا حصہ گاؤں میں رہنے والوں پر مشتمل تھا، جن کی اکثریت قبیلوں کی صورت میں زندگی بسر کرتی تھی۔ یہ قبیلے ملک کی ۲۵ فیصدی آبادی پر پھیلے ہوئے تھے۔ ۱۲۹۰ھ ش (۱۹۱۱ء)، یعنی مشروطہ کی تحریک کے اوائل میں ایران کی کل آبادی تقریباً ایک کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ۲۰ فیصدی لوگ ایسے شہروں میں زندگی بسر کرتے تھے جن کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ تھی۔ اس وقت تہران کی آبادی دو لاکھ افراد پر مشتمل تھی جو کل ایران کی آبادی کی ۲ فیصدی تھی۔ تھوڑی ہی مدت میں تہران کی آبادی دس لاکھ سے تجاوز کر گئی اور انقلاب سے پہلے پچاس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ شہروں کی آبادی کا تیزی کے ساتھ بڑھنا پہلوی حکومت کی غلط اور سامراجی سیاست کا نتیجہ تھا جو دیہاتوں کی نابودی اور گاؤں کے لوگوں کی تہران جیسے بڑے شہروں کی طرف ہجرت کا سبب بنا۔ اس طرح ۱۳۵۷ھ ش (۱۹۷۸ء) میں ایران کے شہروں کی آبادی دو کروڑ تک پہنچ کر گاؤں کی آبادی سے زیادہ ہو گئی تھی۔[1]

گاؤں کے باشندوں کی زندگی کی حالت شہروں میں رہنے والوں کی نسبت انتہائی ناگفتہ بہ تھی اور ان کے درمیان واضح فرق پایا جاتا تھا۔ ایران کے گاؤں کے باشندے ایسے دیہاتوں میں زندگی بسر کرتے تھے، جہاں کے مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ ۱۳۵۵ھ ش (۱۹۷۶ء) کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں تقریباً ۶۵ ہزار گاؤں تھے کہ ان میں سے ۱۸ ہزار گاؤں میں ہر گاؤں کی آبادی ۲۵۰ افراد پر مشتمل تھی، اس لحاظ سے ایران کے گاؤں کی آبادی دنیا کی پراکندہ ترین آبادی تھی۔ ایران کے گاؤں کی پسماندگی، محرومیت اور پراکندگی نے، چھوٹے چھوٹے معاشروں کی صورت میں ایک مشکل اور ناقابل برداشت زندگی کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں لاعلمی اور اموات کی زیادتی اس ناگفتہ بہ حالت کا طبعی سبب تھا۔ ۱۳۵۳ھ ش (۱۹۷۴ء) میں دیہاتوں میں مدرسہ جانے کے لائق عمر کے بچوں کی صرف ۳۹ فیصدی سرکاری مدارس سے استفادہ کرتی تھی۔ جبکہ

1-Robert Graham, Iran: The illation of Power, S Marti's Press Newyork,1980,p27

شہروں میں رہنے والے بچوں کی یہ شرح ۹۰ فیصدی تھی[۱]۔

دوسری جانب سے گاؤں میں رہنے والے لوگ جاگیرداروں اور ظالم حکام کی طرف سے برسوں سے مسلسل دباؤ میں تھے اور حکومت کے مأمورین کی طرف سے دباؤ اور ظلم و جبر کی وجہ سے حکومت اور اس کے مأمورین کے بارے میں بے اعتمادی، نفرت اور ترس کے علاوہ کچھ محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہ مأمورین صرف رشوت لینے اور ان کا استحصال کرنے کے لئے گاؤں کی طرف جاتے تھے نہ ان کی حفاظت اور مدد کے لئے۔

۱۳۴۰ھ ش (۱۹۶۱ء) کی ابتدائی دہائی تک ایران کھانے پینے کی چیزوں میں خود کفیل تھا، حتی کپاس، میوہ اور خشک میوہ کی درآمد سے اپنی زرمبادلہ کی کمی کو پورا کر سکتا تھا۔

لیکن تھوڑی ہی مدت میں کنیڈی کے زمانہ میں امریکی حکومت کے منصوبہ کے تحت شاہ کی طرف سے ارضی اصلاحات کو نافذ کرنے کے نتیجہ میں ایران کھانے پینے کی چیزوں میں دوسرے ملکوں کا محتاج بن گیا، جبکہ ۱۹۴۷ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے بعد موریسون ناڈسن نامی امریکی مشیروں کے ایک گروہ نے ایران کی ترقی کے لئے بالقوہ امکانات پر مطالعہ کر کے تجویز پیش کی تھی کہ اس ملک کی ارضی حالت کو بہتر بنانے پر توجہ دینی چاہئے[۲]۔

لیکن شاہ نے ۱۹۶۲ء میں امریکی حکومت کی استعماری سیاست کو نافذ کر کے ایران کی زراعت کو نابود کر دیا۔ اور اس کے کھنڈرات پر اجنبیوں کے کارخانے تعمیر کرا دیئے۔

۱۹۴۶ء میں (جس وقت ایران کے تیل کی درآمد میں اچانک اضافہ ہو گیا) زراعت کے شعبہ کے لئے ملکی درآمد کا کل ۸ فیصدی حصہ مخصوص کیا گیا تھا[۳]۔

1-ibid" p"43

2-ibid p"43

3-idib p'43

شاہ کی ارضی اصلاحات کے ضمن میں شہروں کی آبادی بڑھ گئی کیونکہ کھیتی باڑی کی نابودی، کے نتیجہ میں گاؤں کے باشندوں نے روزگار پیدا کرنے کے لئے شہروں کی طرف ہجرت کی تھی اور اس طرح شہروں میں روزمرہ کام کرنے والے مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا۔ یہ مزدور اکثر اپنے اہل وعیال کو گاؤں میں چھوڑ کر اکیلے ہی شہروں کی طرف ہجرت کرتے، اور شہر میں پہنچ کر مغربی تہذیب سے متاثر شہریوں سے سرکار رکھتے تھے، اور پیسے کمانے کے لئے حویلیوں عالی شان محلوں اور بلند و بالا قصروں کے جوار میں بڑی بڑی رقومات سے تعمیر کی جانے والی عظیم عمارتوں میں کام کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اگر چہ ان کی درآمد کے نسبتاً مناسب ہونے کا تصور کیا جاتا تھا لیکن ان کی اکثر درآمد نا قابل برداشت گراں بازاری کا شکار ہوتی تھی۔

۱۹۷۶ء کے اوائل میں پٹرول کی درآمد گھٹنے کے سبب، تعمیرات کے کام میں کمی واقع ہوگئی جس کے نتیجہ میں عمارتوں کی تعمیر میں کام کرنے والے مزدور بیکار ہوگئے، کیونکہ دیہاتوں میں کاشتکاری اور زراعت کے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر ان کا اپنے دیہاتوں کی طرف واپس چلے جانا بھی ناممکن تھا۔ یہ بیکار مزدور اکثر مذہبی اور جوان ہونے کے پیش نظر، شہروں میں سیاسی، انقلابی تحریک شروع ہوتے ہی عوامی تحریک کے بنیادی اور اصلی مرکز بن گئے اور انہوں نے دیہاتوں اور شہروں کے درمیان اس تحریک کا رابطہ برقرار کیا۔

اجتماعی ناراضگیوں کے متعدد عوامل نے انقلاب کے لئے ماحول فراہم کیا تھا۔ مذہبی اقدار اور مذہبی قائدین کے تقاضوں کی لاپروائی، حد سے زیادہ لا ابالی پن، برائیوں کی ترویج، شرم وحیا کی عدم رعایت فتنہ وفساد کا رواج، حکومت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر بہائیوں اور صہیونیوں کا قبضہ، معاشرہ کے اقتصاد پر بہائیوں اور صہیونیوں کی بالا دستی اور تاریخ اسلام کو بدل کر قدیم رسومات کی طرف پلٹنا، جیسے عوامل نے ایران کے معاشرہ میں انقلاب رونما ہونے کا ماحول فراہم کیا۔ ان عوامل کے علاوہ ملک میں اجنبیوں، خاص کر امریکیوں کی لاتعداد موجودگی، اجتماعی خدمات کی کمی، معاشرہ کے نچلے طبقات میں روزافزوں بے کاری اور غریب و امیر طبقوں کے درمیان حد درجہ فرق جیسے عوامل بھی قابل

ذکر ہیں۔اس کے علاوہ لوگوں کا سیاسی نظام سے روز بروز دور تر ہونا اور لوگوں کی ابتدائی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں حکومت کی ناتوانائی کے نتیجہ میں کوئی شخص یہ امید نہیں رکھتا تھا کہ موجودہ حالت جاری رہ سکے گی۔

لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ایران کے لوگوں اور ملک پر حاکم سیاسی طاقت کے درمیان وسیع اور عمیق دوری کے باوجود، شاہ کی حکومت اقتصادی، فوجی اور بین الاقوامی توانائی کے لحاظ سے مناسب اور مطلوب حالات میں تھی۔ کیونکہ ستّر کی دہائی کی ابتداء میں پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے حکومت کی درآمد کئی گنا بڑھ چکی تھی اور اس کے نتیجہ میں انقلاب سے پہلے مغربی ممالک اور تیسری دنیا میں شاہ کی حکومت قرض دینے والی ایک سخی حکومت کے طور پر مشہور ہو چکی تھی۔ نکسن پلان پر عملی جامہ پہنانا کے لئے شاہ کو علاقہ کا محافظ انتخاب کر کے استثنائی صورت میں مخالفین کو کچلنے اور اقتدار کے تحفظ کے لئے مسلح افواج کو بنیاد و وسیلہ بنالیا تھا۔ بالآخر دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان موجودہ مفاہمت کے ماحول میں شاہ کی حکومت کو دنیا کی مشرق و مغرب کی بااثر حکومتوں کی طرف سے مادی اور معنوی حمایت حاصل تھی۔ فطری طور پر اس قسم کی ایک انتہائی طاقتور حکومت سے مقابلہ کرنے اور اسے سرنگوں کرنے کے لئے اس سے برتر ایک طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، کہ اسے انقلاب کے تین بنیادی ارکان کے اندر تلاش کرنا چاہئے۔

اس تفسیر کے پیش نظر موجودہ حالت میں تبدیلی کی ضرورت کیوں انقلاب کی صورت میں رونما ہوئی اور دیگر کوششوں کے باوجود اصلاحات اور تختہ الٹنے کی سازش جیسی سیاسی اجتماعی تبدیلیاں کیوں ایرانی معاشرہ کے مشکل کو حل نہ کر سکیں اور ایک عظیم تاریخی انقلاب کے اسباب نہ بن سکیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے ایک مفصل بحث کی ضرورت ہے، جس کے بارے میں ہم آنے والی فصل میں وضاحت کریں گے۔

دوسری فصل:

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے اسباب

- عوام
- رہبری
- آئیڈیالوجی

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے اسباب

جب ایک معاشرہ دو قطبی صورت اختیار کرتا ہے اور سیاسی اور اجتماعی طاقت کا ایک دوسرے کے نزدیک آنا ناممکن بن جاتا ہے تو ایسے معاشرہ میں ایک سیاسی ۔ اجتماعی تبدیلی کا رونما ہونا ناگزیر بن جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلی فصل میں بحث و تحقیق کی گئی کہ، ایران پر حاکم طاقت ایرانی معاشرے سے اس قدر دور ہو چکی تھی اور ایک الگ راستہ اختیار کر چکی تھی اور شاہ کی حکومت کے آخری دس سالوں میں اس طریقہ کار میں ایسی تیزی آ گئی تھی کہ، کسی کے لئے اس سلسلہ میں شک و شبہہ باقی نہیں رہا تھا کہ موجودہ صورت میں ایرانی معاشرہ پر حاکم نظام اپنے اور معاشرہ کے درمیان پیدا ہوئے فاصلہ کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ حکومت میں اپنی صلاحیت میں تبدیلی لانے کی توانائی تھی اور نہ عوام اس حکومت سے کوئی امید وابستہ کرنا ممکن سمجھتے تھے۔

لہذا ایرانی معاشرہ میں ایک دھماکہ خیز حالت پیدا ہوئی تھی اور ممکن تھا کہ کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آ جائے اور موجودہ حالت کو درہم برہم کر کے معاشرہ کی عام حالت کو ابتر بنا دے۔ موجودہ زخموں پر مرہم رکھنے اور عوام اور حکومت کے درمیان فاصلہ کو دور کرنے کے لئے ہر کوشش بیکار تھی اور لوگوں کو دھوکہ دینا ممکن نہیں تھا۔ شاہ ایک جگہ پر اعتراف کرتا ہے کہ ایک پارٹی (رستاخیز) کا سسٹم کامیاب نہ ہو تو پھر شاہ کی حکومت کے باقی رہنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ لیکن اس سوال کی زیادہ اہمیت ہے کہ، تمام دنیا میں روزمرہ رونما ہونے والی سیاسی ۔ اجتماعی تبدیلیوں کے بجائے، ایران میں کیوں انقلاب رونما ہوا؟

گزشتہ صدی کے دوران دنیا میں رونما ہونے والے عظیم انقلابوں کا سرسری جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب ایسے حالات میں رونما ہوا ہے کہ فوجی اور سیاسی لحاظ سے داخلی

اور بین الاقوامی حالات نہ صرف اس قسم کی تحریک کے موافق نہیں تھے، بلکہ اس کو کچلنے کے لئے بہت زیادہ کوششیں کی گئیں۔

موجودہ صدی کے جو دو بڑے انقلاب، زار روس اور چین میں رونما ہوئے، ان کے لئے سیاسی ،اجتماعی اور اقتصادی لحاظ سے حالات بالکل موافق تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں رونما ہونے والا روسی انقلاب، ایک سیاسی طاقت سے جنگ کرنے یا، روس کی مطلق العنان حکومت کی فوج کو شکست دینے یا حکمران نظام کو نابود کرنے کے نتیجہ میں رونما نہیں ہوا بلکہ مذکورہ دونوں ادارے (حکام اور فوج) پہلی جنگ عظیم کے دوران کمزور ہو کر نابود ہو چکے تھے۔ انقلابیوں نے جو کام انجام دیا وہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے طاقت کے ایک خلا اور افراتفری کے ماحول میں حالات پر قابو پایا۔

چین کی کو مین تانگ حکومت بھی دوسری عالمگیر جنگ کی وجہ سے اور اجنبیوں کے پے در پے حملوں سے مکمل طور پر کمزور ہو چکی تھی، یہاں تک کہ مرکزی حکومت کو پیکنگ اور اس کے اطراف کے علاوہ ملک کے حالات پر کنٹرول نہیں تھا۔ اس لئے ماوزے تنگ کی رہبری میں انقلابیوں کے لئے ملک پر کنٹرول حاصل کرنے میں کوئی خاص رکاوٹ موجود نہیں تھی۔

جبکہ، جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے وقت دنیا کے حالات مذکورہ دو انقلابوں کے زمانوں کے برعکس اس قسم کی تبدیلی کے لئے بالکل ناموافق تھے۔ اس وقت بڑی طاقتیں آپسی ٹکراؤ سے اجتناب کر کے پر امن ماحول میں زندگی گزارنے کے دور سے گزر رہی تھیں اور ایک عالمی شہنشاہی نظام وجود میں آچکا تھا۔ مسلّط طاقتیں دنیا کی موجودہ حالت کے تحفظ پر متفق تھیں اور شاہ کی حکومت کے باقی رہنے میں دونوں بڑی طاقتوں کے مشترک منافع کے پیش نظر وہ آخری دنوں تک حتی الامکان اس کی حمایت کرتی رہیں۔ شاہ کی حکومت بھی جدید ترین اسلحہ سے لیس چار لاکھ افراد پر مشتمل ایک فوج پر بھروسہ کر رہی تھی۔ ایسے ہی حالات میں ایران کی امت مسلمہ نے شہنشاہی نظام کے خلاف ایک غیر مسلحانہ انقلاب برپا کر کے کامیابی حاصل کر لی۔[۱]

۱۔ اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کے لئے مصنف کی کتاب ''اسلامی انقلاب کا فرانس اور روس کے انقلابوں سے موازنہ'' طبع دوم ۱۹۹۱ء ملاحظہ ہو۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے اسباب کو جاننے کے لئے دو بنیادی مسائل پر غور کرنا ضروری ہے:

اوّل: ایران کے لوگوں نے گزشتہ ایک صدی کے دوران ملک پر حاکم سیاسی نظام کے خلاف اصلاحاتی اور اعتدال پسند طریقہ پر مسلسل مقابلہ کیا ہے۔ اگر چہ اس سلسلہ میں کافی تجربہ حاصل کیا لیکن عملی طور پر زبردست ناکام ہوئے۔ مشروطیت کی تحریک ایرانی بادشاہوں کی طاقت کو کنٹرول اور محدود کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ تمباکو کی تحریک اور تیل کی صنعت کے قومیانے کے مسئلہ نے دخل وتصرف کو ختم کر دیا۔ آخر کار ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کی امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ سازش کے نتیجہ میں خودخواہ شاہ کی ڈکٹیٹر شپ مضبوط ہوگئی اور ایرانی معاشرہ کے حق خودارادیت پر اجنبی مسلط ہو گئے ۔ یہ تھے لوگوں کی تحریک کے چند نمونے۔ مذکورہ تاریخی تجربوں نے ثابت کر دیا کہ جب تک سیاسی سسٹم کی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینک کر اس کی جگہ پر آئیڈیالوجی اور لوگوں کی پسندیدہ اقدار پر مبنی ایک نیا مثالی نظام قائم نہ کیا جائے تو فرسودہ نظام کے باقیماندہ اثرات اقتضائے زمان کے مطابق پھر سے سر اٹھا کر لوگوں کی تحریک کے ماحصل کو نابود کر دیتے ہیں۔ اس لئے کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی سازش اور مصلحتوں سے لوگوں اور تحریک کے رہبروں کو متاثر ہوئے بغیر اسلامی حکومت برقرار کرنے کے اپنے عالی اور مقدس مقصد تک پہنچنے کے لئے پوری توانائی سے کوشش کرنا چاہئے۔

دوسرا: ایران کے اسلامی انقلاب میں انقلاب کے تین بنیادی ارکان (عوام، رہبری اور آئیڈیالوجی) کا مکمل اور مطلوب صورت میں یکجہتی کے ساتھ ایک ہی وقت میں میدان میں آنا۔

الف۔ عوام

ایک اہم مسئلہ جس نے ایران کے اسلامی انقلاب کے اکثر تجزیہ نگاروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور غیر ملکی ناظرین کو حیرت میں ڈال دیا ہے، یہ حقیقت تھی کہ اس انقلاب میں تمام لوگوں نے کیسے اچانک پوری ہماہنگی اور اتحاد کے ساتھ حصہ لے کر انقلاب برپا کیا اور ایک آواز میں بنیادی تبدیلی، یعنی شاہ کی حکومت کے زوال اور اسلامی حکومت کی برقراری کا مطالبہ کیا۔

اگر ہم دنیا کے تمام بڑے انقلابوں پر نظر ڈالیں، تو ہم اس درجہ وسیع اور عالمگیر کسی حادثہ کا مشاہدہ نہیں کریں گے۔ فرانس کے عظیم انقلاب میں پہلے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اور اس کے بعد شہر میں رہنے والے بورژواؤں نے انقلاب کر کے بوربونوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اسی لئے یہ انقلاب بورژوائی انقلاب کے نام سے مشہور ہوا۔

بلشویکی انقلاب کے نام سے مشہور روسی انقلاب میں، درحقیقت پطرزگراد کے کارخانوں کے ہڑتالی مزدوروں نے شہر کی فوجی چھاونی کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے ان سے ملحق ہونے کی وجہ سے روس کی زار حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔

چین میں بھی کاشتکاروں اور زمینداروں نے انقلاب کے سلسلہ میں گاؤں سے رہبری اور ہدایت کی اور انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور اسی لئے چین کا انقلاب کاشتکاروں اور زمینداروں کے انقلاب کے نام سے مشہور ہے۔

جبکہ ایران میں اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لئے شاہ کی حکومت سے انتہائی وابستگی رکھنے والے معدود چند افراد کے علاوہ معاشرہ کے تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد، جیسے کاشتکار، مزدور اصناف، سرکاری ملازمین، یونیورسٹی کے طلبہ، اور شہروں اور گاؤں میں رہنے والے طالب علم ملک کے کونے کونے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور مختلف گروہوں کے مطالبات پر اتفاق و تفاہم کئے بغیر سب ایک ساتھ ہم آواز ہو کر ایک ہی قسم کے نعرے بلند کرتے تھے۔ اس وحدت و یکجہتی کا ۱۹۷۸ء میں عید فطر، تاسوعا اور عاشورا کے مظاہروں کے دوران تہران میں عینی اور واضح مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ تہران کے لوگوں نے۔ (جس شہر نے شاہ کی سیاست کے نتیجہ میں اپنے مذہبی رخ کو کھو کر یورپی شہروں کی شکل اختیار کر لی تھی اور اسلامی شہروں کی نسبت یورپی شہروں سے کہیں زیادہ پیدا کر لی تھی) اچانک انقلاب برپا کیا اور اپنی آرزؤں کو دوبارہ روحانیت اور مذہب میں پانے لگے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو زیادہ مذہبی نہیں تھے، تمام ملت کے ساتھ ہم صدا ہو کر ''اللہ اکبر'' کی فریاد بلند کرنے لگے اور اپنے مذہب کو اپنی دفن شدہ ہویت کے طور پر اعلان کرنے لگے۔ ۱۹۷۸ء کی عید فطر کے دن تہران

میں ایک ایسی تحریک رونما ہوئی جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور لوگوں نے ایک جوش وخروش کی حالت میں اپنی عرفانی ھویت کو دوبارہ پہچان کر معاشرہ پر حاکم نظم کو ایک سراب کے مانند دور پھینک دیا۔

عاشورا کے مظاہروں میں، بچوں، ضعیفوں، بوڑھوں اور گھروں سے باہر نہ نکلنے والی خواتین کے ایک گروہ کے علاوہ تہران کے تمام لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ''مردہ باد شاہ'' کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔شاہ کی حکومت سے انتہائی قریب تعلقات رکھنے والے اور اس کی طرف سے منافع کمانے والے گنے چنے افراد کے علاوہ سب لوگ، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو طولانی مدت تک شاہ کے ساتھ تھے اور کچھ دن پہلے تک مشروط سلطنت کی حمایت کرنے والے بھی ''مردہ باد شاہ'' کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

بنیادی طور پر لوگوں کی انقلابی تحریکیں، اجتماعی ارادہ کو قطعی طور پر ظاہر کرتی ہیں اور یہ دنیا کے اقوام کی تاریخ میں کمیاب ہے۔اجتماعی ارادہ ایک سیاسی افسانہ ہے، کہ قانون دان اور فلاسفہ اس کی مدد سے اس کے نظم وترتیب اور تشکیلات کا جایزہ لینے اور توجیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔کچھ لوگوں کا ارادہ ایک نظریاتی پہلو ہے جسے ظاہری آنکھوں سے بہت کم دیکھا جاسکتا ہے بلکہ ''میشل فوکو'' کے بقول ''خدا یا روح کے مانند شاید کبھی دیکھا نہ جا سکے گا''، لیکن تہران اور پورے ایران میں یہ ارادہ مشاہدہ کیا گیا اور ایک قطعی حقیقت، واضح اور پائدار صورت میں باقی رہی ہے۔[۱]

اس طرح سے ایران کی قومی تاریخ میں محکم مذہبی جذبات کی بنیاد پر اچانک ایک وحدت اور یکجہتی وجود میں آ گئی۔یہ جذبات ایسے مسائل کے ضمن میں پیدا ہوئے، کہ ملت برسوں سے ان کا دکھ برداشت کر رہی تھی۔ جیسے غیروں کا نفوذ اور مسائل پر تسلّط، قومی سرمایہ کے لوٹ کھسوٹ کے بارے میں نفرت کا احساس، بیرونی سیاست پر غیروں کا تسلّط، اور ہر جگہ امریکہ اور برطانیہ کا واضح نفوذ قابل ذکر ہے۔اس قسم کا اجتماعی ارادہ اور لوگوں کا مختلف سیاسی گروہوں سے اتحاد اور آپسی تال میل اور یہ کہ ہر گروہ نے اپنی رنگا رنگ خواہشات کے بارے میں سمجھوتا کر لیا تھا کہ کچھ موارد میں ان کی برابری کریں یا تسلیم ہو جائیں۔

۱۔کلر بریر، پیر بلانشہ، ایران: انقلاب بہ خدا، ترجمہ قاسم صنعوی، سحاب ص ۲۵۵

ایران میں انقلابی تحریک کا مکتب تشیع کی اقدار اور تمناؤں پر مبنی ہونے کے باوجود اہل سنّت نے بھی اس تحریک کی حمایت کر کے انقلاب میں شرکت کی۔

''میشل فوکو'' نے اس سلسلہ میں کردستان کے ایک سنّی سے بحث کرنے کے بعد لکھا ہے:

''جب میں نے تمام مذہبی اور قومی اختلافات کے باوجود اس انقلاب میں شرکت کرنے کے بارے میں اس سے پوچھا، تو اس نے یوں جواب دیا: ''صحیح ہے ہم سنّی ہیں، لیکن ہر چیز سے پہلے ہم مسلمان ہیں۔'' اور یہ کہا: ہم کیسے کرد ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ہم ہر چیز سے پہلے ایرانی ہیں اور ایران کے تمام مسائل میں شریک ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ شاہ چلا جائے، زندہ باد خمینی، مردہ باد شاہ۔ کردستان میں بھی وہی نعرے بلند کئے جاتے تھے جو تہران یا مشہد میں لگائے جاتے تھے۔[1]

ایران میں انقلاب کی شدّت اور اس کی گہرائی کو معین کرنے والے عوامل میں ایک عامل لوگوں کا اجتماعی ارادہ تھا جو سیاسی طور پر وجود میں آیا تھا، جس کے بارے میں کوئی شخص حتی دشمن اور شاہ بھی شک وشبہہ نہیں کرتا تھا اور دوسرا سیاسی، اجتماعی نظام اور معاشرہ میں حاکم اقدار کی بنیادوں میں تبدیلی لانے کا مطالبہ تھا۔

ایران میں برطانیہ کے سفیر ''انٹونی پارسنز'' ''غرور وزوال'' نامی اپنی یادوں پر مشتمل کتاب میں لکھتا ہے کہ شاہ نے اپنی حکومت کے آخری مہینوں میں اس کے ساتھ پے در پے کی گئی متعدد ملاقاتوں کے دوران حد درجہ حزن وملال کے عالم میں پوچھا: ان لوگوں کے لئے میں نے اتنی خدمتیں انجام دی ہیں اس کے باوجود بھی یہ لوگ میرے مقابلہ میں کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟ میں نے اس کے جواب میں کہا: میرے خیال میں اس کے بہت سے اسباب ہیں ۔لوگوں کا بڑی تعداد میں شہروں پر حملہ کرنا، ناراض مزدور جماعت کے گروہ تشکیل پانے کا سبب بنا تھا۔ ان میں سے بہت سے مزدور عمارتیں تعمیر کرنے میں مشغول تھے۔ وہ دن کو سرمایہ داروں کے گھر بناتے تھے اور رات کو اپنی جھونپڑیوں حتی پلاسٹک کی بنی جھونپڑیوں

۱۔ کلر بریر، پییر بلانشہ، ایران: انقلاب بہ خدا، ترجمہ: قاسم صنعوی، سحاب، ص ۱۔۲۶۰

میں چلے جاتے تھے!۱

پارسنز نے اس موضوع سے چشم پوشی کی ہے کہ لوگوں کے انقلاب کا اصلی سبب یہ تھا کہ شاہ مذہب سے سرچشمہ حاصل کرنے والے معاشرے کی اقدار کو نابود کرنے پر تلا ہوا تھا اور اسی وجہ سے ایران کی امت مسلمہ کے مذہبی جذبات مجروح ہونے کی وجہ سے، دوسرے تمام سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی مشکلات برداشت کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے نعروں میں جس چیز کو بیان نہیں کرتے تھے، وہ ان کے مادی اور اقتصادی مطالبات تھے۔ انہوں نے مذہب کے پرچم اور نعروں کے ساتھ مذہبی علما کی رہبری میں مسلمانوں کی عبادت گاہ مسجد سے قیام کیا اور کامیاب ہوئے۔

جابر اور ظالم حکام اور اجنبیوں کے تسلط کے خلاف قدیم زمانہ سے مسجدوں کا اہم رول رہا ہے۔ مسجدیں لوگوں کی دائمی عبادت گاہیں تھیں، لوگ ان میں اپنے مذہبی فرائض انجام دینے کے لئے ہر روز جمع ہوتے تھے، اس لئے یہ مسجدیں صلاح ومشورہ، غور وفکر، معلومات حاصل کرنے، اعتکاف اجتماعی فیصلوں اور اجتماعی مجاہدتوں اور سرگرمیوں کے لئے مناسب جگہیں تھیں۔ حقیقت میں مسجد، سیاست وعبادت کے درمیان ایک پیوند ہے اور اس کا سرچشمہ صدر اسلام بالخصوص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کی سنّت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اسلام کے سپاہی مساجد سے میدان کارزار کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ انقلاب کے دوران بھی قدرتی طور پر اور اسی تاریخی سابقہ کے پیش نظر ایران کی مساجد نے اپنا رول ادا کیا اور حکومت کے خلاف مقابلہ کا مرکز بن گئیں۔ رضا شاہ کے زمانہ میں مسجد گوہرشاد پر حملہ اور لوگوں کو خاک وخون میں غلطاں کرنا، روسیوں کا حرم امام رضا (ع) پر توپ چلانا اور اسی طرح کرمان کی جامع مسجد پر حملہ کر کے اسے نذر آتش کرنا اور لوگوں کا خون بہانا، مذکورہ تحریک میں مسجد کی اہمیت، اس سے مقابلہ ومبارزہ کے مورچہ کے عنوان سے استفادہ کرنے کا واضح ثبوت ہے اور اسی طرح سیاسی طاقتوں کی اس مقدس مکان کی نسبت رکھنے والے عناد کا نمونہ ہے۔ لیکن ان سب چیزوں سے اہم انقلابی تحریک کی رہبری اور اسے

۱۔ انٹونی پارسنز، ''غرور وزوال'' ترجمہ پاشا شریفی، راہ نو، ص ۱۲۵

نظم وضبط بخشنے میں مذہبی علما کا رول ہے، اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شیعہ علماء بالخصوص ایران کے علما اہم اوصاف کے مالک ہیں، اس لئے لوگوں کو انقلابی بنانے میں ان کا غیر معمولی اور موثر رول رہا ہے یہ اوصاف حسب ذیل ہیں:

ا۔ علماء کا اجتماعی مقام: لگ بھگ سارے علماء معاشرہ کے فقیر اور محروم طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر گاؤں کے باشندے ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے معاشرہ کے عام لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کیا ہے اور ایسے ہی حالات میں پرورش پائی ہے[۱] جب کہ بہت سی سیاسی، اجتماعی تحریکوں میں تعلیم یافتہ اور روشن فکر طبقے قومی مبارزوں کی رہبری سنبھالتے ہیں، اپنی خاص ثقافت کے تحت عام لوگوں سے جدا ہو کر ایک ممتاز طبقہ کو تشکیل دیتے ہیں یہاں تک یہ طبقہ عام لوگوں سے معنوی رابطہ بھی توڑ دیتا ہے۔

۲۔ اقتصادی آزادی: اہل سنّت علماء حکومت کی طرف سے معین ہوتے ہیں اور ان کا ذریعہ ٔمعاش سرکاری تنخواہ پر منحصر ہوتا ہے، اس کے برعکس شیعہ علماء اقتصادی لحاظ سے سیاسی نظام سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کا ذریعۂ معاش عام مسلمانوں اور ان کے معتقدین کے توسط سے پورا ہوتا ہے۔ سیاسی نظام سے مالی آزادی اور لوگوں کے توسط سے ذریعہ معاش پورا ہونا فطری طور پر شیعہ علماء کے لئے اس امر کا سبب بنا ہے کہ کسی فکر و پریشانی کے بغیر لوگوں کی مرضی کے مطابق اپنی سیاسی، مذہبی سرگرمیوں کو جاری رکھیں۔ یہاں پر دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

ا۔ مائکل فیشر کے اعداد وشمار کے مطابق، جو اس نے ۱۹۷۵ء میں مدرسہ علمیہ گلپایگانی کے بارے میں انجام دیا ہے، مدرسہ کے ۲۵۶ طلاب میں سے ۱۲۸ افراد (۵۰ فیصدی) گاؤں کے، ۵۶ افراد (۲۲ فیصدی) علماء کے خاندانوں سے اور ۶۲ افراد (۲۸ فیصدی) شہر کے متوسط اور نچلے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملاحظ ہو:

Michael fisher "Iran" From Religious Dispute to Revolution Harvard Univ; Press 1980

مصنف نے بھی ۱۹۸۵ء میں مؤسسہ ''در راہ حق'' قم کے طلاب کے بارے میں ایک تحقیقات کے بعد حسب ذیل نتائج حاصل کئے ہیں: اس مؤسسہ کے ۲۰۰ طلاب میں ۲۵ فیصدی کسان خاندان سے، ۱۵ فیصدی مویشی پالنے والوں سے، ۱۰ فیصدی علماء کے گھرانوں سے اور ۵۰ فیصدی شہر کے متوسط طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔

اول یہ کہ روحانیت نے غالباً کوشش کی ہے کہ عیش وعشرت سے پرہیز کر کے سادہ زندگی بسر کریں کہ یہ بذات خود ان کے مستغنی، بے نیازی اور آزادی کا سبب بنا ہے۔

دوسرا یہ کہ ان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا معاشرہ کے سرمایہ دار طبقہ سے وابستہ نہیں رہا ہے ، بلکہ اکثر معاشرہ کے غریب، متوسط اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے ذریعہ پورا ہوتا ہے، جو سرسخت مذہبی عقائد کے پیش نظر خمس، زکواۃ اور نذورات جیسی شرعی رقومات کو ادا کرنا اپنا فریضہ جانتے ہیں اور علماء کی محدود ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

۳۔ رابطہ برقرار کرنا: شیعہ مکتب میں اجتہاد کا دروازہ اسی طرح کھلا ہوا ہے، یہ نہ صرف شیعہ فقہ کی بالیدگی اور ترقی کا سبب بنا ہے بلکہ اس نے اجتہاد اور تقلید کے مسئلہ کو خاص اہمیت بخشی ہے۔ ہر مسلمان کو یا خود مجتہد اور فقہی مسائل سے آگاہ ہونا چاہئے یا مرجع تقلید کے نام سے توضیح المسائل کے حامل مشہور اور جامع الشرائط فقہا کی تقلید کرنی چاہئے۔ فطری بات ہے کہ مختلف علاقوں میں رہنے والے سارے لوگوں کی مراجع تقلید تک رسائی نہ ہونے کے سبب، مراجع کے فتووں اور نظریات کو لوگوں تک پہنچانے کے سلسلہ میں علما رابطہ کا کام انجام دیتے ہیں اور اپنے لئے کوئی خاص مقام ومنزلت پیدا کئے بغیر مذہبی رہبروں اور لوگوں کے درمیان رابطہ کی اہم ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ وہ مساجد میں منبر سے لوگوں کے لئے مراجع کے فتوے اور نظریات بیان کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں لوگوں کے مسائل اور مشکلات کو مراجع اور مذہبی رہبروں تک پہنچاتے ہیں۔

مذکورہ مواقع کے پیش نظر شیعہ علماء نے گزشتہ ایک صدی کے دوران سرگرمی کے ساتھ سیاسی، اجتماعی تحریکوں میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایران کے شیعہ علماء نے وقت کی حکمراں سیاسی طاقت سے ٹکر لی ہے۔ اور سیاسی طاقت اس جنگ میں ہار گئی ہے۔ علماء کی طاقت، غیر مذہبی سیاسی طاقت سے قابل موازنہ نہیں ہے اور یہی امر سیاسی طاقتوں کے علماء کے خلاف کینہ وحسد کے بھڑکنے کا سبب بنا ہے اور ان کے محتاج ہونے کے باوجود جب بھی ان کے لئے ممکن ہو سکا ان کے ساتھ ظلم کرنے اور انھیں نابود کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔

گزشتہ صدی میں ایران کے قومی لیڈر، جو اکثر لیبرل تھے، اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ علماء اور روحانیوں کی حمایت کے بغیر عوام سے رابطہ قائم کر کے انھیں حرکت میں لانا ممکن نہیں ہے۔ لہذا انہوں نے علماء کے ساتھ ایک قسم کی مصلحتی مفاہمت کی تا کہ شاید اس طرح علماء لوگوں کو قومی مقاصد کے لئے متحرک کریں۔ اس سلسلہ میں مشروطہ اور تیل کو قومیانے کی تحریکیں قابل ذکر ہیں، جن میں علماء نے لوگوں کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالی تھی، لیکن غیر علماء لیڈران تحریکوں کا صرف ناجائز فائدہ اٹھانے والے تھے۔ دوسری جانب سے علماء سیاسی حکومتوں کے لئے دوسرے تمام مخالفین کی نسبت زیادہ خطرناک تھے۔ کیونکہ ان کے ہاں ساز و باز کرنے اور تسلیم ہونے کے کم امکان تھا اور نہ صرف سیاسی داؤ پیچ سے آگاہ نہیں تھے، بلکہ بنیادی طور پر انہوں نے مکیاولی سیاست کے مفہوم و معنی میں تربیت نہیں پائی تھی اور اگر وہ سیاسی میدان میں کود بھی پڑے تو اس کا صرف یہ سبب تھا کہ ملت و مذہب کو خطرہ میں دیکھ رہے تھے۔

رابرٹ گرھام' ایرانیوں کے مبارزات میں علماء اور مساجد کے رول کے بارے میں یوں لکھتا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ (ایران میں شیعہ) علماء، لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے ساتھ انتہائی قریبی رابطہ رکھتے تھے اس لئے وہ لوگوں کے جذبات سے زیادہ واقف تھے۔ مسجد عوام اور بازار کا اٹوٹ حصہ ہے اور بازار عام لوگوں کی زندگی کا مرکز ہے۔ جب علماء حکومت کی پالیسیوں سے مخالفت کرتے ہیں تو ان کے نظریات اس قدر جواز پیدا کرتے ہیں کہ سخت ترین استبدادی حالات میں بھی لوگ ان کو قبول کرتے ہیں۔ دوسری جانب سے علماء اور مساجد کا عوام کے ساتھ رابطہ علماء کو لوگوں کے تمام طبقوں سے رابطہ قائم کرنے کی طاقت بخشتا ہے[1]۔''

ایران کے روحانی سسٹم میں کوئی باقاعدہ مدارج کا سلسلہ موجود نہیں ہے، ان میں سیاسی پارٹیوں

---

1. Robert Graham, Iran: The Illation of Power "St. Martins Press, Newyork, 1980, P218

کے سسٹم میں پائے جانے والے ماتحت و مافوق جیسے خشک رابطے حکومت نہیں کرتے بلکہ صرف اجتہاد وتقلید کی بنیاد پر قلبی اور معنوی رابطہ ہوتا ہے جو معاشرہ کے لوگوں کو مکتب کی بنیاد پر علماء اور مذہبی رہبروں سے ملاتا ہے۔ اس طرح مذہبی رہبروں کے احکام اور نظریات کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اور ضروری ہماہنگی کے تحت ان پر عمل ہوتا ہے۔ مذہبی رہبر بھی ہر چھوٹے اور جزئی مسئلہ میں دخل نہیں دیتے ہیں، بلکہ ان کی فرمایشات میں اکثر ہدایت و رہنمائی اور شرعی اور الٰہی فرائض کو انجام دینے کی یاد دہانی کا پہلو ہوتا ہے۔ حقیقی مصادیق کو پہچان کر ان کی تطبیق کر کے مذہبی رہبروں کے نظریات کو عملی جامہ پہنانا اجتماعی گروہوں اور افراد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ طریقہ کار حکم اور تعمیل حکم کے خشک سلسلہ کو ختم کرتا ہے۔ اور اجتماعی گروہوں کے لئے سیاسی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے طریقہ کار میں ان کے نظریات اور اُنچ پر عمل پیرا ہونے میں ان کی تخلیق و شرکت کا سبب بنتا ہے۔ اس سسٹم میں اندھی تقلید اور جبر و اکراہ کا وجود نہیں ہے۔ ممبر شپ کا طریقہ کار نہیں ہے۔ سرگرم گروہوں میں شامل ہونے کے لئے خصوصی شرائط کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ سیاسی، اجتماعی تحریک میں شرکت کرنے کے لئے صرف مبارزہ کے مقاصد اور کلی ڈھانچہ کو قبول کرنا کافی ہوتا ہے اور علماء ہمیشہ تحریک کے رہبروں کے ساتھ رابطہ کے سلسلہ کا رول ادا کرتے ہیں۔ ان ہی علماء میں سے امام خمینیؒ جیسے عظیم مذہبی۔ سیاسی رہبر وجود میں آتے ہیں۔

قیادت:

ہم یہاں پر رہبر انقلاب کی سرگرمیوں کے نتائج پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم ان کی شخصیت، خصوصیات اور اوصاف کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ جو بھی شخص امام خمینیؒ کو نزدیک سے دیکھتا تھا، وہ آسانی کے ساتھ سمجھتا تھا کہ یہ شخص ایک مثالی انسان ہے اس کی قدرت اور توانائی بلاشک ایک مرجع تقلید سے زیادہ تھی اور وہ (ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے) خودشناسی کے مفہوم کا مکمل نمونہ تھے۔ یہاں تک غیر ایرانی مسلمان بھی انھیں اسلام کے ایک مثالی انسان کا واضح نمونہ سمجھتے تھے۔

ان خصوصیات اور اس کے باوجود کہ وہ چند منٹ میں لاکھوں ایرانیوں کو مظاہروں کے لئے سڑکوں پر لا سکتے تھے، لیکن ان کی زندگی، دفتر اور گھر میں سادگی کے علاوہ کسی اور چیز کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی میز کے پیچھے زمین پر بیٹھتے تھے اور اس کے کام کرنے کے کمرہ کے تمام وسائل وہی ایک چھوٹی سی میز تھی۔ انقلاب سے پہلے بہت سے دوسرے خبر نگاروں کے مانند ترکیہ کا ایک غیر مذہبی خبر نگار اقلیتوں اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں چند سوالات پوچھنے کے لئے امام خمینیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور امام کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا تھا، کہ شرمندہ ہو کر سوال کرنے سے منصرف ہو گیا، اور امام سے چند نصیحتیں کرنے کی درخواست کی تا کہ وہ اپنی شخصی زندگی میں ان سے استفادہ کرے۔ امام نے اس سے نصیحت کی کہ دین اسلام کا مطالعہ کر کے پنجگانہ نمازیں بجا لائے![1]

جب ہم امام خمینیؒ اور ان کی شخصیت کے بارے میں جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی شیعہ علماء کے ایک مظہر ہیں اور یہ چیز نہ صرف ان کے سیاسی۔ اجتماعی مسائل میں تصور سے بالا مکمل، جامع اور وسیع نفوذ وقدرت کے سبب ہے، بلکہ ان کے محض روایتی علمی جہت سے بھی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ رہبر انقلاب اور مبارزات کی حیثیت سے ظاہر ہونے سے پہلے، امام کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ امام خمینیؒ ۱۹۰۲ء میں خمین میں ایک عالم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آیت اللہ شہید سید مصطفیٰ موسوی، علامہ جلیل القدر مرحوم سید احمد موسوی کے بیٹے تھے۔ امام کے جد امجد سید احمد موسوی نجف اشرف میں زندگی بسر کرتے تھے، جو یوسف خان کمرہ ای کی دعوت پر اہل خمین کی ہدایت کے لئے خمین تشریف لائے اور امام خمینیؒ کے والد گرامی خمین میں پیدا ہوئے۔ مرحوم آیت اللہ سید مصطفیٰ نے آیت اللہ میرزائے شیرازی کے زمانہ میں نجف اشرف اور سامرا میں تعلیم حاصل کی اور اپنے زمانے کے علماء اور مجتہدین کے زمرہ میں قرار پائے۔ اور نجف سے واپسی پر اہل خمین کی قیادت سنبھال لی لیکن ۱۳۲۰ ہجری قمری میں خمین اور اراک کے درمیان امام کے والد پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ شہید ہو گئے۔ اس وقت امام خمینیؒ کی عمر چند مہینہ سے زیادہ نہیں تھی۔ امام کی والدہ بھی جو خود بھی ایک عالم گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں،

1.Hamid Algar "The Islamic Revolution Iran" Ansariyan publication, Qum,1981,p;38

نے ان کی پھوپھی کے ہمراہ امام کی سر پرستی کی ذمہ داری سنبھالی۔ کچھ مدت کے بعد امام کی پھوپھی بھی اس دنیا سے چلی گئیں۔ اگر چہ ان پے در پے مصائب نے امام کی روح کو آزردہ کیا لیکن وہ مشکلات اور طوفانوں کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔

امام زیرک، باہوش اور غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ بچپن ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھا اور پندرہ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے پاس، نحو اور منطق پڑھی۔ اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اراک چلے گئے اور اس شہر کے حوزہ علمیہ میں، جس کی سر پرستی آیت اللہ شیخ عبدالکریم حائری یزدی کرر ہے تھے، ماہر اساتذہ سے ادبیات پڑھنے میں مشغول ہوئے۔

۱۳۰۰ھ ق میں جب حوزہ علمیہ، قم منتقل ہوا تو امام بھی قم چلے آئے اور سطوح عالی کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد مرحوم آیت اللہ حائری کی خدمت میں علمی مدارج اور اپنی فقہی واصولی بنیادیں مستحکم کر کے اجتہاد کے درجہ پر فائز ہوئے۔

۱۳۱۵ ہجری قمری میں جب آیت اللہ حائری نے رحلت کی تو اس وقت امام ایک مضبوط، مستقل اور مستحکم علمی صلاحیت کے مالک تھے اور مجتہدین کے زمرہ میں قرار پائے تھے اور حوزہ علمیہ قم کے فاضل علماء میں شمار ہوتے تھے۔ امام خمینیؒ فقاہت میں ممتاز درجہ حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے علوم جیسے، ہیئت، فلسفہ اور عرفان میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، ان علوم میں انہوں نے آیت اللہ شیخ محمد علی شاہ آبادی جیسے اساتذہ سے مہارت حاصل کی تھی۔[۱]

تہذیب نفس اور خودسازی کے لحاظ سے امام خمینیؒ ابتدائے جوانی سے ہی علم وعمل کو ایک ساتھ حاصل کرتے رہے اور علوم اسلامی کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عمل بالخصوص انسانی اور روحانی فضائل حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی انہوں نے علمی اور روحانی شخصیتوں اور قم کی مذہبی محفلوں اور عام لوگوں کے درمیان ایک خاص مقام حاصل کیا تھا اور اپنے

۱۔ امام خمینیؒ کی زندگی کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لئے، سید حمید روحانی کی کتاب ''بررسی وتحلیلی از نہضت امام خمینی'' ج ۱، تہران آفسٹ ۱۳۶۱ ص ۹ تا ۶۷ مطالعہ فرمائیں۔

آپ کو ایسی نامناسب خصلتوں اور ان طریقہ کار سے دور رکھنے کی کوشش کی، جن سے بعض علماء دوچار تھے۔

امام خمینیؒ نے نظم وضبط کے لحاظ سے اپنی زندگی کو ایک خاص نظم کے تحت قرار دیا تھا کہ حقیقت میں مذہبی شخصیتوں میں اس جیسا نمونہ کمیاب ہے۔ ان کے آرام، عبادت، مطالعہ، تدریس اور چہل قدمی کا وقت ایک خاص صورت میں مرتب اور منظّم تھا، یہاں تک امام کے گھر کے افراد ان کے پروگرام کے مطابق اپنے پروگرام مرتب اور منظّم کرتے تھے۔

ان کی قابل ذکر خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کی بے نظیر سیاسی رہبری کی وجہ سے ایک ممتاز استاد، ایک فلاسفر اور عارف کی حیثیت سے ان کی شخصیت مدھم ہوگئی۔ ماڈرن مسلمانوں میں یہ طرز تفکر پایا جاتا ہے کہ ایک فلاسفر یا عارف کی ذہنیت معاشرہ کے حوادث سے دور ہوتی ہے اور وہ ہر قسم کی سیاسی واجتماعی ذمہ داری سنبھالنے سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی صرف ذہنی مسائل، مسلمانوں اور عالم اسلام میں موجود مسائل سے حقیقی اور عینی ربط نہیں رکھتے ہیں۔ لیکن امام خمینیؒ کی زندگی مذکورہ دو طرز عمل کے آپس میں روابط کے امکان کی ایک واضح دلیل اور اس حقیقت کی گویا ہے کہ ان کا پروگرام صرف ایک سیاسی اور سوق الجیشی حرکت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ بنیادی طور پر ایک الٰہی نظریہ پر مبنی تھا۔ امام کے اخلاقی اور روحانی اوصاف نے انھیں نمایاں اور واضح خصوصیات کے مالک ایک مثالی مسلمان کی حیثیت سے ایک عظیم انسان بنایا۔ امام کم نظیر انقلابی رہبروں میں سے ایک تھے، وہ ہر قسم کے عیش وعشرت سے دور، انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور بالکل معمولی کھانا کھاتے تھے۔

حوزہ علمیہ قم میں انہوں نے سب سے پہلے فلسفہ وعرفان پر تدریس کرنا شروع کیا۔ ان کے درس میں طلاب کی بڑی تعداد شرکت کرتی تھی۔ انہوں نے متن اور متون کے حاشیہ کی صورت میں بہت ساری کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے اکثر ان کے اپنے حکم سے شائع نہیں ہوئی ہیں۔ انہوں نے فقہ کے موضوع پر بھی کئی کتابیں تالیف کی ہیں۔

۱۳۲۳ھ ق میں امام خمینیؒ نے حکمی زادہ کی کتاب ''اسرار ہزار سالہ'' کے جواب میں ''کشف اسرار'' نامی ایک کتاب لکھی۔ امام نے اس کتاب میں رضا خان کی حکومت پر کھلم کھلا تنقید کی اور خاص کر اس کے بیرونی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم ہونے پر حملہ کیا۔

امام کا حکومت کے ساتھ برتاؤ، نا قابل سازش اور تند تھا۔ امام کا یہ رویہ نہ صرف پہلوی حکومت کی نظر میں نا قابل معاف تھا بلکہ حوزہ علمیہ قم کی بہت سی شخصیتوں کے لئے بھی ناپسند تھا۔ کیونکہ حوزہ علمیہ قم پوری طاقت کے باوجود ابتداء میں اپنے وجود کے تحفظ کے لئے کوشش کرتا تھا۔ آیت اللہ بروجردی کی مکمل مرجعیت کے زمانہ میں، امام ان کے قریبی مشاوروں میں شمار ہوتے تھے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مرحوم آیت اللہ بروجردی کے مشاورین میں امام کے نظریات ضروری طور پر مؤثر ہوں۔ جب تک آیت اللہ بروجردی زندہ تھے، امام براہ راست ایک سیاسی۔ مذہبی شخصیت کی حیثیت سے پہچانے نہیں گئے۔ یہاں تک آیت اللہ بروجردی کی رحلت اور اس کے چند ماہ بعد مرحوم آیت اللہ کاشانی کی وفات کے بعد شاہ نے اپنا رخ کچھ دوسرے انداز سے بدلا۔ وہ موجودہ خلا سے استفادہ کر کے کچھ ایسے اقدامات انجام دینا چاہتا تھا جو خلاف شرع و مذہب تھے۔ ان نازک اور حساس لمحوں میں امام خمینیؒ میدان میں اُتر آئے اور ریاستی و شہری انجمنوں کے قانون[1] کی کھلم کھلا مخالفت کے ضمن میں شاہ کی حکومت کے خلاف بلاخوف مبارزہ کا آغاز کر دیا۔ جب پند و نصائح مؤثر ثابت نہ ہوئے تو امام نے شاہ کی حکومت پر کھلم کھلا حملہ اور بلا واسطہ تنقید کر کے تقیہ کی سنت کو توڑ دیا اور تقیہ کے حرام ہونے اور اظہار حق کے واجب ہونے کا اپنا تاریخی فتویٰ ''ولو بلغ ما بلغ'' صادر کیا۔[2] اس دن سے امام کا سیاسی قائدانہ چہرہ آشکار ہوا اور امام نے اپنے خاص برتاؤ، یعنی دشمن سے فیصلہ کن صورت میں نا قابل سازش مقابلہ، پر مبنی اپنے راستہ کو دوسروں سے جدا کیا اور بڑی تیزی کے ساتھ عام لوگوں کے افکار کو اپنی طرف مائل کر لیا، جو اس قسم کی رہبری کے پیاسے تھے۔

۱۔ اس قانون کی بناء پر حکومت نے کچھ تبدیلیاں ایجاد کی تھیں جو خلاف شرع تھیں، من جملہ انجمنوں میں منتخب ہونے والوں کے لئے مسلمان ہونا حذف کیا گیا تھا اور قرآن مجید کی قسم کے بجائے ہر آسمانی کتاب کی قسم کھانا معتبر جانا گیا تھا۔

۲۔ صحیفہ نور ج ۱ ص ۴۰

بعد والے حوادث نے ثابت کر دیا کہ ایران کے سیاسی، اجتماعی میدان میں امام خمینیؒ کے رہبر کے عنوان سے ظاہر ہوتے ہی ایران اور شیعہ مبارز روحانیت کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل گیا اگر ہم ایک صدی پیچھے چلے جائیں، تو روحانیت مبارز کے ارتقائی سفر کو واضح طور پر مشاہدہ کر سکتے ہیں جو اپنے واحد مقصد کا تحفظ کئے ہوئے مختلف طریقہ کاروں کے ذریعہ سرانجام تک پہنچا ہے۔ ان سب کا مقصد شریعت اسلام کا نفاذ، عدل الٰہی کی حکومت کا قیام، غیروں اور سامراجی طاقتوں کا اثر ورسوخ ختم کرنا تھا۔

سید جمال الدین اسد آبادی نے اس مقصد تک پہنچنے کے لئے اسلامی ممالک کے حکام کو عالم اسلام میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کے لئے نصیحت، ہدایت اور تشویق کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی اور کوشش کر رہے تھے کہ ایران کے بادشاہ، سلاطین عثمانیہ اور مصری خدیوؤں کی نصیحت کر کے انھیں مغربی تمدن کی ویران کن ثقافتی یلغار کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب وتمدن کو پھر سے مستحکم کر کے اس میں پناہ لینے پر مجبور کرے۔

مشروطیّت کی ابتداء میں بادشاہوں سے دوری اختیار کرنے والے علماء دو حصوں میں تقسیم ہوئے:

ان کا ایک گروہ مرحوم بہبہانی اور طباطبائی جیسے علماء، خودخواہ بادشاہوں کی طاقت کو محدود کرنے کی فکر میں تھے تا کہ جمہوری نظام کی ضمانت حاصل کر کے مجتہدین کو نظارت کا حق دیا جائے اور امید رکھتے تھے کہ اس طرح خلاف شرع قوانین کے نفاذ کو روکا جا سکے گا۔ لیکن سرانجام اس گروہ نے میدان کو مغرب نواز طاقتوں کے حوالہ کر کے خود کنارہ کشی اختیار کی۔

دوسرا گروہ، مرحوم شیخ فضل اللہ نوری جیسے لوگ جو، غیر اسلامی تفکر کے رائج ہونے سے فکر مند تھے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے کوشش کرتے تھے۔ شیخ فضل اللہ نوری نے اس گروہ کے نمونہ کے طور پر اس مقصد کے لئے سرانجام اپنی جان نچھاور کی۔

مرحوم آیت اللہ کاشانی نے آزادی حاصل کرنے اور غیروں کا تسلّط ختم کرنے کے لئے اس

امید میں قوم پرستوں کی ہمراہی اور حمایت کا راستہ اختیار کیا، کہ بعد میں اپنی کوشش اور حمایت میں اسلامی قوانین پر مبنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن وہ اس سے غافل تھے کہ قوم پرست انھیں اور فدائیان اسلام کو کبھی اس قسم کا موقع نہیں دیں گے اور حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے روحانیت سے صرف ایک سیڑھی کے مانند استفادہ کریں گے۔

امام خمینیؒ جنہوں نے روحانیت مبارز کے تجربہ سے بھری ایک تاریخ کا مشاہدہ کیا تھا، نے رہبری کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اس بات کی اجازت نہیں دی کہ دوسرے، من جملہ لیبرل، رہبری اور لوگوں کے مبارزات کے فوائد میں شریک ہو جائیں۔ امام خمینیؒ کے مبارزہ کا طریقہ کار بہت سادہ اور آج کل کی سیاست بازی کے پیچ وخم سے عاری تھا۔ انہوں نے شروع سے ہی اپنے مقصد کو، کامیابی اور اپنے اور لوگوں کے مطالبات کو حاصل کرنے میں نہیں بلکہ اپنا شرعی فریضہ انجام دینے میں قرار دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم صرف اپنی تکلیف الٰہی انجام دیتے ہیں، کامیاب ہو جائیں یا مارے جائیں دونوں صورتوں میں ہم فاتح ہیں۔ مبارزہ کا یہ طریقہ کار ان لوگوں کے لئے بہت ناپسند تھا، جنھوں نے سالہا سال ملکیا والی سیاسی طرز کی عادت ڈالی تھی اور اپنے اجتماعی مبارزوں اور سیاسی معاملات میں مغربی طرز کی سیاسی حکمت عملی کو پسند کرتے تھے۔ اس قسم کے طریقہ کار کو اپنانا نہ صرف حکومت اور ان کے مخالفین کو غصہ دلاتا تھا بلکہ خود امام کے حامیوں اور ساتھیوں کے لئے بھی تعجب آور تھا۔

اسی لئے امام نے منضبط ارکان پر مشتمل کوئی منظم پارٹی تشکیل نہیں دی اور اسی طرح پہلے سے کوئی منظم پروگرام نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف اپنی ذہانت اور پرکشش شخصیت سے استفادہ کر کے نعروں، اسلام کے واضح معیاروں اور اپنے فیصلہ کن ارادہ کے سہارے ایک مثالی اسلامی معاشرہ تک پہنچنے کے لئے ضروری حکمت عملی پر عمل کرتے تھے۔

معاشرہ کے مختلف طبقوں اور عوام سے رابطہ برقرار کرنے کے سلسلہ میں امام ایک خاص ذہانت کے مالک تھے کہ اس قسم کی خصوصیت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ایک بہت سادہ اور سبھی کے لئے

قابل فہم کلام سے ان پڑھ لوگوں تک کو پیچیدہ ترین سیاسی۔اجتماعی مسائل سمجھاتے تھے اور اپنے بیان سے مومن اور معتقد انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اثر ڈالتے تھے۔اس بات کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اسلامی انقلاب میں امام خمینیؒ کی رہبری اور مبارزہ کا طریقہ کار، صدر اسلام سے شروع ہوئی ایک طولانی تاریخی سنت کا نتیجہ تھا۔امام نے قرآن مجید، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی سنّت کی معرفت حاصل کر کے اور عالم اسلام، بالخصوص ایران کے سیاسی، اجتماعی تبدیلیوں کی تاریخی تحقیق اور اسی طرح زمان معاصر کے سیاسی۔اجتماعی حالات کا مطالعہ کر کے اپنے مبارزہ کے طریقہ کار کو منتخب کیا تھا۔سب سے پہلے اس راستہ میں موجود رکاوٹوں، من جملہ تقیہ، کو ہٹا دیا ، پھر اپنا ابتدائی مقصد سلطنت کے غیر شرعی ہونے کا اعلان اور مرکز فساد کے خلاف مبارزہ اور بلاخوف حملہ قرار دیا اور اس کے بعد آخری مقصد یعنی حکومت اسلامی کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے، تمام دباؤ اور سازش وصلح کی کوششوں کے باوجود کامیابی سے ہمکنار ہونے تک ثابت قدمی اور پائداری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔امام خمینیؒ کی رہبری کے زمانہ کو چار مختلف مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا مرحلہ: یہ وہ زمانہ ہے جس میں امام خمینیؒ ایک سیاسی، مذہبی رہبر کی حیثیت سے ابھرے اور لوگوں میں فوری طور پر مقبول ہوئے۔یہ مرحلہ، ریاستی اور شہری انجمنوں کے قانون کے خلاف امام کے اعلان سے شروع ہوا اور اس کا عروج عاشور کے دن امام کی تقریر، ان کی گرفتاری اور ۱۵ خرداد کا قیام تھا۔یہ مرحلہ امام کی طرف سے ''کیپٹیلیشن'' قانون کی سخت مخالفت کے نتیجہ میں ان کو ترکیہ میں جلاوطن کئے جانے پر ختم ہوا۔[۱]

امام نے اپنے مبارزہ کے اس مرحلہ میں حسب ذیل چار بنیادی کام انجام دئے:

۱۔تقیہ کو حرام کرنا: برسوں سے مطلق العنان اور خودخواہ حکومتوں کے خلاف لوگوں کے مبارزہ اور مخالفت کے سلسلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سازشی عناصر کا ہتھیار ''تقیہ'' تھا جسے امام نے

۱۔اس سلسلہ میں کتاب ''مواضع نہضت آزادی در برابر انقلاب اسلامی'' ص ۱۲۴ ملاحظہ ہو۔

راستہ سے ہٹا دیا۔

۲۔ امام نے تحریک اور مبارزہ کو مذہبی سرگرمیوں کے مرکز یعنی حوزہ علمیہ قم میں پہنچا کر، دین کے سیاست سے جدا ہونے کی تھیوری پر ہمیشہ کے لئے خط بطلان کھینچ دیا، کہ اس کی ترویج کے لئے بہت زیادہ تبلیغ اور کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں تک امام نے ایسے افراد کو بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور کیا جو اس کام کو کراہت سمجھتے تھے اور اس طرح حوزہ علمیہ پر حاکم دیرینہ سنت کو توڑ دیا۔

۳۔ امام نے فساد کے اصلی مرکز یعنی سلطنت اور شاہ کے خلاف اپنے حملوں میں شدت پیدا کر کے مبارزہ کے قدامت پسندانہ طریقہ کار کو خاتمہ بخشا۔ اس سے پہلے حکومت کے مخالفین بالخصوص لیبرل، یہاں تک بعض مذہبی مبارزین بھی شاہ کے اطرافیوں پر حملہ کر کے شاہ اور سلطنت پر براہ راست حملہ کرنے سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح شاہ کے اطرافیوں، من جملہ وزیر اعظم اور حکومت کے ارکان کی تنقید کر کے خود شاہ اور سلطنت کو جرم وخطا سے مبرّا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

امام خمینیؒ نے پہلوی سلطنت کی قانونی حیثیت پر کھلم کھلا اعتراض کر کے ہر قسم کی قدامت پسندی کو مٹا دیا اور سلطنت کے درباری اور خود شاہ کو تمام مفاسد کا اصلی مجرم قرار دیا اور اسی کو اپنے مبارزہ کا مرکز قرار دے کر دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کی جرأت اور ہمت بخش دی:

''صرف خدا جانتا ہے کہ ایران کی سلطنت نے اپنے پیدائش کے آغاز سے کیسے کیسے جرائم اور ظلم وستم انجام دئے ہیں۔ بادشاہوں کے مظالم نے ہماری پوری تاریخ کو سیاہ کر دیا ہے۔ کیا یہ بادشاہ نہیں تھے جو لوگوں کے قتل عام کا حکم دیتے تھے اور معمولی فکر کئے بغیر سر تن سے جدا کرنے کا کا حکم دے دیتے تھے؟ پیغمبر اسلام (ص) کی نظر میں لفظ ملک الملوک خدا کے نزدیک حد درجہ نفرت انگیز لفظ ہے اسلام کے اصول سلطنت کے مخالف ہیں۔ ایران کے شاہنشاہی محلوں کو اڑا دو۔ سلطنت ایک شرمناک اور پست ترین رجعت پرستی ہے![1]

۱۔ بریر، کلر و بلانشہ ''ایران، انقلاب بنام خدا'' ترجمہ قاسم صنعوی، ص ۱۳

۴۔امام نے تمام بیرونی بڑی طاقتوں، اُن میں سرفہرست امریکہ کے خلاف براہ راست حملہ کر کے اس سے پہلے، بالخصوص مشروطہ تحریک اور تیل کو قومیانے کے دوران رائج ہر قسم کی سیاسی احتیاط اور لحاظ کو مسترد کر کے مبارزہ کا بالکل نیا طریقہ اپنا لیا۔مشروطہ تحریک کے دوران ،مشروطہ کے طالب، انگلستان کی سفارت میں دھرنا دے کر انگلستان کی حکومت کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کا نتیجہ فراماسونریوں کی حاکمیت تھی جو ملت ایران کی تقدیر پر مسلط ہوئی۔تیل کو قومیانے کی تحریک کے دوران، ڈاکٹر مصدق کے بقول دو بڑی طاقتوں کے درمیان منافع پر اختلاف ہو جانے سے استفادہ کیا گیا۔یعنی امریکی حکومت کی مدد سے تیل کو قومیایا گیا اور کچھ دن بعد امریکہ اور انگلستان کی حکومتوں نے ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کے سازش کی نتیجہ میں نہ صرف ایران کی تیل کی صنعت بلکہ پورے ایران پر ۲۵ سال تک تسلط جمایا۔

امام خمینیؒ گزشتہ تجربوں سے حاصل کی گئی صحیح اور دقیق پہچان کے پیش نظر اور اُن کے معروف قول:''امریکہ انگلستان سے بدتر ہے، انگلستان امریکہ سے بدتر ہے اور سویت یونین ان دونوں سے بدتر ہے یہ سب ایک دوسرے سے ناپاک تر ہیں، لیکن آج ہمارا سروکار ان خبیثوں میں سے امریکہ خبیث کے ساتھ ہے۔'' کہ جس نے بیرونی سیاست سے وابستہ افراد کے ہر قسم کے اثر ونفوذ کے راستہ کو مسدود کر کے رکھدیا تا کہ دوسرے لوگ تحریک میں شرکت کر کے لوگوں کے مبارزات کے پھل کو اپنے لئے مخصوص نہ کر سکیں۔

امام، ایک خاص مقام ومنزلت، یعنی مرجعیت کے مالک تھے جو ان کے بیانات اور نظریات کو مذہبی مشروعیت بخشتی تھی۔انہوں نے، باوجود اس کے کہ شاہ کی حکومت مرحوم آیت اللہ بروجردی کی وفات کے بعد مرجعیت کو ایران سے باہر منتقل کرنے کی کوشش میں تھی، بڑی تیزی سے لوگوں کی عام مقبولیت حاصل کر کے یہ مقام حاصل کیا۔امام نے یأس وناامیدی کے عالم میں نئے ایران کے مذہبی، سیاسی رہبر کے عنوان سے عہدہ سنبھالتے ہی مجاہدت کے پیاسے انسانوں کے قلب وروح میں نور امید کی ایک کرن پیدا کر دی۔تمام لوگوں نے اپنی گمشدہ چیز پالی اور اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو

اپنے نئے رہبر کے بیانات اور تحریروں میں محسوس کرلیا۔

دوسرا مرحلہ: امام کی رہبری کا یہ مرحلہ ایک طولانی مدت کا پندرہ سال پر مشتمل دور تھا۔ کیپٹیولیشن قانون، جو ایران میں مقیم امریکیوں کے حق میں پاس کیا گیا تھا، کے خلاف امام کی شعلہ بیان تقریر کے نتیجہ میں انھیں ترکیہ جلاوطن کیا گیا۔ مبارزہ کا یہ دور اسی نقطہ سے شروع ہوا اور ان کے نجف سے پیرس عزیمت کرنے پر اختتام کو پہنچا۔ اس مدت کے دوران، اگر چہ امام کبھی کبھی اقتضائے زمان اور ایران میں رونما ہونے والے حوادث اور اتفاقات کے پیش نظر، اپنے اعلانیہ، فتووں اور تقریروں کے ذریعہ حکومت کی مخالفت کرتے رہے، بلکہ لوگوں کے ساتھ اپنے معنوی رابطہ کو برقرار رکھتے ہوئے اس مدت میں ان کی ہدایت اور راہنمائی کرتے رہے۔ لیکن اس مدت کے دوران امام نے جو اہم کام انجام دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے انقلاب کا نظریہ پیش کرنے کی حیثیت سے اپنے فقہی درس کے ضمن میں حکومت اسلامی یا ولایت فقیہ کے مباحث بھی شروع کئے۔ اس طرح ایک متبادل نظام کا نظریہ پیش کر کے اس وقت تک اسلامی حکومت کے بارے میں ابہام رکھنے والوں کے لئے واضح کر دیا کہ وہ کس قسم کے معاشرہ اور حکومت کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلی فصل میں بیان ہوا، کہ انقلاب کا رہبر حسب ذیل تین صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے: انقلاب کا نظریہ پیش کرنے والا، کمانڈر یا انقلاب کا سورما اور آخر کار معمار یا انقلابی حکومت کا سربراہ۔ امام نے اس مرحلہ میں انقلاب کا نظریہ پیش کرنے والے کی حیثیت سے احسن طریقہ کو

اپنا کر اُس پر عمل کیا۔ اگر چہ انقلاب کا نظریہ مکتب اسلام کے مطابق اس کے اصلی ماخذ اور منابع، یعنی قرآن مجید، سنت اور احادیث کی بنیاد پر شک وشبہہ نہیں رکھتا تھا، لیکن چونکہ اسلامی حکومت کے عینی اور حقیقی صورت میں قائم ہونے کو چودہ صدیاں گزر چکی تھیں، اور خاص کر امام مہدی (عج) کی غیبت کے گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران رونما ہوئی عظیم تبدیلیوں کے پیش نظر، لوگوں کے لئے واضح نہیں تھا، کہ سلطنتی حکومت کے کھنڈرات پر تشکیل پانے والی اسلامی حکومت کیسی حکومت ہوگی اور مختلف مسائل بالخصوص عصر حاضر کے رونما ہونے والے حوادث سے کیسے مقابلہ کیا جائے اور معلوم نہیں تھا کہ رہبر کو

منتخب کرنے کا طریقہ کار کیسا ہوگا اور کیا یہ حکومت بھی مغربی ڈیموکریسی اور دنیا کی رائج دوسری حکومتوں کے مانند ہوگی؟ ان حالات میں امام خمینیؒ نے ولایت فقیہ کے اصول بیان کئے اور اسلامی حکومت کا اصلی ڈھانچہ معین کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

تیسرا مرحلہ: امام کی رہبری کا یہ مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب جنوری ۱۹۷۷ء میں انقلاب کی پہلی چنگاری قم میں شعلہ ور ہوئی اور تھوڑی ہی مدت میں آگ کے خطرناک شعلوں کی صورت اختیار کر کے حکومت کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر ۲۵۰۰ سالہ طولانی شہنشاہی نظام کو ہمیشہ کے لئے خاکستر بنادیا۔

اس مرحلہ میں امام نے مناسب فرصت کی تشخیص اور لوگوں کی بیداری اور حرکت کے پیش نظر تاخیر اور پس وپیش کو ناجائز جانتے ہوئے انقلاب کی رہبری اور کمان کے پرچم کو ہاتھ میں لے لیا۔ ہر قسم کی سازش اور مصلحت اندیشی سے پرہیز کیا۔ لوگوں کے اپنے مطالبات منوانے کے لئے جذبات اور ایثار وقربانی کے ساتھ مظاہروں میں شرکت کر کے حکومت کے مامورین سے ٹکر لینے کو امام نے صحیح معنوں میں درک کر کے اپنے غیر متزلزل اور راسخ عزم وارادہ کا اعلان کیا اور شاہ کی حکومت کی سرنگوں ہونے تک اسے جاری رکھا۔

امام کے فرانس چلے جانے اور ان کے عاشقوں کی ان تک رسائی ممکن ہونے کی وجہ سے ''نوفل لوشاتو'' (پیرس میں امام کی رہائش گاہ) رہبر انقلاب کے ایرانی مشتاقوں کے لئے زیارت گاہ بن گئی، بلکہ ایک مدت کے لئے یہ جگہ ایران کا دوسرا دار الخلافہ یا دوسرے الفاظ میں حقیقی دار الخلافہ بن گیا۔ یہاں پر اسلامی انقلاب بیان کے مرحلہ سے عمل میں تبدیل ہوا اور شاہ کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔

امام نے اس مرحلہ میں رہبری اور آخر کار انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے جس طریقہ کار کو اپنایا، وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ان تمام موقع پرست افراد کو دا اپنے نزدیک آنے سے روکا، جو سیاسی سوجھ بوجھ کے تحت

قریب الوقوع کامیابی کا احساس کرتے اور امام کے نزدیک آنے کی کوشش کرتے تھے۔ امام نے اس سلسلہ میں فرمایا: ''میرا کوئی ترجمان نہیں ہے۔ ہم نے کسی سے معاہدہ اور سمجھوتا نہیں کیا ہے۔ جو بھی ہماری بات کرے وہ ہمارے ساتھ اور لوگوں کے ساتھ ہے۔'' اس طرح امام نے اپنی حیثیت اور انقلاب کے نتائج سے ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا سدباب کیا۔

۲۔ تحریک کے مقاصد کو تحقق بخشنے کی راہ میں مسائل کا سختی کے ساتھ مقابلہ، عدم سازش اور فیصلہ کن پالیسی اختیار کرنا۔ امام کی اس پالیسی نے بہت سے لیبرل اور میانہ رو افراد کی امام کو اعتدال پسند سیاست کو اپنانے پر مجبور کرنے کی کوششوں پر پانی پھیر دیا، جو مہدی بازرگان کے بقول قدم بہ قدم اور مورچہ بہ مورچہ سیاست کے قائل تھے۔ امام نے اپنی فیصلہ کن پالیسی کے تحت ان سب کو مسترد کر دیا اور مسلسل اعلان کیا کہ شاہ کو جانا چاہئے اور اس کی جگہ پر لوگوں کی مرضی کے مطابق اسلامی جمہوریہ قائم ہونی چاہئے۔

۳۔ پیرس میں امام کے لئے دنیا کے ذرائع ابلاغ تک پہنچ آسان تھی، امام نے اپنے پیغام کو دنیا والوں تک پہنچانے میں اس فرصت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ بوڑھاپے کی کمزوری کے باوجود امام روزانہ کئی اخباری اور ٹی۔وی کے انٹریو میں شرکت کرتے تھے اور اخباری نمائندوں کے گوناگوں سوالات کا جواب دیتے تھے۔ اس طرح امام انقلاب کے مقاصد کو عالمی سطح پر پھیلانے اور شاہ اور اس کے حامیوں کے خلاف مبارزہ کا بین الاقوامی سطح پر ایک اور باب کھولنے میں کامیاب ہوئے۔

امام نے لوگوں کے جوش و جذبہ اور ارادہ کی ایسی رہبری کی، جس کے نتیجہ میں بہت کم مدت کے اندر اسلحہ اور تشدّد کا سہارا لئے بغیر انقلاب کے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لوگوں کی تحریک جس قدر تیز تر ہوتی جا رہی تھی امام کی فطانت اور طاقت زیادہ سے زیادہ ظاہر ہوتی تھی اور اس کے عروج کا وقت وہ تھا جب شاہ ایران سے چلا گیا اور امام فاتحانہ طور پر ملت کی آغوش میں تشریف لائے اور انقلاب کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی اور نبض تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ سنیچر ۱۰ فروری

(۲۱ بہمن) کو امام نے حکومت وقت کی طرف سے جاری کیے گئے مارشل لا (کرفیو) کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ کی حکومت کی عمر کے آخری لمحات اور انقلاب کی کامیابی کا لمحہ آپہنچا۔

چوتھا مرحلہ: یہ مرحلہ امام کی رہبری کا حساس ترین اور مشکل ترین دور تھا یہ وہ دور تھا جس میں انقلاب کے رہبر کو معاشرے کے رہبر اور حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے طوفان کے بھنور میں پھنسی انقلاب کی کشتی کو امن و امان کے ساحل تک پہنچانا تھا، جبکہ طاغوت کی سیاسی و فوجی طاقت کا زوال آچکا تھا اور شاہ کی حکومت کے چنگل میں پھنسے، لاکھوں انسان آزاد ہو چکے تھے، ہر قسم کی افراتفری پیدا ہونے اور حالات کی رہبری کے کنٹرول سے خارج ہونے کے امکانات موجود تھے۔ ان حالات میں انقلاب کے رہبر کو غیر معمولی طاقت سے، عام لوگوں کے جذبات کو کنٹرول کرنے اور افراتفری کو روکنے کے ضمن میں ایک قابل اور قوی معمار کی حیثیت سے، پہلے سے مرتب کیے گئے منصوبہ کے تحت اسلامی حکومت کی جدید عمارت کو، سرنگوں ہوئی حکومت کے کھنڈرات پر تعمیر کرنا تھا۔

اس مرحلہ میں ہر قسم کی غفلت اور لاپروائی تازہ حاصل ہوئی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانے، انقلاب کے اصلی محرک یعنی لوگوں کے جوش و جذبہ میں کمزوری اور سستی پیدا ہونے یا انقلاب کے نتائج کو اس کے معین شدہ اصلی راستہ سے منحرف ہونے کا سبب بن سکتی تھی۔

امام خمینیؒ نے اس کے باوجود کہ شاہ کی حکومت کے خلاف مبارزہ کے سادہ اور واضح طریقہ کار پر عمل کیا تھا، آج کل کے زمانہ کی ہر قسم کی سیاست بازی سے پرہیز کی اور اس کی وجہ سے بہت سے تجزیہ نگاروں کے لئے یہ وہم و گمان پیدا ہوا تھا کہ، شاید امام شاہ کی حکومت کے خلاف مبارزہ اور اسے سرنگوں کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اس کے بعد حکومت اور نظام کو کنٹرول کرنے سے عاجز ہوں گے اور اس سلسلہ میں اکثر کام ماہرین اور تجربہ کاروں کو سونپ دیں گے۔ لیکن اس دفعہ بھی امام نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور خاص طاقت سے بہت سے تجزیہ نگاروں اور ماہرین کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور اس طرح ایک طرف سے تحریک اور گزشتہ حکومت کے بچے کھچے حامیوں کا پیچھا کر کے

شکست دینے اور نئے انقلاب دشمن عناصر کا صفایا کرنے میں لوگوں کے مبارزہ کی رہبری اور دوسری طرف سے سیاسی قیادت کو سنبھالنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔انہوں نے ناقابل توصیف ہمت و حوصلہ کی بنیاد پر، مواقع اور لوگوں کی آمادگی سے استفادہ کرکے، دنیا کے تمام انقلابوں کی نسبت بے نظیر سرعت کے ساتھ صرف ایک سال کے اندر کئی انتخابات، من جملہ جمہوری اسلامی کا ریفرنڈم، مجلس خبرگان کا انتخاب، صدر جمہوریہ کا انتخاب، پارلیمنٹ کا انتخاب اور ملک کے آئین پر ریفرنڈم کرا کے اسلامی نظام کی بنیادوں کو استحکام بخشا اور اس طرح انقلاب کے بعد معاشرہ کی تعمیر اور اس کا نظم و نسق چلانے میں اپنی بے مثال صلاحیت و توانائی کا مظاہرہ کیا۔

امام خمینیؒ نے انقلاب کی کامیابی سے اپنی رحلت تک، یعنی دس سال سے زیادہ مدت کے دوران اپنی رہبری سے نہ صرف ایران کے نئے اسلامی نظام کو مختلف سازشوں، انحرافات، خوفناک خطرات، جن میں سے ہر ایک، ایک سیاسی نظام کو سرنگوں کرنے کے لئے کافی تھا، سے بچایا، بلکہ بہت سے پیچیدہ نظریات اور فقہی مشکلات، جو نظام کو تعطل سے دوچار کر سکتے تھے، کو حل کر کے اپنے بعد انقلاب و نظام کو پائیداری اور دوام بخشنے کے اسباب فراہم کئے۔ان مسائل کے بارے میں آنے والی فصلوں میں مفصل بحث کریں گے۔

''کارل مارکس'' کے عقیدہ کے مطابق ''انسان اور سورما تاریخ کے پیداوار ہیں''یا ''ٹامس کارلایل'' کے بقول ''انسان اور سورما تاریخ ساز ہیں'' ایک الگ بحث ہے۔شاید اس کو یہاں پر بیان کرنا مناسب نہیں ہوگا، لیکن اسلامی انقلاب کے تکوینی سفر، بالخصوص امام خمینیؒ کی رہبری کی تحقیق کے دوران کہا جاسکتا ہے کہ امام خمینیؒ خود اسلام کی تاریخ کے معمار تھے بلکہ اسلامی انقلاب کی تاریخ کے بھی معمار تھے۔[۱]

۱۔ حسنین ہیکل نے امام خمینیؒ کو ایک ایسی شمع سے تشبیہ دی ہے جو جل رہی ہے اور بجھنے کے قریب ہے لیکن اس میں ہزار ایٹم بموں کی طاقت ہے۔عربی اخباروں نے ان کے بارے میں یوں لکھا ہے: ان الخمینی حیر الشرق وعج الغرب واحرج العرب وشغل العالم؟ بیشک خمینیؒ نے مشرق کو حیرت میں ڈال دیا، مغرب کو متزلزل کر کے رکھ دیا، عرب دنیا کو عجز و بے بسی سے دوچار کیا اور تمام دنیا والوں کو اپنی طرف مشغول کر دیا ہے۔

آئیڈیالوجی

جیسا کہ ہم نے پہلی فصل میں آئیڈیالوجی کی بحث کے تحت بیان کیا کہ رہبر کے اہم فرائض میں سے انقلابی نظریہ کو تدوین کر کے پیش کرنا ہے۔ انقلابی نظریہ کے اندر معاشرہ میں وسیع پیمانے پر مقبول ہونے کے لئے موجودہ نظام اور اس میں پائی جانی والی اقدار کو مسترد کر کے انقلابیوں کے سامنے ایک پسندیدہ مستقبل پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہئے۔ ایران میں موجودہ صدی کے اوائل سے تین مختلف نظریات موجود رہے ہیں جو معاشرہ کے مختلف گروہوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ یہ تین نظریات، نیشنلزم، سوشلزم اور اسلام پر مشتمل تھیں۔ ان کے مبلغین اپنے پسندیدہ معاشرہ کا خاکہ پیش کر کے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ پیروکاروں کو جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مغربیوں کے افکار کے مطابق، نیشنلزم یا قوم پرستی اس معنی میں ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت، جو مخصوص جغرافیائی سرحدوں کے اندر ایک خاص تاریخ، زبان، تمدن، ثقافت، آداب و رسوم کے تحت زندگی بسر کرتی ہو، اسے ایک اٹوٹ واحد کی بنیاد قرار دیا جائے اور جو کچھ اس واحد کے نفع اور مصلحت، حیثیت و اعتبار کے حق میں ہو، وہ اپنے اور دوست شمار ہوتے ہیں اور باقی سب اجنبی اور دشمن شمار ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں قومی احساس یا نیشنلزم، انسانوں کی ایک جماعت کے اندر ایک مشترک، شعور اور ضمیر کے احساس کا وجود ہے جو ایک سیاسی واحد یا ملت پر مشتمل ہو۔ اگرچہ اس نظریہ کا سرچشمہ مغربی لیبرل معاشرہ ہے، لیکن مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اس سے استعماری اور اجنبیوں کے نفوذ کے خلاف مقابلہ کے حربہ کے طور پر استفادہ کیا جاتا ہے۔

یہ آئیڈیالوجی، کافی حد تک روشن فکر، تعلیم یافتہ اور متوسط طبقوں کے لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ایران کی مشروطیت اور پیٹرول کی صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی تحریکوں پر بھی اس نظریہ کا غلبہ تھا اور اپنے مطلوب معیار اور اقدار کو پیش کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ لیکن یہ مکتب عوامی سطح پر کوئی پائدار مقام حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ نیشنلزم ایک طرف سے

لوگوں کے مذہبی عقائد سے تضاد رکھتا تھا اور مغربیوں کی نسلی بنیادوں پر قوم پرستی کی تعریف، اسلام میں کوئی جگہ نہیں رکھتی تھی اور دوسری طرف سے ایران کے معاشرہ کی خصوصیات نیشنلزم کے معیاروں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں، کیونکہ اکثر ایرانی جو آجکل ایرانی اور فارسی زبان ہیں اور اپنے آپ کو ایرانی جانتے ہیں، حقیقت میں، عرب، ترک یا مغل ہیں اسی طرح بہت سے عرب جو عربی ہونے کا دم بھرتے ہیں، حقیقت میں وہ ایرانی، ترک یا مغل نسل سے ہیں۔ اگر ہم ایرانی ہونے کا ایرانی نسل کے مطابق تعریف کریں اور آریا نسل والوں کو ایرانی قرار دیں تو ایرانی قوم کے اکثر لوگوں کو غیر ایرانی جاننا چاہئے اور اپنے بہت سے افتخارات سے دست بردار ہونا چاہئے۔ لیبرل ازم بھی اپنی غیر مذہبی ماہیت کی وجہ سے لوگوں میں کوئی پائدار مقام حاصل نہ کرسکا۔ اگر چہ، انقلاب کے بعد یہ مکتب فکر طولانی مدت تک ایک رقیب کی حیثیت سے باقی رہا۔

صرف سوشلزم، انقلابی آئیڈیالوجی کے طور پر تھا، جس نے روس کے انقلاب اکتوبر کے بعد انتہا پسند انقلابی جوانوں کو اپنی طرف جذب کیا تھا۔ اس آئیڈیالوجی نے روس کی ایران کے ساتھ ہمسائیگی کے سبب کافی اثر ڈالا اور اشتراکیوں نے اپنے پروپیگنڈہ کے طریقوں اور منظّم و مستحکم مخفی و علنی تنظیم سازی کے ذریعہ ایران کے معاشرہ میں موجود نظام کو بدل کر سوشلسٹ نظام کو برقرار کرنے کے اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس حرکت کی کوششیں تودہ پارٹی کی تشکیل اور اس کے نسبتاً طولانی تاریخ سے واضح ہوتی ہیں۔

یہ حرکت، کافی سرگرمیوں اور کوششوں کے باوجود درج ذیل وجوہات کی بناء پر ایران میں نیشنلزم کی نسبت بھی زیادہ ناکام رہی:

۱۔ اس تحریک کی الحادی ماہیت اور مادی بنیاد ایرانی معاشرہ کی طبیعت اور ایرانیوں کے راسخ مذ ہبی عقائد سے واقعی اختلاف رکھتی تھی اس لئے عام مقبولیت حاصل نہیں کرسکی۔

۲۔ اشتراکیوں کی ماسکو سے براہ راست وابستگی، ایران اور روس کے گزشتہ تلخ تاریخی روابط کے پیش نظر، اس بات کا سبب بنی کہ یہ لوگ نہ صرف غیر جانبدار اور آزاد نہ تھے بلکہ انھیں سوویت

یونین کی بین الاقوامی سیاست کے کٹھ پتلی کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔

لیکن اسلام ایک الٰہی مکتب کے عنوان سے معاشرہ کے مختلف طبقوں میں وسیع پیمانے پر لوگوں کے قلب وروح کی گہرائیوں میں تاریخی اثر ڈال چکا تھا۔ایران کے شہر ودیہات کے امیر وغریب ،مزدور، کاشتکار، ملازموں، طالب علموں اور روشن فکروں کے مختلف طبقوں کے لوگوں کی کم از کم نجی زندگی کے حالات اوران کے رسم ورواج پر مذہب حاکم تھا۔جس معاشرہ کی ۹۸ فیصدی آبادی روایتی طور پر مسلمان ہو اوران میں اکثر قرآن مجید کے احکام پر عقیدہ رکھتے اوران پر عمل کرتے ہوں، وہ اسلامی نظریہ کو سیاسی، اجتماعی تبدیلی لانے والے نظریہ اور انقلاب کے عنوان سے قبول کرنے کی زیادہ آمادگی رکھتے ہیں۔

جو خصوصیتیں اسلام کی آئیڈیالوجی کو دوسری تمام سیاسی مکاتب سے جدا کرتی اوراسے خاص مظہر اورامتیاز بخشتی ہیں، وہ اسلام کے تصور کائنات میں پوشیدہ ہیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔حقیقت اور وجود، مادہ اور طبیعت کے مساوی نہیں ہے۔(مادہ غیر مادی مطلق حقیقت کی ایک شعاع ہے)

۲۔مادی دنیا ایک ایسا وجود ہے جس کا سرچشمہ وجود اور حقیقت مطلق ہے، اس کا سرچشمہ، مدبر عالم اور حکیم وقادر ہے جو تمام طبیعی روابط وعوامل پر حاکم ہے اور تمام کائنات ،طبیعی عوامل حرکت، مادہ میں تاثیر وتاثر، سب خدائے متعال کے فعل اوراس کے ارادہ کے مظہر ہیں۔

۳۔الٰہی تصور کائنات میں کائنات خدا کی ولایت اور سرپرستی میں ہے اور مادّی مخلوقات خدائے متعال کی ولایت اور تدبیر کے تحت عیب سے کمال کی طرف حرکت کر رہی ہیں اور سبھی خدا کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

۴۔اس تصور کائنات میں انسان صرف مادی پہلو نہیں رکھتا ہے بلکہ معنوی پہلو بھی رکھتا ہے اور مطلق کمال یعنی خالق کائنات کی طرف حرکت میں ہے اوراس کا کمال لقا اللہ ہے۔

۵۔انسان ایک لافانی اور جاودانی مخلوق ہے اور موت سے فانی اور نابود نہیں ہوتا ہے۔اس کے

سامنے دوسری دنیا ہے، جس میں وہ اس دنیا کی زندگی کے اعمال کے آثار و نتائج پائے گا۔

۶۔انسان ایک آزاد، ذمہ دار اور بااختیار مخلوق ہے۔وہ اپنی ارتقائی حرکت کو آخر تک پہنچاتا ہے، چونکہ آزاد ہے، اس لئے اپنی حرکت کو کبھی اللہ کی طرف اور کبھی شیطان کی طرف اختیار کرتا ہے۔

۷۔اس دنیا کی زندگی، ایک ایسا مرحلہ ہے جس میں انسان کمال حاصل کرتا ہے اور اپنے عمل سے لافانی و جاودانی زندگی حاصل کرتا ہے۔[۱]

اس آئیڈیالوجی کا ایک انقلابی آئیڈیالوجی کے عنوان سے استفادہ کرنے میں پائے جانے والے بنیادی اعتراضات کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل مسائل کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔برسوں سے مغربی سامراج کے پروپیگنڈہ اور مسیحی دنیا میں پیش آنے والے حالات کے نتیجہ میں، عالم اسلام میں بھی یہ تصور کیا جاتا تھا کہ مذہب زمانہ کے پیچیدہ سیاسی۔اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کی توانائی نہیں رکھتا ہے۔اس پروپیگنڈہ نے مختلف طبقات یہاں تک کہ بعض روحانیوں اور مذہبی علماء کو بھی متاثر کیا تھا۔

۲۔اسلام کے پیش کردہ معاشرہ کے پسندیدہ کمال کا محقق ہونا چودہ صدی قبل سے تعلق رکھتا تھا اور بہت سے لوگوں کے لئے یہ قابل تصور نہیں تھا کہ اسلام کے احکام کو آج کے صنعتی ترقی یافتہ معاشرہ میں، یعنی ایٹمی دور میں عملی جامہ پہنانا ممکن ہوگا اور اسلام کے پاس عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا جواب ہوگا۔

۳۔اسلامی اصولوں میں سے بعض اصول، جیسے شیعوں میں تقیہ اور انتظار فرج اور اہل سنت میں ولی امر کی اطاعت کے اصول کے پیش نظر بہت سے لوگوں یہاں تک بعض معتقد مسلمانوں میں بھی یہ تصور مفقود ہو چکا تھا کہ معاشرہ پر حاکم اقتدار کو بدلنے میں ایک انقلابی آئیڈیالوجی کے عنوان سے اسلام سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔''ولایت فقیہ و حاکمیت ملت''، تالیف: طاہری خرم آبادی، ص ۱۸۔۱۹

مذکورہ رکاوٹوں کے پیش نظر، سید جمال الدین اسد آبادی، آیت اللہ نائینی، آیت اللہ نوری آیت اللہ مدرس، آیت اللہ کاشانی اور نواب صفوی کی رہبری میں اسلام کے فدائی جیسی شخصیتوں کی جدوجہد اور انتھک کوششوں کے باوجود، کہ بہت سے قومی مقاصد کو حاصل کرنے میں بنیادی کردار ادا کر چکے تھے۔ وہ اسلام کو عوام الناس بالخصوص انقلابی جوانوں کے عقائد میں انقلاب کی آئیڈیالوجی کے عنوان سے جان ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء میں رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ نے مذکورہ مشکلات کے بارے میں صحیح آگاہی کے ساتھ، رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے قدم اٹھایا اور لوگوں کے ذہنوں میں موجود توہمات سے مقابلہ کرنے اور اسلام کے نظریہ کو معاشرہ میں نئے طریقہ سے انقلاب کی مطلوب ترین آئیڈیالوجی کے عنوان سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔

امام خمینیؒ نے سب سے پہلے شیعوں کی مرجع تقلید کے حیثیت سے تقیہ کو حرام اور اظہار حق کو واجب قرار دیا (ولو بلغ ما بلغ)[۱] اور اس طرح، انقلاب کے راستہ میں موجود ایک بڑی رکاوٹ اور عافیت طلبوں کے بہانہ کو ہٹا دیا۔

امام نے اسی طرح ایک عظیم مرجع تقلید اور حوزہ علمیہ قم کے اصلی محور کی حیثیت سے مبارزہ کے پرچم کو ہاتھ میں لے کر سیاسی نظام پر حملہ کر کے دین کے سیاست سے جدا ہونے کے موضوع کو عملی طور پر باطل اور غلط ثابت کیا، اور اس کے ضمن میں، نجف اشرف میں اپنی جلاوطنی کے دوران پائی جانے والی فرصت سے استفادہ کرتے ہوئے، اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ کا نظریہ پیش کر کے، عصر حاضر میں ایک قابل عمل انقلابی آئیڈیالوجی کی حیثیت سے اسلام کے نظریہ میں ایک بنیادی تبدیلی ایجاد کی۔ انقلاب کی آئیڈیالوجی پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے موجودہ حاکمیت کا انکار کر کے اسے مسترد کرنا چاہئے اور نظام پر مسلط اقتدار پر اعتراض کرنا چاہئے، اور یہ وہی کام تھا جو رہبر انقلاب نے انقلاب کا نظریہ پیش کرنے والے کی حیثیت سے انجام دیا۔ برسوں سے مسلسل یہ تبلیغ کی گئی تھی کہ

۱۔ صحیفہ نور، ج ۱، ص ۴۰

سلطان خدا کا سایہ ہے اور سلطان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ یا یہ کہ سلطنت ایک الٰہی تحفہ ہے لیکن امام نے ان سب اقدار کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:

''ولایت عہدی اور اس کے مانند مسائل سے متعلق آئین کی یہ شق اور اس کا ضمیمہ کہاں اسلام سے مربوط ہے؟ یہ سب اسلام کے خلاف اور حکومت کے طریقہ کار اور احکام اسلام سے تناقص رکھتے ہیں۔ سلطنت اور ولی عہدی وہی چیز ہے، جسے اسلام نے مسترد کر کے صدر اسلام میں ہی ایران، مشرقی روم، مصر اور یمن میں اس کا خاتمہ کیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہ روم (ھراکلیوس) اور شاہنشاہ ایران کو لکھے گئے اپنے خطوط میں ان کو دعوت دی تھی کہ شاہنشاہی اور سلطنتی طرز حکومت سے پرہیز کریں اور اجازت دیدیں کہ لوگ خدائے یکتا اور لاشریک کی عبادت کریں، جو حقیقی سلطان ہے سلطنت اور ولی عہدی وہی منحوس اور باطل طرز حکومت ہے کہ جس کے خلاف حضرت سید الشہد اسلام اللہ علیہ نے قیام کیا اور شہید ہوئے۔''[۱]

اس طرح رہبر انقلاب نے پہلی بار، برسوں تک تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو تلقین کی گئی اور آئین[۲] کا جزو بنائی گئی اقدار کو باطل قرار دے کر مخالف اقدار اعلان کیا۔

رہبر انقلاب کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ کا نہ صرف پسندیدہ خاکہ پیش کرے بلکہ اس تک پہنچنے کا عملی طریقہ کار بھی دکھائے۔ اسلام کے عقیدتمندوں، جو قریب بہ اتفاق معاشرہ کو تشکیل دیتے تھے، کے لئے یہ بات قابل قبول تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین (شیعوں کی نظر میں خاص کر حضرت علی علیہ السلام) کے زمانہ میں قائم ہوئی اسلامی حکومت کمال کی حکومت اور آئندہ حکومت کے لئے نمونہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اہم بات یہ تھی کہ چودہ صدیوں

۱۔ امام خمینیؒ، ''ولایت فقیہ'' ص ۱۰۔۱۱

۲۔ ایران کا سابق آئین، شق ۳۵ ضمیمہ

کے بعد اور عصر حاضر کے معاشرہ کی پیچیدگیوں کے پیش نظر اس قسم کی حکومت کو کیسے اور کن اشخاص کے ذریعہ تشکیل دیا جائے۔

دوسری طرف سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس عقیدہ کے پیش نظر کہ، دنیا میں ظلم وفساد پُر ہونا چاہئے تا کہ مہدی موعود (عج) ظہور کر کے دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں اور اسلامی حکومت تشکیل دیں، غیبت کے زمانہ میں اس قسم کی حکومت تشکیل پانے کو مطلقاً ناممکن جانتے تھے اور اس قسم کی حکومت کے لئے کوشش کو خلاف شرع جانتے تھے۔

ایسے حالات میں رہبر انقلاب نے ولایت فقیہ کے فلسفہ کو پیش کر کے، ایک سادہ اور آسان لیکن استدلالی زبان میں قرآن واحادیث سے ثابت کیا کہ احکام الٰہی معطل نہیں ہو سکتے ہیں اور ہر حالت میں یہاں تک غیبت کبریٰ کے زمانہ میں بھی احکام الٰہی کو جاری کرنے سے پہلوتہی نہیں کی جاسکتی ہے اور یہ ذمہ داری فقہا اور علماء بالخصوص افقہ فقہا کے کاندھوں پر ہے۔ امام اس سلسلہ میں طلاب سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تم لوگ اس صورت میں اسلام کے خلفاء ہو کہ لوگوں کو اسلام سکھا دو گے اور یہ نہ کہو گے کہ چھوڑ دو تا کہ امام زمان (عج) تشریف لائیں۔ کیا تم نماز کو امام زمانہ (عج) کے آنے تک ترک کرتے ہو تا کہ ان کے آنے کے بعد پڑھ لو گے؟ اسلام کا تحفظ نماز سے بھی زیادہ واجب ہے۔ خمین کے حاکم کی منطق کو نہ اپنایئے جو یہ کہتا تھا کہ: گناہوں کو پھیلانا چاہئے تا کہ امام (عج) زمان آجائیں۔ اگر گناہ رائج نہ ہو جائیں تو حضرت (عج) ظہور نہیں کریں گے''۔[۱]

اسلامی معاشرہ کو چلانے کے لئے حاکم کے لئے دو بنیادی شرطیں ضروری ہیں:

اول یہ کہ احکام الٰہی کے بارے میں جامع اور مکمل آگاہی رکھتا ہو اور دوسری شرط یہ کہ مذکورہ احکام کو جاری کرنے میں عدالت سے کام لے۔ دوسرے الفاظ میں عادل فقیہ رسول خدا صلی

۱۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۷۵

اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے جانشین کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کی رہبری اور اسلامی احکام کو جاری کرنے کا ذمہ دار ہے اور ولی امر کے عنوان سے اس کی اطاعت، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے مانند واجب ہے۔ اسلامی نظام میں حاکم وولی امر کے بارے میں لوگوں کی رائے کا دخل صرف ولایت فقیہ کی اصل کو فی الفور وجود بخشنا اور اسے مرحلۂ اجرا میں لانا ہے۔ اس معنی میں کہ ولایت امر ایک ایسا مقام ہے جو اسے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت کے لئے لوگوں کی رائے شرط نہیں ہے، اگر چہ لوگ اس کو رہبری اور زعامت کی حیثیت سے قبول نہ کریں، لیکن ولایت کو حقیقت اور فعلیّت بخشنے کے لئے لوگوں کی رائے اور عام قبولیت ضروری ہے۔

دوسری جانب سے ممکن ہے ایک سے زیادہ افراد میں ولایت کے اوصاف اور شرائط موجود ہوں ،یعنی معاشرہ میں کئی عادل وصاحب بصیرت اور آگاہ فقیہ موجود ہوں تو ان میں سے بہر صورت ایک شخص کو قیادت ورہبری کی ذمہ داری سنبھالنی چاہئے۔ واضح ہے کہ ولایت ورہبری کی ذمہ داری کے لئے کئی افراد میں سے کسی ایک کو چننے کا عملی راستہ اکثریت کی رائے ہے کہ امامت وولایت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے ایک شخص کے منتخب ہونے کے بعد قہری طور پر دوسروں سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔[۱]

اس اصل کے پیش نظر رہبر انقلاب نے تین اہم مسائل کو انقلاب کے نصب العین کے طور پر معین کر کے پیش کیا:

۱۔ طاغوتی (شہنشاہی) حکومت کی سرنگونی۔

۲۔ اسلامی حکومت تشکیل دینے کی کوشش۔

۳۔ اصل ولایت فقیہ کو عملی کرنے سے ایسی حکومت کی ضمانت۔

امام خمینیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

۱۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۷۵

''ان اجتماعی وسیاسی حالات کے پیش نظر ایک مومن ومتقی انسان کے سامنے دوراستے ہیں۔ وہ ناچار ہے کہ ایسے اعمال انجام نہ دے اور طاغوتی احکام اور قوانین کی اطاعت نہ کرے بلکہ ان کی مخالفت کرے اور ان کا مقابلہ کرے تا کہ ان فاسد حالات کو بدل ڈالے۔ ہمارے لئے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ اس فاسد سسٹم کو نابود کر دیں۔ اور حاکم طبقہ کے خائن، فاسد اور ظالم گروہوں کو سرنگوں کریں۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جسے تمام ممالک کے ہر مسلمان کو انجام دینا چاہئے اور اسلام کے سیاسی انقلاب کو کامیاب بنادیں۔''۱

اور ہمیں اپنے اسلامی وطن کو سامراجی طاقتوں اور ان کی کٹھ پتلی حکومتوں سے نجات دلانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت تشکیل دیں۔۲

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

''آج ہم کیسے خاموش اور بیکار تماشائی بنیں کہ چند خائن اور حرام خوار اور اجنبیوں کے ایجنٹ، اجنبیوں کی مدد اور تلوار کی نوک پر لاکھوں مسلمانوں کی محنت سے حاصل کی گئی دولت کو لوٹ لیں اور کم از کم نعمتوں سے استفادہ کرنے کی اجازت نہ دیں۔ علمائے اسلام اور تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس ظالمانہ صورتحال کو ختم کر دیں اور اس راہ میں، جو کہ لاکھوں مسلمانوں کی سعادت کی راہ ہے، ظالم حکومتوں کو سرنگوں کر کے اسلامی حکومت تشکیل دیں۔''۳

اس کے بعد رہبر انقلاب موازنہ پر مبنی ایک تحقیق میں حکومت اسلامی کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

''اسلامی حکومت، موجودہ مختلف اقسام کی حکومتوں میں سے کسی ایک کے مانند نہیں ہے۔ مثال کے طور پر استبدادی حکومت نہیں ہے کہ حکومت کا سربراہ مطلق العنان اور خودخواہ ہو اور لوگوں کے مال وجان سے کھیل کر اپنی مرضی سے اس پر تصرف کرے، جسے چاہے

۱۔ طاہری خرم آبادی، پیشین، ص ۸۶

۲۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۳۵

۳۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۳۶

اسے قتل کر ڈالے اور جسے چاہے اسے انعام دیدے، جسے چاہے اسے جاگیر بخش دے اور ملّت کی ملک و مال کو مختلف لوگوں میں تقسیم کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام اور دیگر تمام خلفاء بھی اس قسم کے اختیارات نہیں رکھتے تھے۔ اسلامی حکومت نہ استبدادی ہے اور نہ مطلق العنان، بلکہ مشروط ہے، البتہ نہ عام اور آج کے متعارف معنی میں مشروط، کہ قوانین کو لوگوں کی اکثریت رائے پاس کرے۔ مشروط اس لحاظ سے ہے کہ حکومت چلانے والے نفاذ اور ادارہ کرنے میں شرائط کے ایک مجموعہ کے مقید ہوں جو قرآن مجید اور رسول اکرمؐ کی سنت میں معین ہوئے ہیں۔ ان شرائط کا مجموعہ وہی اسلام کے احکام اور قوانین ہیں کہ ان کی رعایت کی جانی چاہئے اور انھیں جاری کیا جانا چاہئے اس جہت سے اسلامی حکومت لوگوں پر قانون الٰہی کی حکومت ہے۔ اس قسم کی حکومت میں حاکمیت صرف خدا سے مربوط ہے۔"[1]

امام، مبارزہ کے طریقہ کار اور عدل اسلامی کی حکومت تک پہنچنے کے راز کو لوگوں کی اجتماعی اور انقلابی حرکت میں مضمر جانتے ہیں اور اس کام کے لئے سب سے پہلا فریضہ جو علماء کے لئے قائل ہیں، وہ لوگوں کو آگاہ کرنا ہے۔ وہ شروع میں، پرامن مبارزہ کے ضمن میں اجتماعی اعتراض کی سفارش کرتے تھے اور مسلحانہ جدوجہد کی نفی نہ کرنے کے ضمن میں مبارزہ کے آغاز کے لئے اس کی سفارش اور تجویز نہیں کرتے تھے:

"اگر ظالموں کی کسی خلاف ورزی یا ظلم کے مرتکب ہو جانے کے خلاف اجتماعی اعتراض کیا جائے، اگر تمام اسلامی ممالک سے کئی ہزار ٹیلیگرام انھیں بھیج دی جائیں کہ اس برے کام کو انجام نہ دیں تو یقیناً وہ ہاتھ کھینچ لیں گے۔ جب یہ لوگ اسلام اور لوگوں کی مصلحت کے خلاف کوئی کام انجام دیں یا کوئی تقریر کریں، تو اگر ملک کے تمام علاقوں، قصبوں اور گاؤں سے ان پر اعتراض کیا جائے، تو وہ فوری طور پر پیچھے ہٹیں گے، میں ان کو جانتا ہوں۔ میں

۱۔ امام خمینیؒ، "ولایت فقیہ"، ص ۳۸

پہچانتا کہ یہ کیسے ہیں۔ یہ بہت ڈرپوک ہیں اور بہت جلدی پسپا ہو جانے والے ہیں۔
لیکن جب دیکھتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ نااہل ہیں تو جست وخیز کرتے ہیں''۔[۱]

اس راستہ میں ہماری سب سے پہلی سرگرمی تبلیغات پر مشتمل ہے۔ ہمیں تبلیغات کے ذریعہ آگے بڑھنا چاہئے، ہمیشہ پہلے سے ہی فوج اور طاقت نہیں تھی بلکہ تبلیغات کی راہ سے آگے بڑھتے تھے۔ سرکشی زوروزبردستی کی مذمت کرتے تھے۔ ملت کو آگاہ کرتے تھے اور لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ سرکشی غلط ہے تبلیغ کا دامن رفتہ رفتہ وسیع ہوتا جاتا تھا اور معاشرہ کے تمام گروہ آگاہ ہو جاتے تھے۔ لوگ بیدار اور سرگرم ہوتے تھے اور نتیجہ پاتے تھے۔[۲]

تبلیغات اور تعلیم وتربیت ہماری دواہم سرگرمیاں ہیں۔ یہ فقہا کی ذمہ داری ہے کہ عقائد، احکام اور اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو تعلیم دیں۔[۳]

اس کے بعد امام سیاسی نظام کو کمزور کر کے اسے سرنگون کرنے کے لئے اپنے مبارزہ کی حکمت عملی کا پروگرام عینی صورت میں معین کرتے ہیں:

۱۔ ہمیں، حکومت کے اداروں سے اپنے روابط منقطع کر کے ان کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہئے۔

۲۔ ہمیں، ہر ایسے کام کو انجام دینے سے پرہیز کرنا چاہئے، جو ان کی مدد کا سبب بنے۔

۳۔ ہمیں عدلیہ، مالی، اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی ادارے تشکیل دینے چاہئے۔[۴]

اسی لئے سیاسی، اجتماعی تبدیلیوں کے سلسلہ میں، انقلاب کے بنیادی تین ارکان نے اپنی پوری ممکنہ طاقت سے، ہماھنگی اور انسجام کا کامیاب استفادہ کیا۔ اس طرح ایران کی مسلم امت نے غیر معمولی ذہانت کے مالک اپنے مرجع تقلید کی رہبری میں، اسلام کے عالمی اور حیات بخش پرچم تلے

۱۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۱۴۱

۲۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۱۵۱

۳۔ امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، ص ۱۵۲

۴۔ امام خمینیؒ، ولایت فاقیہ، ص ۱۷۹

میدان مبارزہ میں سرگرم اور وسیع پیمانے پر شرکت کر کے اسلامی انقلاب کی حیرت انگیز کامیابی کے اسباب فراہم کئے۔

یہ سوال کہ اسلامی انقلاب کی تحریک اور اس کے دوران رونما ہونے والے حوادث میں کن عوامل نے سرعت پیدا کی، ایک الگ بحث ہے، اس کے بارے میں آنے والی فصل میں وضاحت کی جائے گی۔

تیسری فصل:

انقلاب میں تیزی آنے کے عوامل

- کارٹر کے انسانی حقوق کا نفاد
- شاہ کے کینسر کی بیماری میں مبتلا ہونے کا انکشاف
- ملک کو تیزی سے ماڈرن کرنے کی شاہ کی کوشش
- توہین آمیز مقالہ کی اشاعت

انقلاب میں تیزی آنے کے عوامل

ہر انقلاب کی کامیابی کے بعد انقلاب کی تبدیلیوں کے تجزیہ نگاروں، یہاں تک کہ موافق ومخالف سیاسی گروہوں کی توجہ کو اپنی طرف جذب کرنے والے مسائل میں سے ایک مسئلہ، یہ ہوتا ہے کہ کونسا عامل یا عوامل سیاسی، اجتماعی تبدیلیوں اور حوادث کو سرعت بخشنے کا سبب بنے ہیں جس کا بالاخر نتیجہ انقلاب کی کامیابی ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کونسے عوامل امور کے شیرازہ کو بکھیر دینے اور حکمران نظام کے سسٹم کو درہم برہم کر کے سیاسی طاقت کے ہاتھ سے کنٹرول چھین کر اجتماعی طاقت کی تحریک کو بڑھاوا دینے کا سبب بنتے ہیں۔ اور طاقت اور انقلاب کی کامیابی کو سرعت بخشنے والا عامل کیا ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلی فصل میں بیان ہوا، مذکورہ عوامل کو سرعت بخشنے والے عوامل کہتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کی فوری اور غیر یقینی کامیابی کے بارے میں اب تک کافی بحث ہوئی ہے اور اس سلسلہ میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خاص کر مغربی دنیا اور بالخصوص امریکہ میں شاہ کی حکومت کی سرنگونی کے اصلی عوامل کی تشخیص اور پہچان کے لئے مختلف تجزیئے اور گوناگوں نظریات پیش کئے گئے ہیں اور وقت کے امریکی ذمہ داروں نے بھی اپنے دفاع میں اس زمانہ کی اپنی یادوں کو شائع کیا ہے۔ ان میں اس زمانہ کے امریکی صدر جمہور کارٹر، ملکی سلامتی کونسل کے مشاور برجینسکی، وزیر خارجہ ونس، تہران میں امریکی سفیر سولیوان، اور وائٹ ہاوس کے رئیس ہاملٹن جورڈن قابل ذکر ہیں۔ معدوم شاہ نے بھی اس سلسلہ میں کچھ مطالب تحریر کئے ہیں۔ جو کچھ ان مختلف نظریات اور گوناگوں استنباط سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر تجزیہ نگار اور ہر سیاسی گروہ نے، اپنے منظور نظر خاص عامل کو اصلی عامل کے طور پر پیش کرنے کے ضمن میں ثانوی اور فطری عوامل کے عنوان سے کئی دوسرے عوامل کے اثرات سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔

اب تک اس سلسلہ میں کئی نظریات پیش کئے جاچکے ہیں کہ، جس ملک کو وقت کے امریکی صدر

کارٹر جنوری ۱۹۷۸ء میں جزیرۂ امن وثبات اور اس کے حاکم کو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں سب سے طاقتور اور لائق حاکم کا خطاب ۱ دیا تھا، کیوں ایک ہی سال کے اندر اس طرح متلاطم اور دگرگوں ہوا کہ اس کا نتیجہ اسلامی انقلاب کی کامیابی تھا، جس کے بارے میں بہت سے لوگ ایران کے اندر اور باہر یقین نہیں کرتے تھے۔

ہر حادثہ اور سیاسی۔ اجتماعی تبدیلی کا فطری طور پر نسبتاً ایک مفصل تاریخی پس منظر ہوتا ہے کہ اس قسم کے تاریخی پس منظر کے بغیر اس کا واقع ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر بحث اس پر نہیں ہے کہ اسلامی انقلاب کا تاریخی پس منظر کس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ انقلاب کے فوری رونما ہونے کے عوامل قابل توجہ ہیں، کہ ناقابل اجتناب صورت میں ایک خاص اور معین تاریخ (یعنی ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) کو انقلاب کی کامیابی کا سبب بنے۔ اس سلسلہ میں دستیاب اسناد اور معلومات کے پیش نظر آج تک پیش کئے گئے مختلف نظریات اور تجزیوں کی بنیاد پر مندرجہ ذیل چار خاص عوامل ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔ کارٹر کے حقوق بشر کا نفاذ

۲۔ شاہ کے کینسر کا انکشاف

۳۔ ملک کو تیزی کے ساتھ ماڈرن کرنے کی شاہ کی کوشش

۴۔ روزنامہ اطلاعات میں رہبر انقلاب کے بارے میں توہین آمیز مقالہ کی اشاعت اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا۔

۱۔ کارٹر کے انسانی حقوق کا نفاذ

پہلا نظریہ اس بات کا قائل ہے کہ امریکی صدر جمہوریہ، کارٹر کا حقوق بشر کی حمایت میں سیاسی منصوبہ کے تحت تیسری دنیا میں امریکہ سے وابستہ مطلق العنان حکمرانوں، من جملہ شاہ ایران پر

۱۔ کارٹر نے جنوری ۱۹۷۸ء کی پہلی شب کو (شاہ کے زوال سے ایک سال قبل) اس کے اعزاز میں دی گئی ایک ضیافت میں شاہ کی تعریف وتمجید کرتے ہوئے مندرجہ ذیل جملات بیان کئے: ''ایران دنیا کے پر تلاطم ترین علاقہ میں ایک پر امن جزیرہ ہے۔ یہ آپ اعلیٰ حضرت کے لئے ایک عظیم فخر ومباہات ہے، جو آپ کی رہبری اور لوگوں کی طرف سے آپ کے تئیں احترام، عشق ومحبت کا مرہون منت ہے۔

دباؤ اس کے مخالفین کو کنٹرول کرنے کے دباؤ میں کمی واقع ہونے کا سبب بنا اور ایسے معاشروں میں کہ جس میں ابھی آزادی سے صحیح استفادہ کرنے کی آمادگی موجود نہیں تھی، لیبرل ازم کی سیاست طبیعی طرز زندگی اور ایران کے سیاسی نظام کے درہم برہم ہونے کا سبب بنی۔

یہ نظریہ، کہ اصولی طور پر امریکی لیبرل ازم کی طرف سے شاہ پر تھونپا گیا تھا، نہ صرف امریکہ میں بلکہ ایران کے اندر بھی اس کے بہت سے معتقد تھے۔ امریکہ میں، آزادی طلب اور قدامت پسند افراد، یہاں تک کہ بعض لبرلوں نے بھی اس نظریہ کو ایک اصل کے عنوان سے قبول کیا ہے کہ ایران کے بارے میں کارٹر حکومت کی طرف سے حقوق بشر لاگو کرنے کی پالیسی اور امریکہ کی گزشتہ حکومتوں کی پالیسی میں واضح تبدیلی، شاہ کے زوال کا اصلی سب تھا۔

ایران میں شاہ کے بعض حامی، یہاں تک لیبرلوں کی ایک بڑی تعداد، شاہ کے زوال کو کارٹر کے حقوق بشر کی پالیسی سے مربوط جانتے ہیں۔ یہ نادر مواقع میں سے ہے کہ ایران کے لیبرل امریکہ کے قدامت پسندوں سے متفق ہیں اور تمام اختلافات کے باوجود مشترکہ طور پر معتقد ہیں کہ کارٹر کی حقوق بشر کی پالیسی لاگو کئے بغیر، شاہ زوال سے دوچار نہیں ہوتا۔

ریگن کی حکومت کے دوران اقوام متحدہ میں امریکہ کے دائمی نمائندہ ''کرک پیٹرک'' نے کارٹر کی حکومت پر یہ الزام لگایا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں یوں کہتا ہے:

''کارٹر کی حکومت نے منظم شدہ گزشتہ پالیسیوں کو متوقف کر دیا اور حقوق بشر کے تحفظ کے مبارزات کے نام پر ایک نیا دور شروع کیا۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں عدم تداوم کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ دوست حکومتیں، دشمن حکومتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کارٹر کی حکومت غیر کمیونسٹ استبدادی حکومتوں کو سرنگوں کرنے میں سرگرم عمل ہونے کے باوجود کمیونسٹوں کے پھیلاؤ کے بارے میں بے خیال تھی۔ کارٹر کے حقوق بشر کی پالیسی کی پہلی قربانیاں شاہ ایران اور نیکاراگوئہ کا سوموزا تھیں۔[1]''

1.C.P.Loannides' America's Iran Injury and catharsis University Press of America'1984'pp.13.14

مہدی بازرگان بھی اس مسئلہ کی تائید میں لکھتا ہے:

''۱۳۵۶ھ ش (۱۹۷۸ء) کے آغاز میں مجاہدین اور قیدیوں ...... کی حمایت میں جو گستاخانہ اور مغرورانہ قدم اٹھایا گیا، وہ ''جمعیت ایرانی دفاع از آزادی وحقوق بشر'' (آزادی اور حقوق انسان کی مدافع ایرانی جمعیت) کے نام سے ایک ادارہ کی تاسیس تھی۔ اس ادارہ نے حکومت امریکہ کی ''حقوق بشر'' کی نئی پالیسی سے خوب استفادہ کیا۔ امریکہ نے اس نئی پالیسی کو اپنی مصلحتوں کی بنا پر اور دنیا میں سوویت یونین سے رقابت کے لئے اپنایا تھا اور اسی عنوان سے شاہ پر دباؤ ڈالا گیا تا کہ گھٹن اور شدت کو کم کر کے آزادی اور حقوق ملت کی رعایت کرے۔ اس طرح امریکہ نے اپنے لئے نسبتاً ایک تحفظ اور بے سابقہ عملی اعتبار سے محدود رفاہ حاصل کیا......''

اس کے بعد وہ اپنے نظریہ کی تائید میں اضافہ کرتا ہے:

''کیسنجر نے اپنی بعد والی یادداشتوں میں ایران میں حقوق بشر لاگو کرنے کو کارٹر کی امریکہ کے خلاف خیانتوں میں سے ایک خیانت اور شاہ کے زوال اور انقلاب کی کامیابی کا عامل بیان کیا تھا''[۱]۔

یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں، پہلا سوال یہ کہ کیا شائع شدہ اسناد اور مدارک کے پیش نظر شاہ پر دباؤ ڈالنے اور لیبرل سیاست کو زبردستی تھوپنے کی کوئی دلیل موجود ہے؟ اور دوسرا سوال یہ کہ اس قسم کی پالیسی سے کس پارٹی یا گروہ کو فائدہ ملا ہے اور کون لوگ ان سے وابستہ تھے؟

پہلے سوال کے بارے میں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اس قسم کے دباؤ کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ثابت کرنے کے لئے کافی شواہد اور قرائن موجود ہیں۔ اس معنیٰ کے پروگرام کا کارٹر کے حقوق بشر کے پروگرام سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور حقیقت میں کارٹر کی حکومت نے حقوق بشر کے کلی اصول کے اجرا کرنے میں ایران کو مستثنیٰ قرار دیا تھا۔

۱۔ مھدی بازرگان ''انقلاب ایران در دو حرکت نہضت آزادی ایران'' ۱۳۶۳ھ ش (۱۹۸۴ء) ص ۲۵

ایران میں اس وقت کا برطانوی سفیر آنٹونی پارسنز یوں رقمطراز ہے:

''بہت سے لوگ کہتے تھے کہ یہ آزادی، کارٹر کی حکومت کی طرف سے شاہ پر ڈالے گئے براہ راست دباؤ کا نتیجہ ہے...... میں نے اس نظریہ کو اس وقت قبول نہیں کیا اور آج بھی قبول نہیں کرتا ہوں۔ حقیقت میں آزادی کی پہلی کرن ۱۹۷۶ء کے اواخر میں، یعنی کارٹر کے صدر جمہوریہ کے عہدہ پر فائز ہونے سے دو یا تین مہینے پہلے، نظر آتی ہے۔ مجھے اس میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہیں ہے کہ شاہ نے اپنی معمول کی موقع پرستی سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کی طرف سے انسانی اور جمہوری نقطہ نظر کا اظہار، امریکی صدر جمہوریہ کی نظروں میں اسے محبوب بنانے کا سبب بنے۔[۱]''

ویلیم سولیوان اپنی یادوں میں لکھتا ہے کہ جب ایران میں امریکی سفیر کے عنوان سے پہلی بار وہ امریکہ کے صدر جمہوریہ کارٹر سے ملاقات کرنے کے لئے گیا، تاکہ ایران کے بارے میں امریکی صدر کی ہدایت کو سنے، وہ انتہائی حیرت سے مشاہدہ کرتا ہے کہ صرف جس چیز کے بارے میں کارٹر نے ذکر اور اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، وہ ایران میں حقوق بشر کی رعایت کا مسئلہ تھا۔ وہ یوں کہتا ہے:

''ایران روانہ ہونے کے موقع پر کارٹر سے ملاقات کے دوران، امریکہ اور ہمارے مغربی اتحادیوں کے لئے ایران کی سوق الجیشی حیثیت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے بعد اس نے شاہ کو ایک قریبی دوست اور امریکہ کے لئے قابل اعتماد اتحادی کے عنوان سے یاد کیا اور گرم جوشی کے ساتھ اس کی حمایت کی۔ اسی طرح کارٹر نے ایران کی اہمیت کو خلیج فارس کے حساس علاقہ کی امن وسلامتی کے لئے ایک عامل کے عنوان سے دوبارہ تاکید کی اور آخر میں پٹرول کی قیمت کے موضوع اور ایران وامریکہ کے درمیان تمام ضروری مسائل کا ذکر کیا اور مجھ سے چاہا کہ اگر کوئی سوال ہو تو پوچھ لوں۔[۲]''

۱۔ ''غرور سقوط''، ص ۸۹

۲۔ ''ایران میں مأموریت''، ص ۱۴۔۱۶

سولیوان مشاہدہ کرتا ہے کہ باوجود اس کے کہ کارٹر حقوق بشر کا نعرہ بلند کر کے وائٹ ہاؤس میں داخل ہوا تھا اور اپنی انتخابی مہم کے دوران جمہوری پارٹی کے گزشتہ تمام صدر جمہوریہ پر تنقید کرتے ہوئے ان کی شاہ کی حمایت اور ایران کی مطلق العنان حکومت کو اسلحہ بیچنے کی طرف اشارہ کرتا تھا، اس وقت اس موضوع کی طرف کسی قسم کا اشارہ نہیں کرتا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں کارٹر کے نظریہ کے بارے میں حیرت کے ساتھ سوال کرتا ہے۔ کارٹر بددلی سے جواب دیتا ہے:

''البتہ حقوق بشر کے بارے میں چند مسائل ہیں اور اس (سولیوان) سے چاہا کہ بادشاہ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کے ضمن میں اسے اس سلسلہ میں اپنی کلی پالیسی بدلنے پر قائل کرے۔[1]''

اس سے اہم نکتہ یہ ہے کہ کارٹر نے وعدہ کیا تھا کہ تمام ممالک کے ساتھ اپنے اقتصادی اور سیاسی روابط اور عسکری اور امن وسلامتی سے متعلق پالیسی کو اس ملک میں حقوق بشر کی رعایت کے مطابق استوار کرے۔ جبکہ دکھائی دیتا ہے کہ مذکورہ روابط کے سلسلہ میں کارٹر کی حکومت میں اس بنیادی پالیسی سے چشم پوشی کر کے اسے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

فوجی خدمات اور تبادلوں کو صرف نظر کرتے ہوئے دوسرے میدانوں میں، جیسے اقتصاد کے تبادلہ کے سلسلہ میں، مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ایران میں امریکہ کی درآمدات ہر زمانہ سے زیادہ تھیں۔ کارٹر کی حکومت میں امریکہ کی طرف سے ایران کو برآمد کی جانے والی اشیاء کی قیمت ۳ ارب ۶ کروڑ ڈالر تک پہنچ گئی تھی، اس کے علاوہ کارٹر نے پانچ ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنے کے لئے شاہ کے ساتھ کئی ارب ڈالروں کی قرارداد پر دستخط کی تھی۔ اس نے مذکورہ قرارداد پر دستخط کرتے وقت کہا تھا:

''ہم نے ایران کے ساتھ ایٹمی قرارداد پر دستخط کی تو امریکی صنعتوں کے لئے اربوں ڈالر کی آمدنی اور امریکی عوام کے لئے فراوان مشغلوں کا سبب بنا، جبکہ ہم نے جوہری ہتھیار کے عدم توسیع کی اپنی پالیسی کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔''

یہاں پر صرف جس چیز کی طرف کارٹر اشارہ نہیں کرتا ہے، وہ ایران میں حقوق بشر کی رعایت ہے۔

۱۔ ''ایران میں ماموریت'' ص ۱۴۔۱۶

فوجی اسلحہ بیچنے کے سلسلہ میں، کارٹر نے شاہ کو راضی کرنے میں اپنے پیش رو امریکی صدر فورڈ اور نکس پر بھی سبقت حاصل کی۔ کارٹر کی حکومت کے پہلے سال کے دوران ایران کو اسلحہ سپلائی کرنے کی حد عالی ترین درجہ (دو ارب چار کروڑ ڈالر) تک پہنچی۔ اس کے علاوہ جنوری ۱۹۷۷ء سے دسمبر ۱۹۷۸ء تک ایران کو دئے گئے فوجی اسلحہ کی سالانہ اوسط رقم، صدر فورڈ اور صدر نکس کے زمانہ کی سالانہ اوسط رقم سے زیادہ تھی۔[۱]

ایران کو اسلحہ فروخت کرنے کے سلسلہ میں جو بحثیں حکومت کے ذمہ داروں اور پارلیمنٹ کے نمائندوں کے درمیان ہوئی ہیں، وہ قابل توجہ اور شاہ کی حکومت کے بارے میں کارٹر حکومت کی حقیقی پالیسی کی گویا ہیں۔ ان بحثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی نئی حکومت میں ایران اور امریکہ کے درمیان روابط میں گزشتہ حکومتوں کی نسبت بالکل کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نئی حکومت میں ایران کو، آواکس نام کے جاسوسی ہوائی جہاز بیچنے کا مسئلہ کارٹر کی حقوق بشر کی تھیوری کے تجربہ کی انتہائی مناسب فرصت تھی۔ جب امریکی سینٹ کی خارجی تعلقات کی کمیٹی کے مذاکرات میں وزارت خارجہ کے نمائندہ ''آلفورڈ آٹرٹن'' اور وزارت دفاع کے نمائندہ ''اریک ون مربوڈ'' سے سوال کیا گیا کہ کیا کارٹر کی حکومت نے اسلحہ بیچنے اور ایران میں حقوق بشر کے درمیان کوئی رابطہ برقرار کیا ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں کسی قسم کا شک وشبہہ باقی نہ رکھا۔ ایران کو اسلحہ بیچنے کے مسئلہ کے بارے میں ،کارٹر کی حکومت کا گزشتہ پالیسی میں تبدیلی لانے کا بالکل کوئی ارادہ نہیں تھا اور ایران مذکورہ دو پالیسیوں کو آپس میں ربط دینے سے مستثنیٰ ہے۔[۲]

ایک قبرسی الاصل محقق ''کریستوس خواندیس''، جو انقلاب کے دوران کچھ مدت تک ایران میں تھا، امریکہ میں موجود اسناد ومدارک اور ایران میں امریکی سفارت میں کشف وشائع شدہ اسناد کی

1.Loannides'Opcit'pp,pp,17.23

2.Ibid'pp'17.23

وسیع پیمانہ پر تحقیق کرنے کے بعد یوں نتیجہ اعلان کرتا ہے:

''کارٹر کا حقوق بشر نہ شاہ کے دربار میں کارٹر کا مخفی نفوذی تھا اور نہ انقلاب رونما ہونے کا اصلی عامل شمار ہوتا تھا۔ انقلاب دیر یا زود، کارٹر کے حقوق بشر سے یا اس کے بغیر رونما ہوتا ہے۔ حقیقت میں اس کا سرچشمہ ایران کے معاشرہ کا اندورونی تضاد تھا، یہ تضاد امریکہ کے ایران میں ۲۵ سال کے رول کے نتیجہ میں مزید بڑھ گیا تھا اور بظاہر ایک پائیدار اور مستحکم حکومت کو درہم برہم کرکے اسے اصلی ترین عوامی انقلاب کے طوفان میں غرق کردیا۔۱''

البتہ اس بات سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ کارٹر کی حقوق بشر کی حمایت کی وجہ سے دسمبر ۱۹۷۷ء سے ایران کے لیبرلوں اور مغرب پرستوں کے درمیان ایک جوش وجذبہ پیدا ہوا تھا اور پارٹیاں، مراکز اور کمیٹیاں تشکیل پائیں۔ کھلے خطوط اور تند وتیز مقالے لکھے گئے۔ سب یہ امید باندھے ہوئے تھے کہ سیاسی آزادی کے ماحول سے استفادہ کرکے امریکہ کی مدد سے لیبرل پارٹی قدرت ہاتھ میں لے کر امریکہ کے ساتھ روابط کو تحفظ بخشنے کے ضمن میں، ان کی امداد سے ایک اصلاحی تبدیلی رونما ہوجائے۔

ان گروہوں میں معروف ترین گروہ کے عنوان سے ''جمعیت طرفداران آزادی'' کا نام لیا جاسکتا ہے، کہ اس کی اجرائی انتخابی کمیٹی کے اراکین، مھدی بازرگان، حسن نزیہ، عبدالکریم لاہیجی، علی اصغر حاج سید جوادی اور انجینئر مقدم مرغہ ای تھے۔ انہوں نے سیاسی آزادی کی فضا میں مقالہ لکھنے اور تقریریں کرنے کی فرصت پائی اور داخلی وخارجی ذرائع ابلاغ ان کو لوگوں میں اثر رسوخ رکھنے والے گروہ اور حکومت کے سرسخت مخالفین کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔ علی اصغر حاج سید جوادی ان میں انتہا پسند ترین فرد تھا؛ کچھ لوگوں نے گوتہ انسٹیچوٹ کی دعوت پر ''قلم کاروں کے مراکز'' کے عنوان سے ایران۔ جرمنی کلب کے باغ میں ایک خارجی ملک کے سایہ میں ''شبہائے شعر'' تشکیل دئے۔

1.Ibid, PP, 36

خوانڈلیس کے بقول، کارٹر کا حقوق بشر، شاہ کے مخالفین میں سے صرف بعض لوگوں، یعنی لیبرلوں کے لئے اہمیت کا حامل تھا۔ مخالف لیبرلوں کے ذریعہ حقوق بشر کا دم بھرنا ان کے لئے ایک ملک میں اسے عملی کرنے کا مواقع فراہم کیا جو پہلے ہی ایک انقلابی مرحلہ میں داخل ہو چکا تھا، ان کا یہ کام صرف حکومت کو مزید غیر قانونی کرنے کی راہ میں معاون ثابت ہوا۔ لیکن جو کردار مخالف لیبرلوں نے انقلاب میں ادا کیا وہ ایک ثانوی رول تھا۔ بنیادی رول بازار اور نچلے طبقوں کے توسط سے ادا ہو تھا اور علماء سے ہدایات اور رہبری پانے والے ان طبقات میں، مخالف لیبرل کوئی خاص محبوبیت نہیں رکھتے تھے۔ ان طبقات اور علماء کے لئے، کارٹر کا حقوق بشر اور شاہ کی لیبر لائزیشن کرنے کی پالیسی، اعتراض وشکایت کرنے کی حد میں ایک ضمنی مسئلہ سے مربوط تھی [1]!

مھدی بازرگان، ''حامد الگار'' کو دئے گئے اپنے ایک انٹریو میں، کارٹر کے حقوق بشر سے استفادہ کرنے کے طریقہ کار کے بارے میں لیبرلوں کا نصب العین بیان کرتے ہوئے یوں کہتا ہے:

''جب شریف امامی وزیر اعظم تھا، کارٹر کے حقوق بشر سے استفادہ کر کے واقعاً کچھ آزادیاں دی گئی تھیں اور یہ ممکن ہو سکا تھا کہ دو آدمی آپس میں مل بیٹھ کر بات کریں اور کوشش کریں......اس وقت انتخابات پر بحث تھی کہ ہم اس میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ تحریک آزادی اور دوسرے تمام لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ چناؤ ایک نعمت الٰہی ہے۔ جب حکومت اس مرحلہ میں پہنچی ہے اور کہتی ہے کہ ہم انتخابات کی آزادی دینا چاہتے ہیں۔ تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟......اب یا چناؤ ہوں گے، اور اس طرف سے، یعنی مخالف محاذ، خواہ علماء، خواہ قوم پرست، خواہ تحریک آزادی، خواہ فلاں پارٹی و......دس بیس آدمی پارلیمنٹ میں داخل ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔ اگر کوئی پارلیمنٹ میں داخل نہ ہو سکا تو پھر ان کو یہیں پر رسوا کریں گے۔ کہیں گے جناب کارٹر! جناب امریکہ! تمھارا حقوق بشر جھوٹ تھا'' [2]

1.Ibid, P36

۲۔ ''نہضت زنان مسلمان''، انقلاب اسلامی کے بارے میں نہضت آزادی کی پالیسی ۱۹۸۳، ص ۱۲۸

۲۔ شاہ کے کینسر کا انکشاف

حوادث میں سرعت پیدا ہو کر انقلاب کی تحریک کا حکومت کے کنٹرول سے خارج ہونے کے بارے میں دوسرا نظریہ شاہ کے بیمار ہونے اور اس کے کینسر میں مبتلا ہونے سے مربوط ہے۔ ۱۹۷۴ء (۱۳۵۳ھ ش) میں شاہ نے اپنے ایک تفریحی سفر میں اسکیٹنگ کے دوران اپنے معدہ میں ایک غدود کا احساس کیا۔ دو فرانسیسی سپیشلسٹ ڈاکٹروں کے معائنہ کے بعد تشخیص دیا گیا کہ شاہ ''لنفیٹک گلینڈ'' کے کینسر میں مبتلا ہے۔ اس وقت سے شاہ کو کیمیکل معالجہ کے تحت قرار دیا گیا۔ شاہ نے اپنے نفسیاتی کمزوری کے پیش نظر اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کوئی اس کی بیماری سے آگاہ ہو۔ یہاں تک اس کی جڑواں بہن اشرف پہلوی بھی بظاہر اس مسئلہ سے آگاہ نہیں تھی۔[1]

جبکہ شاہ کی ذہنیت اور فیصلوں میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ امریکی جاسوسی ایجنسی cia بھی اس مسئلہ سے آگاہ نہیں تھی، باوجود اس کے کہ وہ شاہ کی ذہنیت اور حالات سے مربوط مسائل پر مکمل کنٹرول رکھتی تھی۔ شاہ کی ذہنیت پر اس بیماری کے اثرات پر دو طرح کی تحقیق کی گئی ہے:

ا۔ شاہ نے اس آگاہی کے پیش نظر کہ اب زیادہ دن تک زندہ نہیں رہے گا، فیصلہ کیا تھا کہ اپنی زندگی یا موت کے وقت اقتدار اپنے بیٹے کو منتقل کرنے کے لئے ایران کے سیاسی ماحول کو سازگار بنادے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ باوجود اس کے تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں، اس کی عدم موجودگی میں اس کے اقتدار کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اس کے باپ کے استعفٰی کے زمانہ کی طرح اس کے بیٹے کے لئے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گے کہ شاید انھیں کنٹرول کرنے میں برسوں لگ جائیں گے۔ وہ اپنے اعترافات میں اس مطلب کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

---

1. Marvim Zonis, opcit, P606

''میں اپنی زندگی میں مناسب وقت پر ثقافت و اقتصاد کو وسعت بخش کر سلطنت اپنے بیٹے کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ میں خونریزی اور سختی سے اس مقصد کو حاصل نہیں کرسکتا تھا۔''[۱]

۲۔اس بیماری نے جو دوسرا اثر شاہ پر ڈالا ،وہ مسکّن اور نشہ آور دوائیوں کا اثر تھا۔(یہ دوائیاں استعمال کرنے والے کو اس کے ارادہ میں ایک قسم کا تزلزل اور فیصلہ لینے کی طاقت میں کمزوری پیدا کرتی ہیں) یہ اثر اسے تقدیر اور قسمت پر اپنے گزشتہ عقائد میں زیادہ سے زیادہ راسخ بنا دیتا تھا۔[۲]

ایک اور مسئلہ جس کی طرف ''برجنسکی'' نے بھی اشارہ کیا ہے کہ جو اس کے لئے تکلیف دہ تھا، وہ شاہ کی سختی سے پیش آنے کے لئے فیصلہ کرنے میں اس کی عدم توانائی تھی۔اس (برجنسکی) نے شاہ کی حمایت سے اس وقت ہاتھ کھینچ لیا، جب وہ شاہ کی ذہنیت کے پیش نظر اس کی حکومت کے دوام کے بارے میں مایوس ہو چکا تھا۔وہ من جملہ ان لوگوں میں سے ہے، جو شاہ کے زوال کے فوری اور اصلی عامل کو فیصلہ لینے میں اس کی مذکورہ کمزوری جانتے ہیں، وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ کارٹر کی طرف سے مخالفوں کی سرکوبی کی کھلی حمایت کے باوجود، شاہ مسکّن اور نشہ آور دوائیوں کے استعمال کی وجہ سے شدت عمل کا مظاہرہ نہ کرسکا۔

برجنسکی نے ہارورڈ یونیورسٹی کے تاریخ کے سابقہ پروفیسر ''کرین برنٹن'' کہ جس نے انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی یورپ میں رونما ہونے والے تاریخ کی عظیم انقلابی تحریکوں کے ضمن میں تحقیق کی تھی، سے نتیجہ حاصل کیا ہے کہ ہر انقلاب کی کامیابی کا سبب، انقلابی افراد کی قدرت اور عزم سے زیادہ حاکم طاقت کی کمزوری اور پسپائی کا نتیجہ ہوتا ہے اور جو بھی حکومت انقلابیوں کے مقابلہ میں سختی سے پیش آئی ہے اور کسی شک وشبہہ اور تزلزل کے بغیر ان کا مقابلہ کیا ہے، وہ انقلاب کو شکست دینے میں کامیاب ہوئی ہے۔اور اس کے برعکس جن حکومتوں نے انقلابیوں کے ساتھ سازش کی اور انھیں آرام کرنے کے لئے پسپائی اختیار کی ،انہوں نے انقلابیوں کو ہر رعایت دیکر زیادہ

۱۔''اعترافات شاہ'' ص۲۱

۲۔''اعترافات شاہ'' ص۸۷

گستاخ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے اور سرانجام خودسرنگوں ہوئی ہیں۔

مذکورہ نظریہ پر استناد کر کے "برجنسکی" شاہ کی نجات کا تنہا راستہ تشدّد اور خونریزی کو جانتا تھا۔ لیکن شاہ، جو ایک مہلک بیماری کی تکلیف اٹھا رہا تھا، اور اپنی موت کو نزدیک دیکھ رہا تھا، اس قسم کا فیصلہ لینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔[1] لہذا اس نظریہ کے حامی عقیدہ رکھتے ہیں کہ چونکہ شاہ ۱۹۶۳ء کی طرح سختی سے دشمنوں کا مقابلہ نہ کر سکا، اور مخالفوں کو رعایتیں دینے لگا، نتیجہ میں اس مقدر سے دوچار ہوا۔

اس نظریہ کی بھی گزشتہ نظریہ کی طرح کوئی مستحکم بنیاد نہیں ہے۔ کیونکہ شاہ بنیادی طور پر ایک کمزور اعتماد کا مالک انسان تھا اور صرف بڑی طاقتوں کی حمایت اس کو فرضی ہمت دلاتی اور طاقت بخشتی تھی۔ اس دوران بھی اپنی حکومت کے آخری لمحات تک بڑی طاقتوں کی مکمل حمایت کے بل بوتے پر چل رہا تھا۔

دوسری جانب سے شاہ نے بڑی طاقتوں کے اغراض و مقاصد اور مطالبات کو پورا کرنے کے لئے بھی تشدّد اور خونریزی سے کام لینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ ۱۹۷۸ء کے پورے سال کے دوران ایران کے لوگوں پر کوئی دن اور کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا، کہ جب کچھ بے گناہ لوگ خاک و خون میں غلطان نہ ہوتے ہوں۔ ۱۹ اگست ۱۹۷۸ء کو آبادان کے ریکس سینما کا حادثہ اور اس سے بدتر اسی سال کے ۸ ستمبر کے "جمعہ سیاہ" کے حادثہ نے ۵ جون ۱۹۶۳ء کی یاد تازہ کر دی، شاہ کے من جملہ مظالم میں سے ہے کہ شاہ نے اس دوران اپنی پولیس اور مسلح افواج کی مدد سے ہزاروں افراد کا قتل عام کیا۔

۳۔ ملک کو تیزی کے ساتھ ماڈرن کرنے کی شاہ کی کوشش

شاہ کے حامیوں اور طرفداروں کی طرف سے ایک اور نظریہ جو پیش کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ نظریہ اس کی حمایت کرتے ہوئے اس کی غلطیوں کا اقرار ہے، نہ اس کے گناہوں کا اور وہ یہ ہے

۱۔ مہربانی کر کے کارٹر کی کتاب "شاہ کا زوال" "تازہ روایت" تالیف مائیکل لیڈن، ولیم لوئیس، ترجمہ ناصر ایرانی ۱۹۹۲ء، امیر کبیر ص ۶۷ کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح ولیم فوربیس کی تالیف "تخت طاؤس کا زوال" ترجمہ منوچہر مھر جو، کتاب "اعترافات شاہ" ص ۸۰۔

کہ چونکہ شاہ ملک کا خدمت گزار اور ہمدرد تھا اور ملک کی پسماندگی کی فوری تلافی کر کے ایران کو عظیم تمدن کے دہانے پر پہنچانا چاہتا تھا۔ ایران کو ماڈرن بنانے کی پالیسی کو جاری کرنے کے لئے، جو ملک ابھی مکمل طور پر اپنی روایتی زندگی سے گزر رہا تھا، فوری اور جلد بازی میں عمل کرنے لگا، چونکہ ایران کا روایتی معاشرہ ان تمام پروجیکٹوں کو بہت کم مدت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے پیچیدہ مشکلات سے دوچار ہوا، جس کے نتیجہ میں بدامنی اور ناراضگیاں وجود میں آ گئیں اور اس طرح نظام کے زوال کے اسباب فراہم ہو گئے۔ خود شاہ اس سلسلہ میں کہتا ہے:

''میں اپنے ملک کی صدیوں پرانی پسماندگی کو ایک ۲۵ سالہ پروگرام کے تحت فوری طور پر تلافی کرنا چاہتا تھا۔ تمام مشکلات اس پروگرام کو سرعت اور جلد بازی کے ساتھ عملی کرنے میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس فوری پروگرام کو جاری کرنے کے لئے ہمیں ایک اضطراری دورہ کی ضرورت تھی۔[۱]''

شاہ کی حکومت کے آخری ایام کے دوران ایران میں برطانیہ کا سفیر ''انتونی پارسنز'' بھی اس عقیدہ کا حامی ہے، وہ اس سلسلہ میں یوں لکھتا ہے:

''میں اس (شاہ) کے ساتھ اپنی بحث و گفتگو کے دوران مسلسل اس نکتہ پر تاکید کرتا تھا کہ عام لوگوں کے جذبات کا شدید اور ناگہانی سیلاب اس کے اس پندرہ سالہ دباؤ کا نتیجہ ہے جو وہ ایران کو ماڈرن بنانے کے لئے لوگوں پر ڈال رہا ہے۔ کیونکہ اس ماڈرن کرنے کی پالیسی نے ایران کے روایتی لوگوں کو پائمال کیا تھا اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کو وجود میں لایا تھا اور ملک کے غریب باشندوں کو ناگفتہ بہ حالات سے دوچار کیا تھا۔ لہذا اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ لوگوں کے جذبات مخالفت کی لہروں میں تبدیل ہو گئے۔[۲]''

اس نظریہ کے بے بنیاد ہونے اور شاہ کے ماڈرنائزیشن کی پالیسی کا بے مفہوم اور اندر سے کھوکھلا ہونے کے بارے میں کسی کو شک وشبہہ نہیں ہے۔ شاہ کی حکومت کے آخری دس سالوں کے

۱۔ ''اعترافات شاہ''، ص ۱۲، ۲۔ ''شاہ کا غرور اور زوال''، ص ۱۵۰
۲۔ ''شاہ کا غرور اور زوال''، ص ۱۵۰

دوراں رونما ہونے والے واقعات اور حوادث خود ہی، اس نظریہ کو مسترد کرنے کی ایک قوی دلیل ہے۔

اس کے باوجود کہ پیٹرول کی آمدنی کئی گنا بڑھ کر بیس ارب ڈالر تک پہنچ گئی تھی، لیکن یہ اضافی آمدنی ایک جگہ اور ملک کے خزانہ میں جمع کرنے کے بجائے مغربی بلاک سے مربوط بینکوں کو قابل تمدید قرضوں اور عملی طور پر غیر معینہ عرصہ کے لون کی صورت میں دینے، امریکہ اور یورپ کے دیوالیہ ہوئے کارخانوں کے حصوں کی خریداری اور اس سے بدتر اندھا دھند صورت میں فوجی اسلحہ اور ایٹمی رایکٹر خریدنے میں خرچ کی جاتی تھی۔ یہ سب سخاوت مندی اور غریب نوازی ایک ایسے ملک میں انجام پاتی تھی، جس کے اکثر گاؤں ہسپتالوں، ڈاکٹروں، مدرسوں، ٹرینگ سنٹروں، ذرائع ابلاغ، بجلی اور حفظان صحت جیسی زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم تھے۔ پٹرول کی باقیماندہ آمدنی بھی کسی قومی منصوبہ بند پروگرام کے بغیر فضول خرچی پر مبنی ایک اقتصادی سسٹم اور داخلی ساز و باز اور اکثر بے حساب بینک قرضوں اور فرضی وفرمائشی لون کی صورت میں پہلوی فاونڈیشن کی کمپنیوں، سلطنت کے خاندان یا ان سے وابستہ ایسے افراد کو دی جاتی تھی جو اسمبلنگ کی غیر ملکی صنعتوں کو ایجاد کرنے کے نام پر اسے خورد برد کرتے تھے۔

ملک کی کھیتی باڑی اور حیوانات پروری کی صنعت کو ایک منظّم منصوبہ کے تحت نابود کیا گیا تھا، اور پٹرول کی آمدنی سے بچی رقم کو، امریکہ سے گیہوں، تھائیلینڈ سے چاول، پاکستان سے پیاز، ہندوستان سے آلو، جنوبی افریقہ سے موسمی، ہالینڈ سے مرغ، اسرائیل سے انڈے، ڈنمارک سے پنیر، ترکیہ سے بھیڑ، اسٹریلیا سے منجمد گوشت، اکواڈور سے کیلے ...... خریدنے میں خرچ کیا جاتا تھا۔ "عظیم تمدن" کے آغاز اور نام نہاد فوری ماڈرنائزیشن کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۵ فیصدی سے زیادہ سالانہ گراں بازاری نے معاشرہ کے روزانہ کام کرنے والے مزدوروں اور تنخواہ پانے والے ملازموں کی پوری آمدنی کو نگل لیا اور مزدور اور ملازموں پر مشتمل ۸۵ فیصد سے زیادہ افراد بینکوں اور سرمایہ داروں کے مقروض ہو گئے۔[۱]

۱۔ "انقلاب ایران ومبانی رہبری امام خمینیؒ" تالیف سایروس برآم، ترجمہ پ، شیرازی ص ۱۴۔۱۵

۴۔توہین آمیز مقالہ کی اشاعت

چوتھا نظریہ،جس کے انقلابیوں ،مذہبیوں اور غیر جانبدار تجزیہ نگاروں میں بہت سے حامی ہیں ،یہ ہے کہ انقلاب کے فوری رونما ہونے کے عامل کو کارٹر کے حقوق بشر،شاہ کی بیماری اور اس کی ماڈرنائزیشن پالیسی میں نہیں ڈھونڈنا چاہئے۔کارٹر کا حقوق بشر،جیسا کہ بیان ہوا اصولاً ایران کے بارے میں جاری نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس جب بھی شاہ نے تشدّد سے کام لے کر لوگوں کا قتل عام کیا تو کارٹر کی کھلم کھلا حمایت اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔من جملہ ۸ ستمبر ۱۹۷۸ء کے حادثہ میں ہزاروں افراد کے قتل عام کے بعد کارٹر نے کیمپ ڈیوڈ سے شاہ کی کھلم کھلا حمایت کا اعلان کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ کارٹر کی حکومت میں برجنسکی جیسے افراد ناراض تھے کہ شاہ کیوں اس سے زیادہ شدت سے کام نہیں لیتا ہے۔مدارک واسناد بھی واضح طور پر ایران میں حقوق بشر کی رعایت پر کارٹر کی طرف سے عدم دباؤ کی حکایت کرتے ہیں۔یہاں تک کہ کارٹر ایران میں مارشل لا نافذ کر کے لوگوں کو بری طرح کچلنے کا حامی تھا۔

اس کا بہترین گواہ امریکی سفیر ''سولیوان'' ہے کہ وہ اس سلسلہ میں یوں لکھتا ہے:

''جب میں نے مارشال لا نافذ کرنے کے بارے میں واشنگٹن سے سوال کیا،تو مجھے ۴۸ گھنٹے کے اندر ایک فوری اور واضح جواب ملا کہ امریکہ اس (شاہ) کے ہر اس فیصلہ کی حمایت کرے گا جو وہ اپنی قدرت اور حیثیت کو مضبوط کرنے کے بارے میں لے لے گا۔پیغام کے متن سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ ایران کی بحرانی حالت کو ختم کرنے اور مخالفوں کو کچلنے کے سلسلہ میں ہر اقدام کی حمایت کرتا ہے۔[۱]''

اگر کچھ لوگ حقوق بشر کی امید پر کھلی سیاسی فضا کی خوش فہمی میں مبتلا تھے،وہ حقیقت میں ایسے لوگ تھے،جن کا نہ لوگوں کی طوفانی تحریک میں کوئی کردار تھا اور نہ ہی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے والی ایک انقلابی حرکت کے موافق تھے،ان کے اقدامات کا انقلاب کی سرعت میں نہ صرف کوئی اثر

۱۔''انقلاب ایران ومبانی رہبری امام''تالیف سایرس برآم،ترجمہ پ،شیرازی ص ۱۴۔۱۵

نہیں تھا بلکہ وہ سازش کارانہ اور اصلاحانہ راستوں پر ''مورچہ بہ مورچہ'' آگے بڑھنے کی پالیسی کی وجہ سے انقلاب کو سست ترکرنے کی کوشش کررہے تھے، البتہ رہبر انقلاب کی ہوشیاری اور دور اندیشی نے ان کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

لیکن شاہ کا کینسر کی بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد آرام بخش دوائیوں کے استعمال کی وجہ سے ملک چلانے میں اس کی توانائی پر اثر پڑنے کے بارے میں، پہلے بھی اشارہ کیا گیا، کہ شاہ ایک ڈرپوک اور کمزور آدمی تھا اور اپنے باپ کی ذہنیت سے متاثر ہوکر اپنے کو ایک مضبوط ارادہ والی شخصیت میں تبدیل نہ کرسکا تھا۔ شاہ حکومت کو چلانے اور اسے تحفظ بخشنے کے زمانہ تک یہ ارادہ اور قدرت حاصل نہ کرسکا تھا، بلکہ حقیقت میں یہ اجنبی طاقتوں خاص کر برطانیہ اور امریکہ کی پشت پناہی اور حمایت تھی جو اسے ہمت افزائی کرکے ان کی طرف سے املا شدہ پالیسیوں کو جاری کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

ہم نے تیسرے نظریہ کے بے بنیاد ہونے کے بارے میں اعداد و شمار کے ذریعہ پہلے دلائل پیش کئے۔ اس لئے بیان کئے گئے استدلال اور تاریخی اسناد کے پیش نظر وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ نظریات میں سے کوئی بھی نظریہ انقلاب کے فوری طور پر رونما ہونے کے اصلی عامل کے طور پر نہ قبول کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی تائید کی جاسکتی ہے۔

چوتھا نظریہ، یہ ہے کہ امام کے بیٹے آیت اللہ سید مصطفیٰ خمینیؒ کی شہادت کے بعد قم میں ایک مجلس فاتحہ (ترحیم) کے انعقاد اور روزنامہ اطلاعات مورخ ۱۹۷۹/۱/۶ء (۱۳۵۶/۱۰/۱۷) میں شائع کئے گئے توہین آمیز مقالہ نے انقلاب کی پہلی چنگاری لگادی، لوگوں کے مذہبی جذبات انتہائی حد تک مجروح ہوئے اور لوگوں کے غم و غصہ کا لاوا پھوٹنے لگا اور سلسلہ وار مذہبی تقریبات (شہداء کے اربعین) منعقد کرنے کے نتیجہ میں شہنشاہی نظام کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ اسلامی انقلاب کامیاب ہوا۔

توہین آمیز مقالہ کے شائع ہونے کے دن سے کہا جاتا ہے کہ یہ مقالہ دربار کے ایک وزیر ہویدا کے براہ راست اور قطعی حکم سے شائع کیا گیا تھا مسلسل یہ سوال کیا جارہا تھا کہ، کیا یہ اقدام حکومت کی

بے شمار غلطیوں میں سے ایک اور غلطی تھی یا مکمل طور پر مخالفوں کو کچلنے اور ان کا گلا دبانے کی ایک نئی سوچی سمجھی سازش تھی؟ شاہ امریکہ اور مغربی دنیا کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ حکومت کی مخالف تحریک صرف مذہبی پہلو رکھتی ہے اور حکومت کے مخالف چند گنے چنے متعصب اور رجعت پسند علماء ہیں۔ ان حالات میں آزادی دینا ہرج مرج، بے لگام ہونے اور لاقانونیت کے عام ہونے کا سبب بنے گا، اور علاقہ کی امن وسلامتی، تیل کے منابع اور بین الاقوامی سرمایہ کے لئے خطرہ بنے گا۔ شاہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حوادث پر قابو پانا ممکن ہے او کبھی یہ تصور نہیں کرتا تھا کہ وہ ایک ایسے مہلک مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے کہ جس کی عظمت اور وسعت اس کی سلطنت کی بنیادوں اور شہنشاہی نظام کو درہم برہم کرنے کا باعث ہے۔

بہر حال ۹ جنوری ۱۹۷۸ء کو قم کے لوگوں کے اعتراضات اور مظاہروں کو خاک وخون میں غلطان کر کے بہت سے لوگ شہید کئے گئے۔ قم کے شہیدوں کے چہلم کے موقع پر ۱۸ فروری ۱۹۷۸ء کو تبریز کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایسا عظیم اور ناقابل تصور قیام کیا کہ ایک مدت تک شہر کا کنٹرول حکومت کے اہل کاروں اور مامورین کے ہاتھ سے خارج ہو گیا اور لوگوں نے سینماؤں، شراب کی دکانوں اور رستاخیز پارٹی کے دفاتر کو آگ لگا کر حکومت کے خلاف اپنے غیض وغضب کا مظاہرہ کیا۔

آخر کار فوج نے سپاہیوں سے بھری ٹرکوں اور ٹینکوں سے حملہ کر کے تبریز میں خون کی ہولی کھیلی اور دسیوں افراد کو شہید کر دیا۔ تبریز کے شہدا کے چہلم پر یزد میں لوگوں نے قیام کیا۔ ۲۹ اور ۳۰ مارچ ۱۹۷۸ء کو یزد میں تبریز کا حادثہ دہرایا گیا۔ اور یہ سلسلہ وسیع پیمانے پر پورے ملک میں جاری رہا۔ ۱۹۷۸ء کے پورے سال کے دوران یہ تحریک پوری شدومد سے جاری رہی اور عید فطر، جمعہ سیاہ اور تاسوعا و عاشور کے مظاہرے جیسے خونین اور ساتھ ہی پر شکوہ دن گزارنے کے بعد سرانجام اسلامی انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

اس عوامی تحریک میں جو واضح اور آشکار دلائل دکھائی دیتے ہیں نیز جو اس بات کی علامت ہیں

کہ اسلامی انقلاب کا اصلی عامل مذہبی پہلو اور امام کے بارے میں توہین آمیز مقالہ کی نشر و اشاعت سے لوگوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا تھا اور وہ، مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہیں:

۱۔ ۹ جنوری ۱۹۷۸ء سے انقلاب کی کامیابی تک رونما ہونے والے تمام عوامی مظاہرے مذہبی پہلو کے حامل تھے اور یہ مذہبی تقریبوں (عاشور اور اربعین)، عیدوں اور دوسرے مذہبی رسومات سے مربوط تھے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا پہلو نہیں رکھتے تھے۔

۲۔ لوگوں کی حرکت اور اجتماع کرنے کی جگہ مسجدیں تھیں اور حکومت نے بھی جامع مسجد کرمان، مسجد حبیب شیراز اور مسجد لرزادہ تہران پر حملہ کر کے ان مقامات کی نسبت اپنے بغض و عناد کا مظاہر کیا اور ان اجتماعات میں رکاوٹ پیدا کی تھی۔

۳۔ مظاہروں کا اعلان اور ان کی رہبری صرف علماء کے توسط سے انجام پاتی تھی اور غیر مذہبی رہبروں کا ان مظاہروں کی قیادت میں کوئی کردار نہیں تھا، یہاں تک کہ جمعہ سیاہ کے شہداء کے اربعین پر جب قومی محاذ (جبہہ ملی) نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہڑتال اور مظاہروں کی اپیل کی تو اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

۴۔ ان تمام حرکتوں کا آزاد سیاسی ماحول اور کارٹر کے حقوق بشر سے کوئی ربط نہیں تھا بلکہ ان کو کچلنے کے لئے انتہائی بے رحمی اور تشدّد سے جواب دیا گیا اور یہاں تک کہ امریکی حقوق بشر کا دم بھرنے والے بھی اس تشدّد کی تشویق و ترغیب کرتے تھے۔

۵۔ لوگوں کے مطالبات اور نعرے مذہبی، سیاسی تھے اور دو اصلی محور پر گھوم رہے تھے: ایک شاہ کے چلے جانے اور پہلوی حکومت کا زوال اور دوسرا اسلامی حکومت کا قیام۔

۶۔ غیر مذہبی گروہوں کو مسلمان عوام کے ٹھاٹھے مارتے سمندر سے اپنے آپ کو ملحق کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا اور اس سلسلہ میں اپنے نعرے پیش کرنے سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوئے تاکہ لوگوں کے اعتراض سے دوچار نہ ہوں۔

آخر پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی یہ تحریک صرف مجاہد علما کی رہبری کی

بنیاد پر ۱۹٦۳ء سے شروع ہوئی جس کی بالاترین رہبری مسلمانوں اور شیعوں کے عظیم مرجع تقلید امام خمینیؒ کر رہے تھے۔ ایران کے مسلمان امام کی بے خوف اور جان نثار حمایت اور پشت پناہی کر رہے تھے اور اس حمایت کا محور مکتب اسلام اور شہادت تھا اس انقلاب کو کارٹر کے حقوق بشر، مختلف پارٹیوں کے اتحاد، اور قومی تحریکوں سے ربط دینا بیہودہ ہے اور یہ مستند تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔

چوتھی فصل

اسلامی انقلاب کے نتائج

- پہلی گفتگو: انقلاب کی پہلی دہائی
- دوسری گفتگو: انقلاب کی دوسری دہائی

پہلی بات:

انقلاب کی پہلی دہائی

- مقدمہ
- پہلا مرحلہ: لیبرل طاقتوں کا اقتدار (عبوری حکومت)
- دوسرا مرحلہ: مخلوط حکومت
- تیسرا مرحلہ: "خط امام" والوں کی حکومت
- چوتھا مرحلہ: تیسرا انقلاب

مقدّمہ

۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو اسلامی انقلاب کی کامیابی ایک عظیم اور حیرت انگیز واقعہ تھا۔ ایک ملت نے خالی ہاتھ، کسی بیرونی طاقت کی حمایت کے بغیر صرف ایمان، ایثار اور جان نثاری کے بل بوتے پر ایک قدیم شہنشاہی نظام (جس کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں حمایت کرتی تھیں) کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر کے سر نگون کر دیا اور اس کے بعد ایران کی تاریخ کا ایک ایسا نیا دور شروع ہو گیا، جو اپنے گزشتہ ادوار کی نسبت شکل و مفہوم کے لحاظ سے بنیادی فرق رکھتا ہے۔ لیکن اس کی عظمت اور حیرت کا سبب یہ تھا کہ اس عصر جدید اور بیسویں صدی کے اواخر میں ایک اسلامی جمہوریہ کا نظام قائم ہوا اور باوجود اس کے کہ تقریباً سبھی مغربی مفکرین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دین و مذہب کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور معاشرہ عملی طور پر من مانی کی طرف بڑھ رہا ہے، اچانک ایک ایسا انقلاب کامیاب ہوا جس کی بنیاد دینی عقائد پر استوار تھی اور ایسے نظام کی تاسیس ہوئی جس کا بنیادی ڈھانچہ شریعت اور دین پر مستحکم ہو چکا تھا۔

اس طرح دو دہائی گزرنے کے بعد اس نظام نے اپنی کارکردگی اور توانائی کو ثابت کر کے دکھایا۔ البتہ یہ کام آسانی کے ساتھ انجام نہیں پایا۔ بلکہ انقلاب نے بے شمار رکاوٹوں اور مسلسل سازشوں اور اندرونی و بیرونی جنگوں کا مقابلہ کر کے تازہ قائم ہونے کے باوجود تمام سازشوں کو طشت از بام کر کے اپنے پیغام کو ملک کی سرحدوں سے باہر پھیلا دیا اور ایک قوی اور مستحکم نظام کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر اس کا مظاہرہ کر کے عالمی نظام کے محاسبات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

ہم انقلاب کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کی ماہیت اور مفہوم کے پیش نظر، اسلامی انقلاب کے نتائج کے دو حصوں، جس کا ہر حصہ ایک دہائی پر مشتمل ہے، پر بحث و تحقیق کریں گے۔ اس کا پہلا حصہ امام خمینیؒ کی وفات تک انقلاب کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں وہ حوادث اور واقعات بیان کئے جائیں گے جو اس مدت میں رونما ہوئے۔ اس دوران کو ''استحکام قائم ہونے اور سازشوں سے مقابلہ

'' کا دور کہا جاتا ہے اور اس کے دوسرے حصہ میں اس کے نتائج پر بحث کریں گے۔

جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں بیان کیا گیا کہ، دنیا کے اکثر سیاسی انقلابوں کی کامیابی کے بعد، ایک مختصر مدت تک اعتدال پسند عناصر اقتدار پر آتے ہیں۔ ایران میں بھی ایسا ہی اتفاق رونما ہوا اور یہی عناصر اقتدار پر آ گئے۔ ان کے اقتدار پر آنے کے عوامل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایران کے انقلاب کے رہبر، ملک کو چلانے کی صلاحیت رکھنے والے انقلابی جوانوں کے بارے میں معرفت نہیں رکھتے تھے اور انقلابیوں کے درمیان ایسے مشہور افراد معروف تھے، جنہوں نے ڈاکٹر محمد مصدق کی مختصر مدت کی حکومت میں حکومتی عہدوں کو قبول کر کے کسی خاص کردار کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

۲۔ رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ نہیں چاہتے تھے کہ علماء براہ راست حکومتی عہدوں پر فائز ہو جائیں اور دوسری جانب یہ بات بھی تھی کہ علماء نے ملک کو چلانے کے سلسلہ میں ضروری توانائی حاصل کرنے کا تجربہ حاصل نہیں کیا تھا۔

۳۔ مھدی بازرگان اور اس کے ساتھی قوم پرستوں اور لیبرلوں میں تنہا چہرے تھے، جو مذہبی پہلو رکھتے تھے اور مختلف گروہوں کے لئے کسی حد تک قابل قبول تھے۔

۴۔ رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ کے فرمان کے مطابق، کہ انقلاب کے بعد پہلی حکومت، ایک ''عبوری حکومت'' کہلاتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس حکومت کی ذمہ داریاں، عارضی تھیں اور حقیقت میں اس کو ایک انتقالی دور کے لئے مدنظر رکھا گیا تھا۔

انقلاب کے بعد اعتدال پسندوں کی حکومت کے دوران تبدیلیوں کے تکوینی مراحل پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایران میں لیبرل ازم کی خصوصیات کا جائزہ لیں۔

مغربیوں کے مفہوم میں ''لیبرل ازم'' کی اصطلاح ایک مجموعہ کے تسلط اور حکومتی آمریت کے مقابلہ میں فرد کی آزادی کے دفاع کے معنی میں ہے۔ لیبرل ازم نے فرانس کے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد جنم لیا ہے۔ بعض فلاسفروں، جیسے بنیامین کنسٹانٹ، مونٹسکو یو، جان لاک، امانوئل کانٹ اور جان اسٹوارٹ میل نے لیبرل ازم کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کچھ مطالب تحریر کئے ہیں۔

لیبرل ازم ایک نظریہ ہے جو حکومتوں کے تسلط کے مقابلہ میں انفرادی آزادی کا تحفظ چاہتا ہے انفرادی آزادی کے حدود بھی افراد کا ایک دوسرے کے حقوق کو پائمال نہ کرنا ہے۔ سیاسی لیبرل ازم ''انڈویڈولزم'' پر (فرد کی اصلیت اور ہر قسم کے نظام اور سماجی جبر وتسدد کی حاکمیت سے انکار)، اقتصادی لیبرل ازم، ''یوٹیلٹیر نیزم پر۱'' (فائدہ کی اصلیت) اور مذہبی لیبرل ازم، عقائد پر، ہر ایک کا اپنی مرضی سے خدا کی پرستش کی راہ کا انتخاب کرنا بے دینی پر مبنی ہے۔ لیبرل ازم کی فلسفیانہ بنیاد، ریشنلزم۲ (فکر واندیشہ کی اصلیت) پر ہے اور عقل کے سرچشمہ کے علاوہ معرفت حاصل کرنے کے ہر قسم کے سرچشمہ سے انکار کرتا ہے۔ یہاں پر یہ بحث نہیں کی جائے گی کہ ایرانی لیبرلوں کے عقائد کس حد تک مغربی لیبرلوں کے معیاروں سے مطابقت رکھتے ہیں، لیکن ایران کے انقلاب میں اعتدال پسند گروہ پر لیبرلزم کی اصطلاح کے اطلاق کو تقریباً تمام موافقوں اور مخالفوں، حتی مغربی محققین اور امریکی حکومت کے تجزیہ نگاروں نے بھی قبول کیا ہے اور اسے اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

البتہ یہ فطری بات ہے کہ ایران کے لیبرل، زندگی گزارنے والے معاشرہ اور ماحول سے متاثر ہو کر حالات کے پیش نظر خاص نظریات اور آئیڈیالوجی کا اظہار کرتے تھے کہ مغربی لیبرل ازم میں وہ چیز نہیں پائی جاتی ہے۔ دوسری جانب یہ جاننا چاہئے کہ ایران کے لیبرل، مغربی لیبرلوں کے مانند ایک متحد مجموعہ نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسے مجموعہ کو تشکیل دیتے ہیں، جس میں مذہبی لیبرل (تحریک آزادی) غیر مذہبی مادہ پرست اور حتیٰ سوشل ڈیموکریٹ گروہ بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ بہت سے مسائل میں طریقہ کار کے انتخاب اور حکمت عملی کے بارے میں آپس میں توافق نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک گروہ نے شاہ کے ساتھ توافق کیا اور شاپور بختیار جیسے شخص نے حکومت کے وزیر اعظم کے عہدہ کو قبول کیا اور لوگوں کے مقابلہ میں پایداری کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے جیسے ''متین دفتری'' والوں نے انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد انقلاب کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا اور ''نہضت آزادی'' نام کے ایک گروہ نے ایک مدت تک انقلابیوں کے ساتھ تعاون کیا اور اسلامی

1. Utilitarianism

2. Rationalism

جمہوریہ کے نظام میں اقتدار تک پہنچے۔

لیبرلوں کے مختلف گروہوں کی ایرانی معاشرہ اور انقلاب کے بارے میں سیاسی پالیسی کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ایران کے لیبرلوں میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ ایرانی لیبرل مغربی تہذیب و تمدن سے بری طرح متاثر تھے اور اپنے بہت سے نظریات یورپی معاشرہ سے حاصل کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مھدی بازرگان کا مندرجہ ذیل بیان قابل توجہ ہے:

''جو زندگی ہم آج گزار رہے ہیں، وہ سب یورپی ہے۔ ہماری طرز فکر، تعلیم، پڑھنا لکھنا، مبارزہ انقلاب اور سامراج سے ہماری مخالفت، سب مغرب کا تحفہ ہے[۱]''

۲۔ فرد کی اصلیت اور انفرادی آزادی کے بارے میں ایک دوسرے سے عدم مزاحمت کی حد میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

۳۔ سائنسی ترقی کو نہ فقط تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ بہت سے اجتماعی، مذہبی مظاہر، من جملہ مبدأ و معاد کو سائنسی راستہ سے ثابت کریں۔ اس سلسلہ میں مھدی بازرگان کی طرف سے شائع ہوئی مذہبی کتابیں علمی ترقی (علم گرائی) کو حد سے زیادہ اصلیت بخشنے کی گویا ہیں۔

۴۔ مبارزہ کو قانون کے اندر جائز جانتے ہیں، اور شاہ کی حکومت کے دوران بھی ملک کے آئین کے سہارے اصلاحی پالیسی اپناتے تھے اور ہرگز انقلاب اور انقلابی طریقہ کار کے قائل نہیں تھے اور قدم بہ قدم یا مورچہ بہ مورچہ کی پالیسی کے قائل ہیں۔

۵۔ قوم پرستی اور نیشنلزم کے قائل ہیں اور ان میں سے اکثر افراد کے لئے اسلام، قومیت اور قوم پرستی کے دائرہ میں قابل قبول ہے، ان میں سے ایک کے بقول: ''وہ پہلے ایرانی ہیں پھر مسلمان''۔

۶۔ ان میں سے اکثر کے لئے مذہب لوگوں کے ذاتی مسائل کا جزو ہے۔ دین سیاست سے جدا ہے۔ لیبرل، مذہبی گروہ، دین کے سیاست سے جدا نہ ہونے کے قائل ہونے کے باوجود تمام سیاسی واجتماعی مراحل میں دینی مسائل اور احکام کے نفاذ کو اولویت بخشنے کے قائل نہیں ہیں اور مھدی

۱۔ ''اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں نہضت آزادی کی پالیسی''، ص ۲۴

بازرگان کے بقول "اسلام کے ذریعہ ایران کی خدمت کرنا اپنا فریضہ جانتے ہیں۔[۱]"

۷۔ لیبرل ازم کا اثر و رسوخ تعلیم یافتہ طبقوں اور خوشحال زندگی گزارنے والے شہریوں تک محدود ہے اور عام لوگوں، فقیر اور گاؤں کے باشندوں میں اثر و رسوخ نہیں رکھتے۔

۸۔ لیبرل، نہ فقط اپنے طبقاتی اور ثقافتی مقام کی وجہ سے عام لوگوں سے جدا ہیں، بلکہ ان کے ساتھ روابط برقرار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے، وہ ان کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ وہ اصولی طور پر حکومت میں لوگوں کے لئے کسی قسم کے کردار کے قائل نہیں ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ حکومت ہاتھ میں لینے کے لئے لوگ ان کی پالیسی کی تائید اور ہمراہی کریں۔

۹۔ لیبرل، علماء کے ساتھ کوئی خاص اور مناسب رابطہ نہیں رکھتے اور اگر کبھی ان کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ بھی برقرار کیا ہے، تو وہ صرف حکومت تک پہنچنے اور لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر ان کی حمایت سے استفادہ کرنے کے لئے تھا اور حکومت میں ان کی مداخلت کے قائل نہیں ہیں۔

۱۰۔ فطری طور پر ولایت فقیہ کی اصل کے بھی قائل نہیں ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ اصل مذہبی ڈکٹیٹر شپ ایجاد کرے گی۔

۱۱۔ حکومتی مسئول اور عہدہ داروں کو منتخب کرنے میں تخصص کی بنیاد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی چیز کو نظام کے بارے میں عقیدہ اور تعہد پر ترجیح دیتے ہیں۔

۱۲۔ دفتری بیوروکریسی، اداری قواعد و ضوابط کی رعایت اور احترام کرنے پر بھروسہ کرتے ہیں اور انقلاب سے سرچشمہ پائے انقلابی اداروں سے پُر امید نہیں ہیں اور ان کی سرگرمیوں، دوسرے الفاظ میں حکومتی معاملات میں ان کی مداخلت سے رنجیدہ ہوتے ہیں۔

۱۳۔ مجرموں کو سزا دینے اور قصاص کی اصلی ہونے پر عفو و بخش اور چشم پوشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے شاہ کی حکومت سے مربوط مجرموں کو انقلابی عدالتوں کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں پر اعتراض کرتے تھے اور اسے عالمی مارکسزم کی طرف ایک واضح قدم اور

۱۔ "انقلاب دو حرکتوں میں"، تألیف مھدی بازرگان، ص ۱۱۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحمۃ للعالمین کے تابناک عمل کے خلاف سمجھتے تھے۔!

۱۴۔ اپنے مخالفوں پر اجارہ داری کا الزام لگانے کے ضمن میں اپنے معاونین کو منتخب کرنے میں حد سے زیادہ اجارہ داری سے کام لیتے ہیں۔ یہ حقیقت عبوری حکومت میں تمام ارکان کو لیبرلوں اور قوم پرستوں اور مصدق کے حامیوں سے چن لینے کے نتیجہ میں بالکل واضح ہوگئی۔

۱۵۔ غیر جانبداری کے اصول کے قائل ہونے کے باوجود مغربی بلاک کی حمایت اور ان سے گہرے تعلقات کے خواہشمند ہیں۔

۱۶۔ ''نہ شرقی نہ غربی'' کی پالیسی اور نعرہ کے بارے میں ان کا درک، وہی ڈاکٹر مصدق کی منفی توازن کی پالیسی تھی اور قائل ہیں کہ اس نعرہ کا مفہوم بالکل قومی اور دفاعی تھا اور اس میں تحریف کر کے سیاسی جارحیت اور مغرب سے دوری کا پہلو ایجاد کیا گیا ہے۔۲

۱۷۔ ان میں اکثر لوگ اپنے آپ کو ڈاکٹر مصدق کے پیروکار جانتے ہیں اور اسے اپنا قومی رہبر مانتے ہیں اور اصطلاحاً یہ لوگ مصدقی قومی ہیں۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی اور شہنشاہی نظام کے نابود ہونے کے بعد، ایرانی معاشرہ کے سرگرم سیاسی افراد مندرجہ ذیل گروہوں میں تقسیم ہوئے: الف) مذہبی انقلابی، اسلامی آئیڈیالوجی کے معتقد یا روحانیت کی رہبری میں مکتبی افراد کہ ان میں سرفہرست، رہبر کبیر انقلاب امام خمینیؒ ہیں کہ اس کے بعد انھیں ''خط امام'' کی پیروکار افراد سے ہم یاد کرتے ہیں۔۳

۱۔ ''انقلاب دو حرکتوں میں'' تألیف مھدی بازرگان، ص ۱۱۵ ۔ ۲۔ ''انقلاب دو حرکتوں میں'' تألیف مھدی بازرگان، ص ۱۰۴

۳۔ چونکہ اس گروہ کی طرف زیادہ اشارہ کیا جائے گا، لہٰذا یہاں پر ان کی خصوصیات کا ایک خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

الف) خط امام کے افراد فقاہتی اسلام کے قائل ہیں۔ اور ولایت فقیہ کی اصل پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے علماء کی رہبری کو انقلاب کی کامیابی کا ضامن سمجھتے ہیں۔

ب) جزئی کامیابیوں کی نسبت، عقیدتی اصولوں اور معیاروں کے تحفظ پر زور دیتے ہیں۔

ج) معاشرے کی ضرورتوں کو ہر زمان و مکان میں پورا کرنے کے لئے اسلام کو ایک جامع، کامل، قدرتمند اور عالمی مکتب ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

د) مقصد کو پانے کی راہ میں ایثار و شہادت پر بھروسہ کر کے بے مثال طاقت کے حامل ہیں، اور کسی مادی طاقت سے نہیں ڈرتے۔

ھ) مشرق و غرب سے بیزاری کا اعلان کر کے سامراج کی نابودی تک ان سے مبارزہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں۔

ب) اعتدال پسند یا قوم پرست لیبرل، شاہ کی حکومت کی مخالفت کے ضمن میں، انقلاب سے پہلے تند اقدامات اور انقلاب کے بعد انقلابی اقدامات کے مخالف تھے، اور دوسری طرف سے معاشرہ کو ادارہ کرنے میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ لائق جانتے تھے۔

ج) شاہ کی حکومت کے مخالف اشترا کی گروہ شاہ کی حکومت کی مخالفت کے باوجود اسلامی جمہوریہ کے قیام کے بھی مخالف تھے اور حکومت کے زوال کے بعد اسلامی جمہوریہ کے مخالفین سے جا ملے، جیسے: سازمان مجاہدین خلق، فدائی خلق گریلا اور پیکاری وغیرہ۔

د) وہ گروہ، جو گزشتہ حکومت کے حامی تھے اور اس حکومت سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اب اپنے مفادات کے خطرہ میں پڑنے کی وجہ سے گزشتہ حکومت کے مخالفین سے جا ملے تھے، جیسے سلطنت طلب، ساواکی، فراماسون، فوج اور حکومتی اداروں سے نکال باہر کئے گئے افراد۔

اگر چہ پہلے گروہ کا انقلاب کو کامیاب بنانے اور اس کی رہبری کرنے میں بنیادی رول رہا ہے، لیکن انقلاب کی کامیابی کے بعد، ان کی بیشتر کوشش حکومت اور عہدوں کو اپنے قبضہ میں لینا تھی۔ لیکن انقلاب کی رہبری حسب سابق ایک جج اور ہادی کی حیثیت سے بدستور اور دائمی طور پر اپنے رابطہ کو عوام اور حکومت کے ذمہ داروں اور انقلابیوں سے برقرار رکھ کر حقیقی قدرت اور کنٹرول اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھی۔ انقلاب کی شوریٰ اور عبوری حکومت کو امام نے منتخب کیا تھا۔ ان کی تائید کے بغیر نہ صرف ان کی شرعی حیثیت ختم ہوتی بلکہ لوگوں کی حمایت بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

مبارز علماء، خاص طور پر انقلابی اداروں، من جملہ انقلابی شوریٰ، انقلابی عدالتوں، کمیٹیوں، سپاہ پاسدار، جہاد سازندگی، جمعہ و جماعت کی امامت، اور حزب جمہوری اسلامی ایران میں سرگرم عمل تھے۔ ان اداروں میں جو انقلابی اور معتقد مسلمان فعّال تھے اور ایک شرعی اور انقلابی فریضہ کے طور پر ایثار و قربانی کے جذبہ سے انقلاب کے ماحصل کی حفاظت، انقلاب دشمنوں کو ناکام بنانے اور محرومین کی خدمت میں سر توڑ کوشش کرتے تھے۔

د دوسرے گروہ کے افراد (لیبرل) نے اپنی خصوصیات کے پیش نظر، حکومت اور حکومتی اداروں

پر کنٹرول حاصل کر کے انقلاب کے بعد والے معاشرہ کو اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دینے کی کوشش کی۔ انقلابی شوریٰ کا ایک حصہ، وزراء کی کابینہ، ریڈیو اور ٹی، وی، ذرائع ابلاغ اور اکثر روزنامے ان کے قبضہ میں تھے۔

تیسرے اور چوتھے گروہ سے مربوط افراد تخریب کاریوں میں لگ گئے۔ انہوں نے تنظیم سازی اور افراد کو جذب اور اسلحہ جمع کر کے اسلامی جمہوریہ کے تازہ قائم ہوئے نظام کے پھیلاؤ اور استحکام میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

انقلاب کے بعد حضرت امام کی رحلت تک کے ارتقائی تبدیلیوں کے زمانہ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور:

یہ دور لیبرل ازم کی باقاعدہ حاکمیت کا دور تھا جس میں خط امام کے افراد اقلیت کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ دور انقلاب کی کامیابی اور عبوری حکومت کی تشکیل سے شروع ہوا اور امریکی سفارت (جاسوس خانہ) پر قبضہ کرنے اور مھدی بازرگان کے استعفیٰ دینے پر ختم ہوا۔

دوسرا دور:

اس دور کو مخلوط حکومت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور مھدی بازرگان کے استعفیٰ کے بعد انقلابی شوریٰ کے ملک کا نظم و نسق چلانے کی ماٴموریت سے شروع ہوا اور انقلابی شوریٰ کی ماٴموریت تمام ہونے اور شہید رجائی کے وزیر اعظم بننے پر ختم ہوا۔ اس دور میں اگرچہ لیبرلوں کا زور کچھ کم ہوا تھا، لیکن انقلابی شوریٰ کے تقریباً نصف ارکان لیبرل تھے اور بنی صدر کے صدر جمہوریہ اور رئیس شورائے انقلاب کے طور پر منتخب ہونے کے بعد ان کی پوزیشن مضبوط ہوئی، وہ حسب سابق قابل توجہ قدرت کے مالک تھے اور حکومت کے عہدے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئے تھے۔

تیسرا دور:

تیسرا دور شہید رجائی کے وزیر اعظم بننے کے دن سے شروع ہوا اور بنی صدر کی معزولی

اور ۲۸ جون ۱۹۸۱ء[۱] کے حادثہ تک جاری رہا۔ اس دور کو خط امام والوں کی حاکمیت اور لیبرلوں کی اقلیتی حیثیت کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں قانون سازیہ (پارلیمنٹ) کی قطعی اکثریت، شورائے نگہبان، عدلیہ کی شورائے عالی[۲] اور وزراء کی کابینہ پر خط امام والوں کا کنٹرول تھا۔ اس کے باوجود صدر جمہوریہ اور کمانڈر انچیف کے عہدوں کے علاوہ پارلیمنٹ، ریڈیو، ٹی وی، مرکزی بینک جیسے اداروں میں لبرل عناصر اقلیت کی صورت میں موجود تھے جو حکومت اور ''خط امام'' کی مخالفت کرتے تھے۔

چوتھا دور:

یہ دور بنی صدر کو صدارت کے عہدہ سے معزول کیے جانے اور اقتدار سے لبرل عناصر کا مکمل طور پر بے دخل کیے جانے کے دن سے شروع ہوا۔ یہ دور ''خط امام'' والوں کے مکمل اقتدار اور لبرلوں کے نظام سے باقاعدہ طور پر خاتمہ کا دور ہے۔

۱۔ ۲۸ جون ۱۹۸۱ء، وہ تاریخ ہے، جس دن منافقین نے حزب جمہوری اسلامی کے مرکزی دفتر کو ایک قوی بم کے دھماکہ سے اڑا دیا۔ اس میں پارٹی کے جنرل سکریٹری اور ملک کی عدلیہ کے سربراہ آیت اللہ بہشتی اپنے ۷۲ ساتھیوں کے ہمراہ شہید ہوئے۔ (مترجم)

۲۔ ۱۹۸۰ء میں پاس کیے گئے ملک کے آئین کے مطابق عدلیہ کی شوریٰ پانچ ارکان پر مشتمل تھی۔ اس میں ملک کے سپریم کوٹ کے چیف جسٹس اور اٹارنی جنرل، جو رہبر کی طرف سے منصوب ہوتے تھے، کے علاوہ باقی تین ارکان، ججوں کی ووٹنگ سے منتخب ہوتے تھے۔

پہلا مرحلہ:

لیبرل طاقتوں کی حکومت

(عبوری حکومت)

اسلامی انقلاب کی ابتدا میں (جو معاشرہ کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بڑی تعداد بالخصوص محروم عوام کی شرکت سے کامیاب ہوا تھا) اعتدال پسندوں کی حکومت تشکیل پائی جو نہ انقلابی تھے، نہ انقلابی حرکتوں کے قائل تھے اور نہ انقلاب کے بارے میں صحیح نظریہ رکھتے تھے۔ جبکہ لوگوں کی بڑی تعداد، جو برسوں بلکہ صدیوں کے بعد ظلم واستبداد اور سامراجی چنگل سے آزاد ہوئے تھے اور خود کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے والے سمجھتے تھے، جو کچھ حاصل ہوا تھا اسے بہ آسانی چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہیں تھے، لیکن عبوری حکومت کا تصور اور نظریہ اس کے برعکس تھا۔

عبوری حکومت کے نظریہ کے مطابق، انقلاب نتیجہ پر پہنچ چکا تھا اور کامیابی حاصل ہو چکی تھی اور لوگوں، یہاں تک علماء نے اپنا کردار ادا کیا تھا، اب ان کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ ان کو اب میدان چھوڑنا چاہئے تھا، اور حکومت چلانے والوں اور ماہروں کے لئے موقع فراہم کرنا چاہئے تھا تاکہ ان کے زعم کے مطابق کسی رکاوٹ اور پریشان کے بغیر اپنی مرضی سے مسائل کا حل وعقد کرکے، ایک سال سے مظاہروں اور ہڑتالوں کی وجہ سے مفلوج ہوئے ملک ومعاشرہ کو دوبارہ اپنی عادی حالت پر لاسکیں۔ اب لوگوں کو اپنے کاروبار کے پیچھے جانا چاہئے تھا اور علماء کو بھی مساجد اور حوزہ علمیہ کی طرف واپس چلا جانا چاہئے تھا تاکہ درس وبحث اور لوگوں کی ہدایت میں مشغول ہو جاتے۔ مایکل فشر کے بقول:

''قوم پرستوں بالخصوص ''جبہہ ملی'' (قومی محاذ) کے اراکین کے لئے، شاہ کی حکومت کے

زوال سے انقلاب نتیجہ پر پہنچا ہے اور جو باقی رہا ہے وہ یہ ہے کہ اب بورژواؤں اور تجربہ یافتہ افراد کے لئے موقع فراہم کرنا چاہئے تا کہ حکومتی اداروں کا کنٹرول کرسکیں۔ جبکہ امام خمینیؒ کی نظر میں اگر وہی گزشتہ پالیسی اور طریقہ کار جاری رہتا، تو انقلاب اب تک کامیاب نہیں ہوتا۔ ان کے لئے انقلاب صرف ایک سیاسی یا اقتصادی انقلاب نہیں تھا، بلکہ ایک معنوی انقلاب بھی تھا جو حکومت پر حاوی اقدار، معیاروں اور اجتماعی کردار کو بدل سکے''۔[1]

انقلاب کے بعد فطری طور پر حکومت سے لوگوں کی توقع یہ تھی کہ نہ صرف ۲۵۰۰ سال کے دوران ملت پر ڈھائے گئے ظلم وستم، اذیت وآزار کا انتقام لیا جائے، بلکہ انقلاب کی کامیابی سرعت سے بے انصافیوں کا خاتمہ کرے اور معاشرہ کے محروم اور مستضعف طبقہ کا علاج کیا جائے اور حکومت، محرومین اور مستضعفین کے ہاتھ میں ہو۔ جبکہ عبوری حکومت نہ صرف انقلابی اور تند اقدامات کی قائل نہیں تھی بلکہ محرومیتوں کا علاج کرنے کے لئے ایک تدریجی حرکت کی معتقد تھی اور وہ بھی گزشتہ حکومت کے باقیماندہ قانون اور قانونی اداروں کے طریقہ سے۔ یہاں تک اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے دائرہ میں ان مطالبات کے لئے ترجیح کی بھی قائل نہیں تھی۔ عبوری حکومت کا تصور یہ تھا کہ انقلاب کے رہبر کے فرمان کی اسی حد میں اطاعت کی جانی چاہئے جس کی انھیں خاص ماٴموریت انجام دینے کے سلسلہ میں ذمہ داری دی گئی ہے۔

لوگ توقع رکھتے تھے کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد حکومتی اداروں اور آرگنایزیشنوں میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے اور نہ صرف روابط وضوابط کے لحاظ سے انقلابی تبدیلی پیدا ہو اور دفتری طوالت دور ہو جائے، بلکہ شاہ کی حکومت کے باقی رہنے کے لئے، جنہوں نے کسی بھی قسم کا اقدام اور تعاون کیا ہو، انھیں نکال باہر کیا جائے اور ان کی جگہ پر انقلاب کے معتقد افراد کو کام پر لگایا جائے۔ جبکہ عبوری حکومت عفو وبخشش کی قائل تھی اور اس سلسلہ میں اس قدر فراخ دل تھی کہ شاہ کی جاسوسی اور

1.Micheel Fisher'iran from Religious Dispute to Revolution, Harvard University press,1980,p.216

خطرناک ایجنسی ''ساواک'' کے کارکنوں میں بھی یہ جرأت پیدا ہوئی کہ لوگوں کے غیض وغضب اور انتقام کے ڈر سے فرار اور بھاگنے کے بجائے وزیراعظم کے دفتر کے سامنے اجتماع کر کے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ عبوری حکومت نے اہم سرکاری عہدوں پر افراد کو منصوب کرنے کے سلسلہ میں لوگوں اور انقلابیوں کے اعتراضات کو بھڑکایا۔

امام کی طرف سے وزیراعظم مہدی بازرگان کو وزیراعظم کے عہدہ پر منصوب کرنے کا فرمان مندرجہ ذیل مأموریتوں اور ذمہ داریوں پر مشتمل تھا:[۱]

۱۔ سرکاری عہدوں پر افراد کو منصوب کرنے کے بارے میں حزبی روابط اور کسی خاص گروہ سے وابستگی کو مدنظر نہ رکھا جائے۔

۲۔ ریفرنڈم منعقد کرنا اور ملک کے سیاسی نظام کو سلطنتی نظام سے اسلامی جمہوریہ میں تبدیل کر نے کے لئے عوام کی رائے معلوم کرنا۔

۳۔ نئے نظام کے آئین کو منظور کرنے کے لئے مؤسسین کی مجلس تشکیل دینا۔

۱۔ عبوری حکومت کے وزیراعظم کو منصوب کرنے کے سلسلہ میں امام کے حکم کا متن حسب ذیل تھا:
''جناب آقای مھندس مھدی بازرگان، انقلابی شوریٰ کی سفارش پر اور ملت ایران کی طرف سے ملک بھر میں عظیم اور متعدد اجتماعات اور مظاہروں کے دوراں تحریک کی رہبری کے تئیں لوگوں کی قریب بہ اتفاق اظہار عقیدہ سے سرچشمہ پائی شرعی اور قانونی حق کی بناء پر اور مکتب اسلام کے بارے میں آپ کے راسخ عقیدہ اور اسلامی وقومی مبارزات میں آپ کی سابقہ سرگرمیوں کے بارے میں حاصلہ اطلاعات کے پیش نظر جناب عالی کو پارٹی روابط اور کسی خاص گروہ کی وابستگی کو مدنظر رکھے بغیر، عبوری حکومت تشکیل دینے کی مأموریت دیتا ہوں تاکہ ملک کا نظم ونسق چلانے، بالخصوص ملک کے سیاسی نظام کو اسلامی جمہوریہ میں بدلنے کے سلسلہ میں لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ریفرنڈم منعقد کر کے نئے نظام کے آئین کے مسودہ کو منظور کرانے کے لئے مؤسسین کی مجلس تشکیل دینے، اور نئے آئین کے تحت پارلیمنٹ کے نمائندوں کو انتخاب کرنے کے لئے ضروری اقدامات انجام دینے کے لئے کاروائی کروگے، تقاضا کرتاہوں کہ میرے معین کئے ہوئے شرائط کے تحت عبوری حکومت کے اراکین کا جتنا جلد ممکن ہو سکے تعارف کرنا۔ سرکاری ملازمین فوج اور ملت، انقلاب کے مقدس مقاصد کو پانے اور ملک کا نظم وانتظام چلانے میں آپ کی عبوری حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے تاریخ کے اس نازک اور حساس موڑ پر آپ کی اور عبوری حکومت کی کامیابی کے لئے خداوند متعال سے دعا کرتا ہوں۔''

۴۔ملت کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ کے انتخابات منعقد کرنا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ عبوری حکومت رہبر انقلاب کے فرمان میں واضح شدہ مأموریتوں کے برعکس اپنی پارٹی کی مرضی کے مطابق عمل کر رہی تھی۔عبوری حکومت کے وزیروں کی کابینہ کی فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کابینہ کے تمام وزراء بلا استثناء لیبرلوں اور مصدق کے قوم پرست طرفداروں سے منتخب کئے گئے تھے، یہاں تک کہ نمونہ کے طور پر ایک فرد بھی ''جبہہ ملی'' یا ''نہضت آزادی'' کے علاوہ کہیں سے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔[۱] جبکہ دوسرے مبارز گروہوں میں بھی تعلیم یافتہ اور انتظامیہ صلاحیت کے مالک افراد موجود تھے، یہ وہی افراد تھے جنہوں نے بعد میں ملک کے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ ایک حکومت کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اراکین کے درمیان ھماھنگی اور یکجہتی پائی جاتی ہو، لیکن اسی حالت میں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ بازرگان کی حکومت کی مأموریت پہلے سے معین اور معلوم تھی اور یہ حکومت اپنے پروگرام اور سیاسی نظریات کے لئے وجود میں نہیں آئی تھی۔یہ سب ایک ایسی حالت میں پیش آیا کہ انقلابی، بالخصوص انقلاب کے رہبر اور علماء نے لیبرلوں کی تبلیغات کے برعکس، انھیں ذمہ داری دینے کے بارے میں وسعت نظر کا مظاہرہ کیا تھا اور اس حد تک مختلف نظریات کو برداشت کرتے تھے تا کہ معاشرے کے تمام طبقات نئی حکومت میں شرکت کر سکیں۔یہ عمدہ عوامل میں سے ایک عامل تھا کہ لیبرل، صدر جمہوریہ کے عہدہ کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔جبکہ واضح تھا کہ عوامی حمایت کے فقدان کے پیش نظر، انقلاب کے رہبر کی تائید کے بغیر ممکن نہیں تھا کہ پہلا صدر جمہوریہ ان میں سے منتخب ہو جائے اور ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کے ووٹ حاصل کر سکے۔

اسلامی جمہوریہ کے بارے میں ریفرنڈم منعقد کرنے کے سلسلہ میں بھی لیبرل عناصر، رہبر انقلاب اور لوگوں کے نظریہ کے برعکس عمل کرنا چاہتے تھے۔باوجود اس کے کہ رہبر انقلاب

۱۔نہضت آزادی بخش کی طرف سے شائع کئے گئے پمفلٹ ''انقلاب اور عبوری حکومت'' ص ۳۵ و ۳۶ اور ''انقلاب اسلامی کے بارے میں نہضت آزادی بخش کی پالیسی'' ص ۸۶۔۸۷ ملاحظہ ہو۔

کے فرمان میں ریفرنڈم کا مقصد واضح طور پر اسلامی جمہوریہ کی برقراری بیان ہو چکا تھا اور امام خمینیؒ کے تمام انٹرویو، اعلانیوں اور تقریروں میں آنے والی حکومت کے بارے میں صرف اسلامی جمہوریہ کا ذکر کیا جاتا تھا اور لوگوں کے نعرے بھی حکومت اسلامی اور اسلامی جمہوریہ[1] کی نشاندہی کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود لیبرل بالخصوص عبوری حکومت ''ڈیموکریٹک اسلامی جمہوریہ'' پر اصرار اور تاکید کرتے تھے اور جب تک رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ نے قطعی اور واضح طور پر اعلان کیا کہ: ''میں اسلامی جمہوریہ کے حق میں ووٹ دوں گا، نہ ایک لفظ کم اور نہ ایک لفظ زیادہ[2]'' عبوری حکومت بدستور اپنی پالیسی اور نظریہ پر اصرار کرتی رہی۔

لیکن ''مؤسسین کی مجلس'' کے بارے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب رہبر انقلاب متوجہ ہوئے کہ اگر گزشتہ آئین کے مطابق ''مؤسسین کی مجلس'' نمائندوں کی ایک بڑی تعداد[3] پر مشتمل تشکیل پائے، تو نہ صرف طولانی اور زیادہ بحث و تمحیص کی وجہ سے مناسب وقت پر آئین کا مسودہ آمادہ نہیں ہوگا، بلکہ اس قسم کی مجلس کے اکثر نمائندوں کے فقہی مبانی اور اسلامی احکام سے آگاہی نہ رکھنے کی وجہ سے ممکن تھا تدوین شدہ آئین گزشتہ آئین سے کوئی خاص فرق نہ رکھتا ہو۔ لہذا امام نے فیصلہ کیا گیا کہ ''مؤسسین کی مجلس'' کا نام بدل کر ''مجلس خبرگان'' رکھا جائے اور اس کے اراکین کی تعداد کم کر کے اسلامی جمہوریہ کے آئین کی تدوین کے کام کو سرعت بخشی جائے۔ لیبرل عناصر نے مجلس کی شکل بدلنے کی نہ صرف مخالفت کی، بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے ایک مسودۂ آئین مرتب کر کے پیش کیا، جس میں اکثر اختیارات لوگوں کے منتخبہ صدر جمہوریہ کے لئے رکھے گئے

لیبرل عناصر اور انقلابیوں کے درمیان ایک اور اختلاف، انقلاب دشمن عناصر کے ساتھ

۱۔ لوگوں کے نعروں میں سب سے زیادہ یہ دو نعرے عام تھے: ''استقلال آزادی جمہوری اسلامی'' اور ''نہ شرقی نہ غربی جمہوری اسلامی''

۲۔ صحیفہ نور،، ج ۵، ص ۱۸۱

۳۔ انقلاب سے پہلے کے آئین کے مطابق ''مجلس مؤسسین'' کے اراکین کی تعداد مجلس شورائے ملی اور سینٹ کے مجموع اراکین کے برابر تھی، یعنی ۲۳۰ نمائندہ منتخب کیے جانے چاہیے تھے۔

برتاؤ کے بارے میں تھا۔ظاہر ہے کہ شاہ کی حکومت کے زوال اور طاقت کے بل بوتے پر عمل کرنے والی حکمراں سیاسی نظام کے بکھر جانے کے بعد شاہ کی حکومت اور اسلامی جمہوریہ کے مخالف گروہ اور سرنگوں ہوئے نظام کے حامی گروہ طاقت کے خلا سے استفادہ کر کے نئی حکومت کے نظم وانتظام کو سنبھالنے سے پہلے، انقلاب سے نقصان اٹھانے والی بیرونی طاقتوں کی مدد سے اپنے مقاصد کو پانے کے لئے میدان عمل میں کود پڑنے کے لئے کوشش کریں گے۔انقلاب دشمنوں کی پہلی کاروائی کردستان میں، پھر خوزستان اور اس کے بعد ترکمان صحرا میں شروع ہوئی۔دشمنوں کا سرحدی علاقوں کو منتخب کرنا اور زبان و مذہب کے اختلافات سے استفادہ کرنا بے معنی نہیں تھا۔

عبوری حکومت اور لیبرل عناصر، جو اصولی طور پر قطعی اور شدید برتاؤ کے موافق نہیں تھے، اور خود آقائے بازرگان کے بقول ''نہ علی ؑ کا انصاف اور نہ خمینی کی فیصلہ کن پالیسی'' رکھتے تھے،[۲] جس طرح شہنشاہی نظام سے ٹکر کے دوران اعتدال پسندانہ اور صلح آمیز روشوں کے قائل تھے، اس مرحلہ میں بھی انقلاب مخالف عناصر سے نرمی، بے تفاوتی اور انکساری سے پیش آنے کی پالیسی اپنائی۔وہ کوشش کرتے تھے تا کہ انقلاب مخالف عناصر کو فرصت اور مہلت دیکر، ان کو تحریک اور مداخلت سے روک لیں گے، نیز تصور کرتے تھے کہ ساز باز اور صلح وآشتی ان کو تسلیم ہونے پر مجبور کرے گی۔جب فوجی عملہ کے سربراہ جنرل قرنی نے انقلاب دشمن عناصر کے خلاف قطعی اور شدید اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اس کا مواخذہ کر کے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔

عبوری حکومت کی کردستان، بالخصوص شہر پاوہ کے مسائل میں کوتاہی اور سستی کی یہ حد تھی کہ رہبر انقلاب کو براہ راست مداخلت کر کے فوج کو حکم دینے پر مجبور ہونا پڑا، جس کے نتیجہ میں رضا کارانہ فوج کے حرکت میں آنے سے شہید چمران کی کمانڈ میں پاوہ میں محاصرہ شدہ فوج کی نجات ممکن بن گئی۔

۱۔''نہضت آزاد اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں'' ص ۱۷۲

۲۔''شورای انقلاب اور عبوری حکومت''نہضت آزادی مجلہ ص ۳۳

رہبر انقلاب نے ایثار و جاں نثاری سے انقلاب کو کامیاب کرنے والے انقلابی لوگوں کے بر حق مطالبات ،توقعات اور ضرورتوں کا صحیح اور بروقت درک کر کے اور یہ جانتے ہوئے کہ عبوری حکومت اور گزشتہ حکومت کے بچے کھچے اداری سسٹم لوگوں کے ان مطالبات اور توقعات کو پورا کرنے کی توانائی نہیں رکھتے ہیں ،سرکاری تشکیلات کے مقابلے میں انقلابی اداروں کے قیام کا حکم دیا تو انقلابی عناصر کے لئے اپنی سرگرمیاں شروع کرنے کا موقع فراہم ہوا۔

مجرموں اور خائنوں کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے انقلابی عدالتیں ،ضبط شدہ اموال کو محرومین کی خدمت میں خرچ کرنے کے لئے مستضعفین فاونڈیشن ،محروم افراد کے لئے رہائشی مکانات کا انتظام کرنے کے لئے مسکن فاونڈیشن ،لوگوں کے لئے امن وسلامتی برقرار کرنے کے لئے اور انقلاب دشمن عناصر سے مقابلہ کرنے کے لئے سپاہ پاسدران اور اسلامی انقلاب کی کمیٹیاں اور دیہاتیوں اور پسماندہ علاقوں میں رہنے والوں کی خدمت کے لئے جہاد سازندگی ،من جملہ انقلابی ادارے تھے ،جو معاشرہ کی ضرورتوں کے پیش نظر انقلابی عناصر کے رضا کارانہ طور پر شرعی اور انقلابی فریضہ محسوس کرنے کی بنیاد پر تشکیل پا کر سرگرم عمل ہوئے۔

عبوری حکومت اور لیبرل عناصر نے حکومتی سسٹم کی بہت سی کمزوریوں کی تلافی کرنے اور حکومت کے کاندھوں سے دباؤ کم کرنے والی اس انقلابی حرکت کا استقبال کرنے کے بجائے ،اس کی مخالفت اور ان اداروں کے کام میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کیں ۔اس کے علاوہ قدرت اور فیصلہ لینے کے متعدد مراکز ایجاد کر کے گونا گون مشکلات پیدا کئے ۔انقلابی عدالتوں پر اسلامی عفو و بخشش کے بجائے انتقام لینے کے الزام لگا کر اور لوگوں کی رضا کارانہ حرکت کی تعمیر و ترقی کی صلاحیت نہ رکھنے کے بہانہ سے گلہ اور شکوہ کرنا شروع کیا اور اس بہانہ سے ان انقلابی اداروں کو ضروری مالی وسائل فراہم کرنے میں رکاوٹ بن گئے۔

عبوری حکومت نے مخالفت کی سب سے پہلی آواز اس وقت بلند کی جب شاہ کی حکومت کے چار اعلیٰ فوجی افسروں اور ساواک کے سربراہ کو سزائے موت سنائی گئی ۔جب ہویدا کے خلاف عدالتی

کاروائی اور سزائے موت کا مسئلہ پیش آیا، تو عبوری حکومت سخت پریشان ہوئی اور دوڑ دھوپ کر کے ایک ایسے شخص کے بارے میں، جو تیرہ سال تک شاہ کی حکومت میں وزیر اعظم رہ چکا تھا، اسلامی اور انقلابی عدالت کے حکم کو جاری کرنے میں چند دن تاخیر ایجاد کی اور اسے اپنی بڑی کامیابی شمار کی۔ عبوری حکومت کے لئے جہاد سازندگی کے اقدامات، اسکاوٹ نوجوانوں کے ایک گروہ کے مانند تھے، جو نیک لیکن کم اہمیت کاموں کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے اختیار میں بجٹ اور ضروری پیسہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں مہدی بازرگان نے ۱۹۷۹/۲/۲۸ء کو اپنے ایک ٹی، وی پیغام میں کہا: ''امام کمیٹیاں اور شدت پسند گروہ انقلابی حکومت کے لئے بڑا خطرہ ہیں''۔ اور اس کے چند دن بعد یہ بیان دیا کہ: ''سب سے پہلے ہمیں کمیٹیوں کو ناکارہ بنانا چاہئے [۱]''

حکمراں لیبرل عناصر اور رہبر انقلاب کی سربراہی میں انقلابیوں کے درمیان اہم ترین اور شور وغل پیدا کرنے والا اختلاف، اسلامی جمہوریہ کی خارجی پالیسی کے بارے میں مقاصد اور طریقہ کار تھا، یہ ایک ایسا مسئلہ تھا، جس کا سرانجام عبوری حکومت کا زوال تھا، اس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

الف: امریکہ سے ٹکّر۔

امریکہ کے غیر معمولی طاقت ہونے کا نظریہ اور اس تصور کو نہ صرف لیبرل عناصر قبول کرتے تھے، بلکہ مجاہدین خلق، یہاں تک فدائی خلق گوریلا بھی اس کو قبول کرتے تھے۔ تحریک آزادی کے رہبروں کی نظر میں، شاہ امریکہ کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی تھا اور یہ تصور کیا جاتا تھا کہ لیبرلائزیشن کرنے کی شاہ کی پالیسی، امریکہ کے براہ راست دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ عقیدہ رکھتے تھے، اور انقلاب سے پہلے اعلان بھی کر چکے تھے، کہ استبداد اور سامراج سے ایک ہی وقت میں ٹکر لینا مصلحت کے خلاف ہے اور ہمیں امریکی سامراج کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے، بالخصوص جب کہ وہ خدا مخالف کمیونسٹوں اور ملحدوں کے مقابلہ میں مستحکم دیوار کے مانند کھڑے ہیں۔ مغربی جمہوریت اور اسلامی

۱۔ ''اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں نہضت آزادی کی پالیسیاں'' ص ۲۴ و ۲۵

جمہوریت کے درمیان کافی شباہت اور اشتراک پایا جاتا ہے ممکن ہے یہ دونوں ایک دوسرے کے برابر ہوں۔ اس لئے وہ امریکہ کی طرف سے ملت ایران پر کاری ضرب لگانے کا اعتراف کرنے کے باوجود ۱۹/اگست ۱۹۵۳ء کی سازش اور ڈاکٹر مصدق کے زوال کے اسباب فراہم کرنے کے مانند، امریکہ کے ساتھ تمام سطحوں پر روابط کو تحفظ بخشنے اور انھیں جاری رکھنے کے قائل تھے، اور عملی طور پر بھی انہوں نے اس رابطہ کو فوجی اور اطلاعاتی سطح پر برقرار کیا تھا۔[۱]

ب: انقلاب برآمد کرنا۔

ایران میں امریکہ کے آخری سفیر، ویلیم سولیوان نے لکھا ہے کہ: ایران کی عبوری حکومت امریکہ کے فوجی مشیروں کی ماموریت کو منسوخ کر کے ان کے تمام افراد کو ایران سے نکال باہر کرنے پر موافق نہیں تھی، بلکہ وہ چاہتی تھی کہ امریکہ کا ایران کے ساتھ فوجی تعاون بدستور برقرار رہے اور اس فوجی تعاون اور ہمکاری کو ایران کی مسلح افواج بالخصوص ہوائی فوج کے لئے کارآمد اور ضروری سمجھتی تھی۔[۲]

عبوری حکومت، قبول کئے گئے بین الاقوامی قوانین سے استناد کر کے انقلاب برآمد کرنے اور آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرنے کو دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے اصول کی خلاف ورزی جانتی تھی اور عقیدہ رکھتی تھی کہ انقلاب کو صادر کرنے سے بہتر ہے ایک مثالی اور نمونہ معاشرہ کی تعمیر کریں تاکہ دوسرے اسے اپنا لائحہ عمل قرار دے کر اس کی تقلید کریں۔

عبوری حکومت کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ابراہیم یزدی نے صراحت سے اعلان کیا: ''ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم اپنے انقلاب کو برآمد کریں۔[۳]'' یہ بیان رہبر انقلاب کے واضح نظریہ کے خلاف تھا، جو اعلان کرتے تھے کہ: ''ہم اپنے انقلاب کو پوری دنیا میں برآمد کریں گے۔[۴]'' اس سلسلہ میں

۱۔ ''اسناد لانہ جاسوسی، ج ۱۰۔۹، ص ۹۱۔۹۳

۲۔ ''تہران میں ماموریت'' ص ۱۸۹

۳۔ ''انقلاب اسلامی کے مقابلہ میں نہضت آزادی کی پالیسی، ص ۲۷

۴۔ صحیفہ نور، ج ۱۲ ص ۲۸۴۔۲۸۵

عبوری حکومت اور شہید محمد منتظری کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے ۔شہید محمد منتظری نے سر گرمی کے ساتھ میدان میں اتر کر آزادی کی تحریکوں کی پہلی کانفرنس منعقد کی۔

ج: نہ شرقی نہ غربی کی پالیسی کا منفی موازنہ،

عبوری حکومت اور کلی طور پر لیبرل عناصر کا ''نہ شرقی نہ غربی'' کی پالیسی کا مفہوم صرف وہی عدمی یا منفی موازنہ تھا اور وہ اس اصول سے عالمی سامراج کے خلاف مبارزہ کا مفہوم نہیں لیتے تھے ۔حقیقت میں انہوں نے ''نہ شرقی نہ غربی'' کے اصول کے بارے میں ڈاکٹر مصدق کے منفی موازنہ کے مفہوم کو اپنایا تھا۔جبکہ ''نہ شرقی نہ غربی'' کے اصولی حامی موازنہ کی اصل کو منفی یا مثبت صورت میں خارجی سیاست کے مقصد کا نصب العین جانتے تھے ۔اور مشرق ومغرب کی طاقتوں کو عالمی سامراج کے ایک متحد مجموعہ کی حیثیت میں مسترد کر کے ان کے ساتھ مبارزہ کو اپنی پالیسی کے بنیادی مقاصد جانتے تھے۔[۱]

لیبرل عناصر اور عبوری حکومت کے رہبر انقلاب اور انقلابیوں سے اختلافات اور تضاد روز بروز شدید تر ہوتے جارہے تھے ۔یہ اختلافات اس وقت عروج پر پہنچے جب شاہ امریکہ چلا گیا اور عبوری حکومت نے اس مسئلہ کے بارے میں نرمی اور صلح آمیز پالیسی اپنائی اور اس کے ساتھ ہی عبوری حکومت کے وزیر اعظم نے امریکی صدر کے قومی سلامتی کے مشیر برجنسکی سے الجزائر میں ملاقات کی، جو کہ امریکی سفارت خانہ، جو بعد میں جاسوس خانہ کے نام سے معروف ہوا، پر قبضہ کرنے کا سبب بنا۔باوجود اس کے کہ یہ تحریک لوگوں ،علماء اور رہبر انقلاب کی طرف سے وسیع پیمانہ پر مورد تائید قرار پائی، لیکن لیبرل عناصر کے معیاروں اور پالیسی کے منافی تھی۔عبوری حکومت نے صرف استعفیٰ اور کنارہ کشی ہی میں نجات سمجھی اور اس طرح عبوری حکومت کی نو ماھہ عمر اختتام کو پہنچی۔

اگر چہ مہدی بازرگان نے اپنی تحریروں میں یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کے استعفیٰ کا امریکی سفارت خانہ پر قبضہ سے کوئی ربط نہیں تھا ،لیکن کوئی اس بات پر یقین نہیں کرسکتا ہے کہ اگر

۱۔اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے مصنف کی کتاب ''اسلامی جمہوریہ کی خارجہ پالیسی ،اصول اور مسائل''نشر داد گستر،ص ۱۰۳۔۱۰۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۴ رنومبر ۱۹۸۰ء کو امریکی سفارت پر قبضہ نہیں ہوتا تو کیا عبوری حکومت ۵ رنومبر ۱۹۸۰ء کو استعفیٰ دیتی۔

اس قسم کے افکار کے پیش نظر عبوری حکومت اس کے علاوہ کوئی اور کام انجام نہیں دے سکتی تھی اور اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ ملک کے مسائل کے ساتھ انقلابی رویہ اپنایا جائے۔ بہر حال لیبرل عناصر کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ سیاسی انقلابوں بالخصوص دنیا کے عظیم تاریخی انقلابوں کے بارے میں صحیح درک اور کافی معلومات نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہوئے اور ایک انقلاب میں فطری طور پر پیش آنے والے بعض مسائل کے بارے میں تعجب کرنے لگے۔

مہدی بازرگان انقلاب کی کامیابی کے ایک سال بعد شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ہم انقلاب کی ابتداء میں اتحاد رکھتے تھے لیکن مکتب نہیں رکھتے تھے، البتہ آج مکتب تو ہے لیکن ہمارے پاس اتحاد نہیں ہے''۔ یا ایک دوسری جگہ پر کہتا ہے: ''اصولی طور پر مکتب اور اتحاد آپس میں ایک نہیں ہو سکتے ہیں۔ جس طرح اجارہ داری ذاتی طور پر اتحاد کی دشمن اور عین خود خواہی اور ڈکٹیٹر شپ ہے۔ صرف ایک قسم کا اتحاد مکتب کے ساتھ سازگار ہوسکتا ہے اور وہ اتحاد، شاہ کا اتحاد ہے جس کا اس نے ''حزب رستاخیز'' کی تأسیس کے وقت اعلان کیا ہے[۱]''

یہ اظہارات بھی اسلامی انقلاب کی تبدیلیوں کی روش کے بارے میں اس کے فہم وادراک کی وجہ سے تھے۔ وہ انقلاب کی کامیابی کی علت، مختلف گروہوں کے اتحاد کو جانتا تھا کہ جنہوں نے آپس میں متحد ہو کر شاہ کی حکومت کی سرنگونی کے لئے اقدام کیا۔ جبکہ یہ مطلب تاریخی حقائق اور واقعیت کے مطابق نہیں ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ دائیں اور بائیں نظریات سے تعلق رکھنے والے مختلف گروہ، اسلامی فکر نہیں رکھتے تھے، عوام میں کوئی مقام نہیں رکھتے تھے اور لہذا ان کے لئے امام خمینیؒ کی رہبری میں حرکت کرنے والے لوگوں کی بھاری اکثریت سے جاملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ عوامی تحریک سے

۱۔ ''انقلاب اسلامی کے مقابلہ میں تحریک آزادی کی پالسیاں'' ص ۹۰

مقابلہ کرنے والے ہر شخص کا انجام، بختیار کے مانند تھا۔ جس دن ڈاکٹر سنجابی اور مہدی بازرگان امامؒ کے نظریات اور مطالبات میں تبدیلی ایجاد کرنے کے لئے پیرس گئے اور امام کی فیصلہ کن پالیسی میں کسی قسم کا تغیر ایجاد کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ، تو پھر ان کے لئے رہبر کی اطاعت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، اگر ایسا نہ کرتے تو اپنے آپ کو تباہ و برباد کرتے۔

مغربی ذرائع ابلاغ کا مختلف گروہوں کے ائتلاف کے مسئلہ کا زبردست پروپیگنڈہ کرنے کے باوجود امام نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ: ''ہم نے کسی سے ائتلاف نہیں کیا ہے۔ جو بھی شخص لوگوں کی بات کرے گا وہ ہمارے ساتھ ہے، ورنہ ہمارے ساتھ نہیں ہے[۱]''

دوسرے، مکتبی و غیر مکتبی سارے گروہ غرض، تمام لوگوں کی خواہش، یعنی شاہ کی سرنگونی اور اس کا زوال تھا اور اس غرض سے اپنے ارادوں پر پردہ ڈال چکے تھے کہ حکومت کے زوال کے بعد مناسب موقع فراہم ہونے پر اپنے مطلوبہ نظام کو برقرار کرنے کے لئے اقدام کریں گے اور اپنے اصلی نعروں کا اظہار کئے بغیر لوگوں سے جا ملے تھے۔ مذکورہ مطالب کے پیش نظر، حقیقت میں انقلاب مختلف گروہوں کے ائتلاف کے نتیجہ میں کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ بازرگان کے نظریہ کے برعکس، اکثر انقلابی لوگ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد اتحاد اور مکتب دونوں چیزیں رکھتے تھے اور اتحاد واتفاق کے سایہ میں امامؒ کی رہبری اور ولایت فقیہ کے اصول کو قبول کر کے ، تمام ریشہ

۱۔ ریڈیو اور ٹی، وی سروس کے اناونسر کی طرف سے کئے گئے ایک سوال کے جواب میں امام نے ۱۶ ر نومبر ۱۹۸۰ء کو فرمایا:

سوال: حضرت آیت اللہ؛ آپ نے پیرس میں ''جبہہ ملی'' کے کریم سنجابی سے ایک اہم گفتگو کی ہے، کیا آپ اس سیاسی پارٹی سے مل کر مشترکہ طور پر مبارزہ کریں گے، یعنی ان کے ساتھ ائتلاف کریں گے؟

جواب: میرے کچھ مطالب اور مسائل تھے اور ممکن نہیں ہے کہ میں ان سے ایک قدم پیچھے ہٹوں۔ میں نے اس سے کہدیا کہ ہمارا کسی خاص پارٹی سے ائتلاف نہیں ہے۔ پوری ملت ہمارے ساتھ اور ہم ملت کے ساتھ ہیں۔ اور جو بھی ہمارے مطالب سے موافقت کرے گا وہ ہمارے گروہ اور ملت سے ہے۔ ہمارے مطالب، ملک کی مکمل آزادی اور سلطنتی حکومت کی جگہ پر اسلامی جمہوریہ کا قیام ہے ، جو ہماری ان چیزوں سے موافقت نہ کرے اس نے اسلام کی مصلحتوں کے برخلاف قدم اٹھایا ہے اور ہم اس کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتے اور جو ہمارے ساتھ موافقت کریں گے، ہم بھی ان کے ساتھ یک صدا ہو جائیں گے، لیکن ہمارا کسی سے خاص رابطہ نہیں ہے۔

دوانیوں اور بحرانوں کے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کر کے ان پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

مہدی بازرگان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ علماء اور انقلاب کے رہبروں نے اعتدال پسندوں سے ترقی کی ایک سیڑھی کے مانند استفادہ کیا۔ یہ شہید بہشتی اور آیت اللہ خامنہ ای کے بیانات سے ظاہر ہے کہ انہوں نے کہا تھا: ہم اس زمانہ میں کسی دوسرے شخص کو نہیں پہچانتے تھے جو حکومت کے لئے مناسب ہو“

البتہ یہ ایک بدیہی اور بالکل قابل درک مسئلہ تھا، کہ اگر جناب مہدی بازرگان بھی اس وقت انقلاب کے رہبروں سے پوچھتے کہ آپ لوگوں نے کیوں مجھے چن لیا ہے؟ تو وہ یہی جواب پاتا اور قطعاً اگر ان حالات میں زیادہ مناسب تر اور معروف افراد ہوتے تو، انقلاب کے رہبر کبھی اعتدال پسندوں اور لیبرل عناصر کے پیچھے نہ جاتے۔

بہر حال لیبرل عناصر نے اپنی باری میں انقلاب کی حرکت میں اپنا رول ادا کیا اور اس سے زیادہ ان سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی بھی تصور کرتے ہیں کہ حکومت چلانے کے لئے بہترین اور مناسب ترین انقلابی افراد تھے۔ انقلاب کی ابتداء میں ان کے چند سالہ تجربہ کے پیش نظر ثابت ہوا ہے کہ وہ انقلابی معاشرہ کو چلانے کے لئے نہ طاقت، نہ حیثیت اور نہ لوگوں کی حمایت رکھتے ہیں، لہذا بہتر ہے کہ وہ انقلاب کی تبدیلیوں کی روش میں اپنے رول کو خاتمہ یافتہ جان لیں۔

دوسرا مرحلہ:

مخلوط حکومت

''خط امام'' کے پیرو یونیورسٹی کے طالب علموں نے، امریکہ کی طرف سے شاہ کو پناہ دینے اور وزیر اعظم بازرگان کی امریکی صدر کے قومی سلامتی کے مشیر برجنسکی سے ملاقات کے خلاف اعتراض کے طور پر ۴ رنومبر ۱۹۸۰ء کو تہران میں امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کیا۔ اس اقدام کا ایران اور عالمی سطح پر وسیع انعکاس ہوا۔ طالب علموں کی کاروائی کا انقلابی عوام کی طرف سے جو زبردست اور وسیع استقبال ہوا، انقلاب کے بعد اس کی مثال نہیں ملتی۔ اچانک لوگوں نے وسیع پیمانہ پر امریکی سفارت خانہ کے سامنے مسلسل اجتماع اور مظاہرے کر کے، عبوری حکومت کی قدامت پسندانہ پالیسی کے نتیجہ میں ان کے وجود پر محیط قید و بند کی دکھ درد کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس طرح ایک ناگہانی دھماکہ کی صورت میں عبوری حکومت کے نو ماہہ سلسلہ کو متوقف کر کے انقلاب کے بعد ایران کی سیاسی، اجتماعی روش میں بے مثال انقلابی سرعت پیدا کی۔ اسی وجہ سے اس عوامی حرکت کو ''دوسرا انقلاب'' کہا جاتا ہے اور رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ کے بقول یہ انقلاب پہلے انقلاب سے عظیم تر تھا۔

سفارت پر قبضہ کرنے کی کاروائی نے داخلی طور پر لیبرل عناصر اور اعتدال پسندوں کی حاکمیت کا خاتمہ کیا۔ جس طریق کار کی حرکت ان کے زمانہ میں شروع ہو کر جاری تھی، اس کا مقصد انقلاب کی تحریک کو سست کر کے لوگوں کو میدان سے خارج کرنا اور ان کی مجاہدتوں کی کوششوں کو ضائع کرنا تھا اور نزدیک تھا کہ مشروطیت اور تیل کو قومیانے کی تحریک کے مانند یہ حرکت بھی اپنے اصلی اور اعلان شدہ راستہ سے ہٹ جائے کہ اچانک سفارت پر قبضہ کرنے کی حرکت نے ایک نئی صورت اختیار کر کے انقلاب کی تحریک کو پھر سے اپنی اصلی راہ پر لا کر اسے اپنی پہلی سرعت پر گامزن کر دیا۔

دوسری جانب سے امریکی سفارت خانہ کے اسناد فاش ہونے سے بعض حکمراں لیبرل عناصر کے اصلی چہروں سے پردہ ہٹ گیا، جن کے بارے میں لوگ ابھی تک بے خبر تھے، اور ان کے لئے واضح ہوگیا کہ اگر انقلاب کے بعد لیبرل عناصر حکومت میں کوئی مستحکم اور پائیدار مقام حاصل کرتے تو پھر ان کو آسانی کے ساتھ اقتدار سے ہٹانا ممکن نہیں تھا، اور اس طرح ایک بار پھر انقلاب اپنی اصلی راہ سے ایک نسل تک کے لئے ہٹ جاتا۔

امریکہ نے خاص طور پر اپنی تمام امیدیں حکمران لیبرل عناصر سے وابستہ کر رکھی تھیں اور امید رکھتا تھا کہ اپنے گزشتہ منافع کو ان کی حکومت کے ذریعہ ایک دوسری صورت میں تحفظ بخش سکے گا لیکن یونیورسٹی طلاب کی اس تحریک سے امریکہ یأس و نا اُمید سے دوچار ہوا۔

داخلی انقلاب دشمن عناصر من جملہ کمیونسٹ گروہ اور اشتراکیت کا تمائل رکھنے والے عناصر، امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کرنے سے متاثر ہوئے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں صرف یہی ایک حربہ تھا کہ انقلاب اور انقلابیوں پر مغرب نواز اور امریکی ہونے کی لیبل لگائیں، عبوری حکومت کی کارکردگی سے اس کا یہ بہانہ تقویت پاچکا تھا۔ لیکن یونیورسٹی طلاب کی اس کاروائی سے ان کا یہ بہانہ ختم ہوگیا۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان انقلابی گروہ اس قسم کا خطرناک کام انجام دے سکے گا اور وہ بھی ایک ایسی حالت میں کہ انقلاب کے بعد معاشرہ کو امن وسلامتی کی احتیاج کے ساتھ ساتھ جنگ سے گریز اور دوری اور نئے نظام کو مستحکم کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ لہذا ان گروہوں نے چند دن تک اس سلسلہ میں ہر قسم کے اظہار نظر کرنے سے اجتناب کیا اور جونہی لوگوں کی نظروں میں اپنی حیثیت کو خطرہ سے دوچار ہوتے دیکھا تو انھیں خط امام کے طالب علموں کے اس اقدام کی حمایت کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نظر نہیں آیا۔

سفارت کے اسرار فاش ہونے کے نتیجہ میں امریکی حکومت اور سی، آئی، اے کی تیس سالہ کوششوں پر پانی پھر گیا اور مناسب وقت پر استفادہ کرنے کے لئے ایرانی معاشرہ کے اندر ان کے

نفوذ اور اپنے مطلوبہ فائدوں کے تحت جاسوس بھیجنے کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ اس طرح ایرانی معاشرہ کئی برسوں تک اجنبیوں کے نفوذ کرنے والے عناصر کے شر سے محفوظ ہو گیا۔

دوسری طرف سے اس اقدام کے نتیجہ میں امریکی جاسوسی ایجنسی cia کے بہت سے اسرار اور علاقہ کی دوسری جاسوسی ایجنسیوں کے ساتھ اس کے روابط اور طریقہ کار فاش ہوئے، جس کی وجہ سے علاقہ میں امریکی جاسوسی اور اطلاعاتی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

عبوری حکومت کے زوال اور امریکی سفارت خانہ کے اسرار فاش ہونے کے سبب حکومتی اداروں میں کسی نہ کسی طرح نفوذ کئے ہوئے یا پہلے سے بچے کھچے غیر انقلابی اور انقلاب دشمن عناصر کا فوری طور پر صفایا ہوا اور ذمہ دار حزب اللٰہی افراد کے لئے حکومت کے اداروں میں سرگرم عمل ہونے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس کے علاوہ امریکی سفارت پر قبضہ کرنا تمام انقلابی، پابند اور ذمہ دار حزب اللٰہی عناصر کے اتحاد و یکجہتی کا سبب بنا اور ان میں بڑے خطرات اور دھمکیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو گئی، اور امریکہ، جسے فراموش کیا جا رہا تھا، دوبارہ ملک کے دشمن نمبر ایک کے عنوان سے انقلابی لوگوں کے ذہنوں میں اُجاگر ہوا۔

لیکن بین الاقوامی نقطہ نظر سے، وقت کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک کے سفارت خانہ پر قبضہ کرنا اور اس کے انتہائی اہم اسرار تک رسائی حاصل کرنا اور مذکورہ بڑی طاقت کی اس بحران کو حل کرنے میں عدم توانائی، نے گہرے اثرات چھوڑ دیئے۔ دوسری جانب سے اس اقدام کے نتیجہ میں مغربی معاشرہ کے اپنے سامراجی تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے نفوذ کو ممکن بنانے کی غرض سے ایجاد کی گئی بین الاقوامی معیاروں پر مبنی تقدس اور حرمت درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ڈپلومیٹک تحفظ کے اس مفروضہ کے بہانے، کہ سفارت خانہ متعلقہ ملک کی سرزمین ہوتی ہے، تخریب کاریاں، جاسوسی اور سازشیں انجام دینے کے لئے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا ناممکن بن گیا اور سفارت خانوں کے بارے میں دنیا کے معاشروں اور حکومتوں پر ٹھونسی گئی فرضی امن و سلامتی اور تحفظ کی کوئی ضمانت باقی

نہیں رہی۔

مجموعی طور پر تیسری دنیا کا جیسا ایک چھوٹا ملک مذکورہ خصوصی حق سے امریکہ یا سابقہ سوویت یونین کی سرزمین پر اپنے میزبان ملک کے خلاف غیر معمولی اقدامات کے لئے استفادہ نہیں کرسکتا تھا، جبکہ بڑی طاقتوں نے مذکورہ اجارہ داری سے استفادہ کر کے، اپنے سفارت خانوں کو چھوٹے ممالک کے اندورونی معاملات میں مداخلت، حکمرانی، تسلط جمانے، تختہ الٹنے کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے مرکزوں میں تبدیل کیا تھا۔ امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کرنے سے قطعاً اس قسم کا ناجائزہ فائدہ اٹھانے کا امکان تمام ممالک میں اپنی کم ترین حد تک پہنچا اور اب بڑی طاقتوں اور ان کے سٹلائٹوں کو سازشیں انجام دینے کی ضمانت نہیں ملے گی۔[1]

امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کرنے کی وجہ سے اسلامی انقلاب کا امریکہ کے ساتھ براہ راست مقابلہ شروع ہوا اور استقامت اور پائیداری کے نتیجہ میں امریکہ کی تمام سازشوں کو ناکام بنانے کے سبب امریکی سیاستمداروں، خاص کر کارٹر کی حکومت اور اس کے بعد ریگن کی حکومت کو ایک بڑی رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ امریکی حکومت ابھی شاہ کو کھو دینے کے کاری ضرب کا مرہم نہ کرسکی تھی، اور اس سوال کا جواب بھی حاصل نہیں کرسکی تھی کہ ایران کو کس نے کھو دیا؟ اچانک پہلی ضرب سے زیادہ بھی مہلک ضرب سے دوچار ہوئی یعنی تمام مادی اور فوجی طاقت رکھنے کے باوجود جوابی حملہ کرنے سے عاجز رہی۔

یہ مسئلہ دنیا میں امریکی افسانوی زبردست طاقت کے لئے ایک بڑی رسوائی کا سبب بنا اور پہلی بار یہ ثابت ہوا کہ ایک چھوٹا لیکن مصمم ارادہ والا ملک امریکہ جیسی ایک بڑی طاقت سے ٹکّر لے سکتا ہے اور یہاں تک کہ اسے عاجز کر کے شکست قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

اس طرح ایران نے تمام مستضعف ملتوں کے لئے بڑی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کا راستہ دکھایا

۱۔ اصولی طور پر تیسری دنیا کے ممالک، امریکی سفارت خانہ میں فاش شدہ اسرار اور حقائق سے استناد کر کے، اس ڈیپلومیٹک اجارہ داری اور خصوصی حق کے بارے میں نظر ثانی کی درخواست کرسکتے ہیں اور اس قسم کے خصوصی حقوق اور اجارہ داری سے سوء استفادہ کرنے کو روکنے کے لئے ایک قسم کی نگرانی اور نظارت فراہم کرسکتے ہیں۔

اور ثابت کیا کہ اتحاد، اتفاق، استقامت اور شجاعت کے ساتھ بڑی سامراجی طاقتوں پر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

صدر جانسن اور صدر کارٹر کی حکومت میں اہم عہدوں پر فائز ''ماکفر گوسون'' اور ''ہولبروگ'' اس سلسلہ میں کہتے ہیں:

''حقیقت میں یرغمالیوں کے بحران نے (ایران کے انقلاب کے نتیجہ میں) بدحواس ہوئے ملک (امریکہ) کو کھولتے پانی کی دیگ کے مانند بنادیا۔ صحرا میں جلتے ہوئے ہیلی کواپٹروں کا مسئلہ ایک محدود مقصد کو حاصل کرنے کے لئے امریکہ کی ناتوانائی کی علامت بن چکا تھا کہ بیشک اس کے لئے اپنے شہریوں کو ایک ملت سے آزاد کرنا تیسرے درجہ کا مسئلہ تھا۔[1]''

امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں، لیبرل عناصر دو گروہوں میں تقسیم ہوئے:

پہلا گروہ، عبوری حکومت کے ارکان اور پہلے سے علیحدہ رکھے گئے افراد پر مشتمل تھا۔ اس گروہ نے خط امام کے پیرو طالب علموں کے اقدام کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ ان میں مہدی بازرگان نے یونیورسٹی طالب علموں کے اقدام کی شدت سے مذمت کی اور اعلان کیا کہ ملک کی اداری اور سیاسی مسؤلیت اور بین الاقوامی معاہدات کے مطابق غیر ملکی نمائندوں اور باشندوں کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری کے پیش نظر وہ اس قسم کے اقدام کی مخالفت کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک اور جگہ پر[2] کہتا ہے:

''یونیورسٹی طالب علموں کی جانب سے انجام دیا جانے والا یہ کام انتہائی ناشائستہ اور جرم ہے اور سب اس کام کے مخالف ہیں۔ ان کا یہ کام انقلاب، اسلام، امام اور تمام چیزوں کے خلاف ہے۔ طالب علموں کے ماضی، حال اور مستقبل میں فاش کئے جانے والے اسرار میں سے کچھ جھوٹ ہے[3]''

1.C.P.Ioanmides'Opcit p'139

۲۔ ''انقلاب دو حرکتوں میں'' مہدی بازرگان، ص ۹۴

۳۔ ''انقلاب اسلامی کے مقابلہ میں تحریک آزادی کی پالیسیاں'' ص ۲۹

اس سلسلہ میں ایک سال کے بعد یوں کہتا ہے:

''یرغمالی کا موضوع اس کے نتائج کے ساتھ پیش آیا، مجھے خود یرغمالی سے کوئی کام نہیں ہے لیکن اس کے بعد پیش آنے والے نتائج اور خطرات، ایران کا تقریباً تمام دنیا، یہاں تک اسلامی ممالک سے الگ تھلگ ہو کے رہ جانا، اقتصادی بائیکاٹ، طبس کے واقعہ کے بارے میں انسان توجیہ نہیں کرسکتا ہے کہ خداوند متعال نے کس طرح ملک، امام اور ملت کو بچالیا، اس کے بعد وہ ناکام سازشیں اور دوسری چیزیں۔[۱]''

عبوری حکومت کے وزیر خارجہ، ڈاکٹر یزدی نے، حادثہ کے ایک روز بعد ایک انٹریو میں کہا:

''اسلامی جمہوریہ کی حکومت، غیر ملکی باشندوں کی جان و مال کا تحفظ کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ہم حکومت کے عنوان سے اس قسم کا حادثہ پیش آنے پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔[۲]''

لیبرل عناصر کا ایک اور گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ابھی اہل اقتدار نہیں تھے اور خود کو عبوری حکومت کی سرگرمیوں سے علٰحیدہ کر چکے تھے اور کبھی اس کی تنقید بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ اسلامی جمہویہ کی نظر میں اپنے مستقبل کی حفاظت کے لئے اور اس فرصت سے استفادہ کرنے کی امید میں، ایک طرف سے محبوبیت حاصل کرنے کے لئے اور دوسری طرف سے عوامی حرکت سے ٹکر نہ لینے کی خواہش اور ارادہ کی وجہ سے، پیچیدہ حکمت عملی کو اپنائے ہوئے تھے۔ انہوں نے ابتداء میں ضمنی طور پر سفارت پر قبضہ کے مسئلہ کی تائید کی اور یہاں تک کہ سفارت خانہ کے سامنے منعقدہ مظاہروں میں تقریریں بھی کیں۔ ان میں بنی صدر اور قطب زادہ کے نام قابل ذکر ہیں جو صدر جمہوریہ بننے کے خواب دیکھتے تھے۔ ریرایڈمرل مدنی جیسے دوسرے لوگ کھلم کھلا اظہار نظر کرنے سے پرہیز کرتے تھے، لیکن دل سے اس حرکت کے موافق نہیں تھے۔

بنی صدر اپنی ''تین دنیا'' کی تھیوری پیش کر کے یورپ اور جاپان کی حمایت کو ضروری سمجھتا

۱۔ ''انقلاب اسلامی کے مقابلہ میں نہضت آزادی کی پالیساں'' ص ۹۸۔

۲۔ ''امپریلزم کے ذخائر'' ص ۷۷

تھا اور عقیدہ رکھتا تھا کہ بین الاقوامی نظام پر حاکم اقتدار سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ہے، اس لئے اس نے ایک مختلف موقف اختیار کیا تھا۔ ایک طرف سے بیرونی ممالک کے خبر نگاروں سے بات کرتے ہوئے قصوروار فریق کی مخالفت کرتا تھا اور کہتا تھا:

''میں انسان کے قیدی ہونے کے مسئلہ کو مکمل طور پر سمجھتا ہوں لیکن یہ مسئلہ ایک مسئلہء زندانی ہے، حالانکہ ہماری ملت، کا اصل مسئلہ اس رنج دیدہ ملت اور بشریت کا مستقبل ہے''

مزید کہتا ہے:

''اس وقت ہم ایک انجام دیئے گئے کام کے مقابلہ میں قرار پائے ہیں اور ہم زبردستی امریکی سفارت خانہ کو خالی نہیں کر سکتے ہیں۔[۱]''

جبکہ انقلابی لوگوں کے سامنے عوام کو فریب دینے کی حالت میں کہتا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ امریکی سفارت پر قبضہ کرنا ایک چھوٹے گروہ کے عمل کے علاوہ ایک مقصد کے لئے اقدام ہے، یہ عمل پوری ملت کا اعتراض ہے۔[۲]''

بہرحال زیادہ مدت نہیں گزری کہ لیبرل عناصر کا یہ گروہ بھی طالب علموں کے اقدام کی مخالفت پر اتر آیا اور ان کے اس کام کی مذمت کی۔ مثال کے طور پر بنی صدر نے نومبر ۱۹۸۱ء میں، یعنی سفارت پر قبضہ کرنے کے ماجرا کے دو سال بعد اپنی باطنی نیت کو ظاہر کرتے ہوئے طالب علموں کے اقدام پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

''میں کبھی ایک غیر ملکی سفارت خانہ پر تجاوز کو ایک بہادرانہ کام نہیں سمجھتا ہوں۔ یرغمالی کا مسئلہ انقلاب کے پیغام کو دنیا والوں تک پہنچنے میں رکاوٹ کا سبب بنا۔ حقیقت میں یرغمالی مسئلہ نے ایران کے انقلاب کو منحرف کر دیا، کیونکہ ہم نے حقوق کے نام پر انسانی حقوق

۱۔ ''امپریلزم کے ذخائر'' ص۲

۲۔ ''اخبار انقلاب اسلامی'' مورخہ ۶ نومبر ۱۹۸۰ء کا اداریہ

اور آزادی کے لئے انقلاب برپا کیا ہے۔ یرغمالی قضیہ اس امر کا سبب بنا کہ امریکہ ایک انتہائی انسانی اور زیبا انقلاب کو درک نہ کرے اور ایک فقیر ملک کے انقلاب کی ناکامی کا باعث بنے[۱]"

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ لیبرل عناصر کے حکمران افراد میں سے ہر ایک، لوگوں کے افکار کو جذب کرنے اور امریکہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے یرغمالیوں کے مسئلہ کو مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ابتداء میں بنی صدر وزیر خارجہ کے عہدے پر فائز تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں حاضر ہو کر، اس کونسل کے ارکان کے منصوبہ اور نظریات کو قبول کرنے کے سلسلہ میں اقدام کرے۔ لیکن رہبر انقلاب نے سلامتی کونسل کے ارکان کے موقف کے بارے میں مکمل آشنائی رکھنے اور ایران کی مذمت کے احتمال کے پیش نظر، اس سفر کی مخالفت کر کے اسے روک لیا، اس کے بعد بنی صدر نے کوئی وجہ بتائے بغیر وزیر خارجہ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔

صادق قطب زادہ نے بھی، جو کہ بنی صدر کے بعد وزیر خارجہ بنا تھا، یرغمالیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خفیہ طور پر کوششیں شروع کیں اور انقلابی شوریٰ کے ارکان کی بے خبری میں اور امام خمینیؒ کو بتائے بغیر "کریسٹیاں بورگہ" نامی ایک فرانسیسی شخص اور "ویلانون" نامی ایک ارجنٹائنی شخص کے ذریعہ وائٹ ہاؤس کے عہدہ داروں سے رابطہ برقرار کر لیا۔ اس نے یورپ کے اپنے ایک سفر کے دوران خفیہ طور پر وائٹ ہاؤس کے رئیس "ملتن جرڈن" سے بھی ملاقات کی اور اس طرح کوشش کی کہ ایک طرف سے داخلی سطح پر انقلابی عناصر اور خط امام کے پیرو طالب علموں کی رضامندی حاصل کرے اور دوسری طرف سے امریکی حکومت کے سرکاری عہدہ داروں کی رضامندی حاصل

۱۔ "امپریلزم کے ذخائر" ص ۹۰

کر کے کوئی راہ حل نکالے۱۔

لیبرل عناصر کے دوسرے افراد میں سے صادق طباطبائی تھا، جس نے امریکیوں سے خفیہ روابط برقرار کئے۔ اس نے امریکی نائب وزیر خارجہ ''وارن کریسٹوفر'' سے ملاقات کی اور مسئلہ کو حل کرنے کا کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ مذکورہ تینوں افراد صدر جمہوریہ کے امیدوار تھے اور مقابلہ کے ضمن میں امید رکھتے تھے کہ یرغمالیوں کے بحران کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ووٹ حاصل کرنے کے علاوہ عالمی معاشرہ کی حمایت کو بھی حاصل کر سکیں۔۲

مہدی بازرگان اس گروہ کے دفاع میں یوں کہتا ہے:

''ایران کے حکومتی ذمہ دار بین الاقوامی سطح پر انقلاب اور مملکت کی عزت و آبرو کے بارے میں خاص خیال رکھتے تھے اور مملکت کے لئے ناقابل برداشت اور خطرناک اقتصادی، فوجی اور سیاسی ردعمل کے فکرمند تھے، اس لئے اصولی توافق کے لئے کوشش کرتے تھے۔۳''

انقلابی شوریٰ کی نو ماہہ حکومت کے دوران باضابطہ طور پر صرف مندرجہ ذیل دو اہم اور بنیادی مسائل تھے:

۱۔ یرغمالی مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے۔

۲۔ اسلامی جمہوریہ کے آئین کی منظوری کے لئے ریفرنڈم کرانا، صدر جمہوریہ اور پارلمنٹ کے چناؤ کرانا۔

۱۔ اس موضوع کے بارے میں بیشتر معلومات حاصل کرنے کے لئے، کتاب ''بحران'' تالیف ''ہاملٹن جرڈن'' ترجمہ ''محمود مشرقی'' ''انتشارات ھفتہ، ملاحظہ ہو۔

۲۔ یرغمالیوں کے سلسلہ میں متعدد کتابیں شائع کی گئی ہیں اور اکثر کتابوں کا فارسی ترجمہ کیا گیا ہے۔ من جملہ کتابوں میں سے جمی کارٹر کی کتاب ''وفای بہ عہد'' زبیگنیو برجنسکی کی ''قدرت واصول وخاطرات'' قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح ''پیری لینجر نے اپنی کتاب'' ''ایران میں یرغمالی اور تہران کے خفیہ مذاکرات'' (ترجمہ ثقفۃ الاسلامی انتشارات نوین) نے یرغمالیوں کو آزاد کرانے کے لئے لیبرل عناصر کی پس پردہ سرگرمیوں کو تحریر کیا ہے۔

۳۔ ''انقلاب دو حرکتوں میں'' ص ۹۸

اس دوران ملک کے اہم اور حساس عہدوں من جملہ صدر جمہوریہ اور مجلس شورائے اسلامی (پارلیمنٹ) کی نمائندگی حاصل کرنے کے لئے خط امام اور لیبرل عناصر کے درمیان زبردست مقابلہ رہا۔

صدر جمہوریہ کے عہدہ کے لئے حزب جمہوری اسلامی کے امیدوار جلال الدین فارسی کی کنارہ کشی اور شہید ڈاکٹر آیت کو اس پارٹی کی طرف سے امیدوار کی عنوان سے منظوری نہ دینے کی وجہ سے اس کی کنارہ کشی نے صرف لیبرل عناصر کے نمائندوں کے لئے انتخابی مہم کا میدان ہموار کیا۔ بنی صدر، پہلے سے منظّم منصوبہ بندی کے تحت وسیع حکمت عملی کو بروئے کار لاکر اور لوگوں کے اس تصور کی بنا پر کہ اس کو رہبر انقلاب کی حمایت حاصل ہے، اکثریت آراء کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اسلامی جمہوریہ ایران کے پہلے صدر جمہوریہ کے طور پر منتخب ہوا۔ اس طرح لیبرل ازم، حاکمیت اور سیاسی نظام کی سربراہی پر بدستور باقی رہا۔

لیکن خط امام سے مربوط عناصر نے، لوگوں میں علماء کے وسیع اثر ورسوخ اور رہبر انقلاب کی نصیحتوں کے پیش نظر اپنی پوری طاقت پارلیمنٹ کے نمائندوں کے چناؤ پر لگادی اور اس راستہ میں لیبرعناصر اور کمیونسٹوں کے سخت مقابلہ کے باوجود پارلیمنٹ میں نمائندوں کی بھاری اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح حکومت کے بنیادی عہدے دو گرہوں میں تقسیم ہوئے اور اپنی پسند کی حکومت تشکیل دینے کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ کے درمیان شدید مقابلہ اور کشمکش کا آغاز ہوا۔ پارلیمنٹ، امامؒ کی ہدایات پر ایک مکتبی وزیر اعظم کے انتخاب کے لئے اصرار کر رہی تھی۔

امام خمینیؒ نے اس سلسلہ میں فرمایا:

”پہلے سے میں نے احساس ذمہ داری کے مطابق عبوری حکومت تشکیل دی، ہم نے غلطی کی۔ ہمیں پہلے سے ہی ایک ایسی حکومت کو تشکیل دینا چاہئے تھا جو فیصلہ کن اور جوان ہو اور ملک کو چلا سکتی ہو، نہ ایک ایسی حکومت کو تشکیل دینا چاہئے تھا جو یہ کام انجام دینے کی

صلاحیت نہ رکھتی ہو، البتہ اس وقت ہماری نظر میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے ہم منتخب کرتے۔ منتخب ہوا اور خطا ہوئی اور، اب جبکہ پارلیمنٹ میں حکومت تعیین ہونے والی ہے، لہذا میں پارلیمنٹ کو یہ بات بتانا چاہتا ہوں کی انہیں ایک متدین اور سو فیصدی قطعی اسلامی حکومت منتخب کرنی چاہئے۔ اگر ایک بھی وزیر موجودہ وزیروں کے مانند ہو تو اسے قبول نہ کریں۔ تمام وزراء کے بارے میں فرداً فرداً تحقیق کی جانی چاہئے۔ وزیر متدین، سو فیصدی انقلابی، مکتبی اور قطعی ہونا چاہئے۔ اگر ہماری حکومت سابقہ حکومت کے مانند ہو اور ویسی ہی حالت اور نظریہ رکھتی ہو تو ہمیں اس تحریک پر فاتحہ پڑھنا چاہئے ...... پارلیمنٹ کو فیصلہ کن ہونا چاہئے۔[1]''

امام کی طرف سے اس حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کے پیش نظر پارلیمنٹ اپنے موقف پر پائیدار اور ثابت قدم رہی اور بنی صدر کی طرف سے وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے پہلا امیدوار حزب جمہوری سے تجویز کئے جانے کے باوجود مجلس نے اسے اعتماد کا ووٹ نہیں دیا اور سرانجام ایک مدت تک تلاش، کوشش، تحقیق اور ایک مشترک کمیٹی تشکیل دینے کے بعد شہید محمد علی رجائی[2] پر اتفاق ہوا اور وہ اسلامی جمہوریہ ایران کے دوسرے وزیر اعظم کے طور پر منتخب ہو کر سرگرم عمل ہوا۔

اس کے باوجود، لیبرل عناصر اور خط امام والوں کے درمیان اختلاف و کشمکش جاری رہی اور یہ مسئلہ بنی صدر اور شہید رجائی کے درمیان کابینہ کے وزیروں کے انتخاب پر زیادہ واضح ہوا۔ ایک طرف سے بنی صدر ایک کروڑ دس لاکھ حاصل کئے گئے ووٹوں کے بل بوتے پر عقیدہ رکھتا تھا کہ وزیر اعظم کو صدر جمہوریہ کے پروگراموں سے ہماہنگ ہونا چاہئے اور دوسری طرف سے آئین کے مطابق

۱۔ الصحیفہ نور، ج ۱۲، ص ۴و ۲۵۳-۲۵۴

۲۔ جناب محمد علی رجائی وزارت تعلیم کے ایک استاد تھے اور متدین و متعہد مبارزین میں سے تھے ۱۹۶۳ء سے امام کی تحریک کے ساتھ تھے اور شہید باہنر کے ساتھ شاہ کے خلاف مبارزہ شروع کر چکے تھے اور برسوں زندان اور ساواک کی طرف سے جسمانی اذیت و آزار کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ وہ انقلاب کے بعد وزارت تعلیم کے سربراہ مقرر ہوئے تھے۔

حکومت وزیر اعظم کی سرپرستی میں پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار اور جواب گو تھی اور اس سلسلہ میں صدر جمہوریہ کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی ۔اس مشکل نے بالخصوص وزرائے تجارت ، اقتصاد و مالیات اور خارجہ کے انتخاب کو ایک مدت تک کیلئے التوا میں ڈال دیا اور بنی صدر کے معزول ہونے تک شہید رجائی کی کابینہ وزیر خارجہ کے بغیر تھی ۔[ا]

شورائے انقلاب کی حکومت کے دوران واقع ہونے والے اہم حوادث اور واقعات میں وہ نئی سازشیں تھیں جو بیرونی طاقتوں اور ان کے ایجنٹوں کے ذریعہ انجام پائیں ۔ان میں سے بعض اہم حسب ذیل ہیں :طبس میں امریکہ کا تجاوز ،نوژہ میں تختہ الٹنے کی ناکام سازش ، یونیورسٹیوں سے اشتراکی عناصر کا صفایا اور ثقافتی انقلاب کا آغاز ۔

الف)طبس کا حادثہ:

جب امریکہ صلح آمیز اور سیاسی مذکرات کے ذریعہ یرغمالیوں کا مسئلہ حل کرنے میں ناامید ہوا تو اس نے یرغمالیوں کو نجات دلانے کے ایک منصوبہ کے بہانہ سے اسلامی جمہوریہ کے نظام کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کیا ۔اور پہلے سے بنے ہوئے ایک دقیق پروگرام کے تحت ۵ رمئی ۱۹۸۰ء کو آٹھ ہیلی کواپٹروں اور ۱۳۰ انمبر کے تین ہوائی جہازوں کے ساتھ ایران کی سرزمین پر تجاوز کیا ۔لیکن اس تجاوز آمیز کاروائی کی ابتداء میں ہی ہیلی کواپٹروں ، ایک جہاز اور نو فوجیوں کی نابودی کے نتیجہ میں امریکی حکومت کی سابقہ ناکامیوں میں ایک اور شرم ناک شکست کا اضافہ ہوا ۔

اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ اس کاروائی میں امریکہ کی شکست ایک معجزہ تھی اور یہ صرف نصرت الٰہی تھی جو رات کی اس تاریکی میں ، جب تمام انقلابی مسلمان سوئے ہوئے تھے ،ملت ایران کی نصرت ویاری کے لئے آگے بڑھی اور طوفانی ریت کے ذریعہ پیچیدہ ترین ٹیکنالوجی کے سسٹم کو ناکارہ بنا دیا اور اس طرح مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک بار پھر اصحاب فیل کی داستان کو زندہ کر دیا ۔

اس سلسہ میں صرف اور صرف جس چیز کا اضافہ کیا جا سکتا ہے ، وہ بنی صدر کے مجرمانہ اقدام

ا ۔یہ مشکل آئین میں ترمیم کے ذریعہ وزیر اعظم کے عہدہ کو حذف کر کے صدر جمہوریہ کو اجرائی امور کا رئیس اور مسئول بنانے کے بعد حل ہوئی ۔

کی طرف اشارہ ہے۔ اس نے صدر جمہوریہ اور کمانڈر انچیف کے عنوان سے طبس میں باقی ماندہ امریکی ہیلی کو اپٹروں پر بمباری کا حکم دے کر اہم اسرار پر مبنی اسناد کو نابود کرا دیا اور ملت ایران کو ان اسرار پر دست رسی سے محروم کیا۔[1]

ب) نوژہ تختہ الٹنے کی سازش۔

سابقہ حکومت سے وابستہ فوجیوں کی بعض لیبرل عناصر کی طرف سے مدد اور امریکی جاسوس ایجنسی سی، آئی، اے کی حمایت سے تختہ الٹنے کی سازشوں میں سے ایک سازش جو اسلامی انقلاب کی تاریخ کے اس موڑ پر واقع ہوئی، ''نوژہ تختہ الٹنے کی سازش'' کا منصوبہ تھا، جو خط امام کے عناصر کی بر وقت ہوشیاری کے نتیجہ میں طشت از بام ہو کر ناکام ہوا۔ اگر چہ مذکورہ سازش کے تمام اسرار ابھی تک فاش نہیں ہوئے ہیں، لیکن جہاں تک اس سازش سے مربوط بعض افراد من جملہ کپٹن رائنی کے اعترافات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سازش انقلابی عناصر اور رہبر کے خلاف مرتب کی گئی تھی، نہ لیبرل عناصر بالخصوص صدر جمہوریہ بنی صدر کے خلاف، بلکہ اس منصوبہ میں بنی صدر کے تحفظ کی سفارش بھی گئی تھی۔[2]

ج) ثقافتی انقلاب

انقلاب سے کئی مہینے پہلے یونیورسٹیاں بالخصوص تہران یونیورسٹی کمیونسٹوں اور اشتراکی عناصر کا اکھاڑا بن گئی تھیں، اور اشتراکی گروہ اور تنظیموں، من جملہ ''پیکارہا'' ''فدائی خلق گریلا'' اور ''مجاہدین خلق'' نے یونیورسٹیوں کو اپنی سیاسی و عسکری سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا اور حکومت کے وسائل سے استفادہ کر کے حکومت مخالف سرگرمیوں میں مشغول ہوتے تھے۔ یہ امر نہ صرف یونیورسٹیوں کے معمول کے مطابق سرگرمیوں میں خلل پیدا کرتا تھا بلکہ یونیورسٹیوں سے سابقہ حکومت سے وابستہ عناصر کا صفایا کرنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔

۱۔ طبس کے واقعہ کی تفصیل کے لئے خط امام کے پیرو طالب علموں کی طرف سے شائع کی گئی کتاب ''طبس سورہ فیل کا ایک مصداق'' کا مطالعہ فرمائیں۔

۲۔ مزید آگاہی کے لئے کتاب ''نوژہ تختہ الٹنے کی سازش'' شائع کردہ چاپ مرکز مطالعات و تحقیق سیاسی۔ طبع دوم ۱۹۸۹ء کا مطالعہ کریں

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ، ثقافتی انقلاب کے زمانہ تک ، یونیورسٹیاں انقلابی حکومت کے کنٹرول سے باہر تھیں ۔اسی وجہ سے مسلمان ، یونیورسٹی طالب علموں نے تبریز یونیورسٹی میں ایک حرکت شروع کی اور اس کے بعد یہ حرکت مئی ۱۹۸۰ء میں انقلابی عناصر اور عوام کی حمایت سے تہران میں بھی شروع ہوئی ۔اس کے نتیجہ میں یونیورسٹیاں مختلف گروہوں کے وجود سے پاک ہوگئیں اور ثقافتی انقلاب کی غرض سے یونیورسٹیاں بند کی گئیں ۔اس کے بعد یونیورسٹیوں کی سرگرمیوں پر نگرانی کرنے اور یونیورسٹیوں کو اسلامی کرنے کے لئے ضروری تبدیلیاں لانے کی غرض سے رہبر انقلاب کی طرف سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے اپنا کام شروع کیا۔''جہاد دانش گاہی'' کے نام پر تشکیل پائے ادارہ کے ذریعہ یونیورسٹیوں کا نظم و نسق خط امام کے عناصر کے ہاتھ میں آ گیا۔

اگرچہ یونیورسٹیوں کو خالی کرنے کی تحریک ابتداء میں ایک سیاسی تحریک تھی، لیکن اس تحریک نے یونیورسٹیوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے راہ ہموار کی۔ یہ ثقافتی انقلاب کس حد تک کامیاب ہوا، ایک الگ بحث ہے جو اس کتاب کے دائرہ اختیار سے خارج ہے۔

یہاں پر دلچسپ اور قابل ذکر نکتہ بنی صدر کی موقع پرستی ہے۔اس تحریک کے وقت بن صدر خوزستام میں تھا۔صرف اس لئے کہ قافلہ سے پیچھے نہ رہے اور مذکورہ حرکت سے ضروری فائدہ اٹھا سکے،فوراً تہران آ گیا اور اس سلسلہ اپنی سابقہ عدم دلچسپی کے باوجود یونیورسٹیوں کو خالی کرنے کی کاروائی میں لوگوں کے آگے آگے قرار پایا۔

تیسرا مرحلہ:

''خط امام'' کی حاکمیت

شہید رجائی کی حکومت تشکیل پانے کے بعد خط امام کے پیروکار عناصر نے اپنی کمزوریوں کا سد باب کیا اور حکومت کے عہدوں پر فائز ہوئے۔اب ملک کا نظم ونسق چلانے والے تین بنیادی ارکان یعنی پارلیمنٹ کے نمائندوں کی بھاری اکثریت، عدلیہ کے شورائے عالی اور کابینہ، خط امام والوں کے ہاتھ میں تھی، اور لیبرل عناصر کمزور ہوتے گئے اور صدر جمہوریہ کا عہدہ ان کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود اقلیتی پارٹی کا رول ادا کرتے تھے۔اس زمانہ میں جن مقامات پر ان کا کنٹرول تھا، وہ حسب ذیل ہیں: اسلامی پارلیمنٹ میں اقلیت، مرکزی بینک کی مدیریت، ریڈیو اور ٹی وی اور سب سے اہم صدر جمہوریہ کا عہدہ اور مسلح افواج کی جنرل کمانڈ جو حضرت امام کی طرف سے بنی صدر کو تفویض کی گئی تھی۔

اس زمانہ میں چونکہ اعتدال پسند پارلیمنٹ اور کابینہ میں اکثریت حاصل کرنے میں ناامید ہوئے تھے، اس لئے اپنے پروگرام کا اصلی مقصد حکومت کو نیچا دکھانے پر متمرکز کیا۔تمام مخالف عناصر من جملہ لیبرل، قدامت پسند، اشتراکی بالخصوص سازمان مجاہدین خلق نے آپس میں حکمت عملی پر توافق کیا اور ''ملت کے منتخب'' صدر جمہوریہ کے زیر سایہ صدر جمہوریہ کے عوامی روابط کے دفتر پر جمع ہو کر اپنی سرگرمیوں، ریشہ دوانیوں اور تخریب کاریوں کے پروگرام بنانے لگے۔

تعجب کی بات ہے کہ عبوری حکومت کے زمانہ میں ''سازمان مجاہدین خلق'' لیبرل عناصر کے مقابلہ میں کھڑی ہو کر ان کی مخالفت کرتی تھی، اب جبکہ لیبرل عناصر انقلاب اور خط امام کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تھے، ان سے توافق کر کے ان کے ائتلاف سے جا ملی تھی۔لیبرل عناصر نے معاشرہ پر حکم فرما آزادی کے ماحول، تبلیغاتی وسائل، بالخصوص روزنامہ ''میزان'' اور ''انقلاب اسلامی'' اور

ریڈیو، ٹی، وی سے استفادہ کر کے افراتفری اور نا امنی کا ماحول پیدا کر دیا۔ یہ سلسلہ ۱۷ شہریور (۸ ستمبر ۱۹۸۰ء) کی سالگرہ کے موقع پر میدان شہداء میں بنی صدر کی تقریر سے شروع ہوا اور اس کی حکومت کے خاتمہ، یعنی ۲۲ جون ۱۹۸۱ء تک جاری رہا۔ لیبرل عناصر کا تصور یہ تھا کہ شہید رجائی کی حکومت ملک کا نظم ونسق چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے، اگر اس پر دباؤ ڈالا جائے تو جلدی ہی سرنگون ہو جائے گی۔ بالخصوص امریکی صدر ریگن کی حکومت نے بھی کھلم کھلا اعلان کیا تھا کہ ایران وامریکہ کے اختلافات کو حل کرنے کے لئے ایک اعتدال پسند حکومت کا برسر اقتدار آنا ضروری ہے۔[1]

صدام حسین کی رہبری میں حکومت عراق کی طرف سے پہلے سے منظّم شدہ ایک منصوبہ کے تحت ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ایران پر اچانک حملہ کے نتیجہ میں ایران عراق جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ نے ملک کے اندر مخالف طاقتوں کے مقابلہ اور طریقہ کار میں تبدیلی ایجاد کی۔

ایک طرف سے بنی صدر کمانڈر انچیف کی حیثیت سے مسلح افواج کا سربراہ تھا، اور فوج کے تجربہ کار افراد پر بھروسہ کر کے کلاسیک جنگ کے طریقہ سے فوج کو نئے سرے سے احیاء اور طاقتور کرنے کے بعد اس سے استفادہ کر کے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوسری طرف سے خط امام کے عناصر عوامی رضا کاروں کو منظّم کرنے کے عقیدہ سے جنگ کو کلاسیک اور قوم پرستی کی حالت سے نکال کر اسے عوامی اور عقیدتی جنگ میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ جنگ شروع ہونے کے دن سے بنی صدر کے معزول ہونے تک مسلح افواج کی حالت کو کمزور کرنے کا اصلی سبب یہی اختلاف بنا جس کے نتیجہ میں فوج کو پے در پے شکست سے دوچار ہونا پڑا اور اسلامی مملکت کے وسیع علاقہ پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔

یہاں پر ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ شروع ہونے کے عوامل اور اس میں تبدیلی پیدا ہونے کے طریقہ کار اور اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالیں، کیونکہ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے الگ سے ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ صرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ شید رجائی کی حکومت، جس نے

۱۔ مزید تفصیلات کے لئے کتاب ''اسلامی جمہوریہ کی خارجہ پالیسی، اصول اور مسائل''، ص ۱۳۵

اجرائی ذمہ داری کو تازہ تازہ سنبھالا تھا، اچانک دشمن کے حملہ کے نتیجہ میں بیس لاکھ ہم وطنوں کے آوارہ اور بے گھر ہونے کی وجہ سے ان کے مالی مشکلات کو حل کرنے اور مسلح افواج کے ئے اسلحہ اور دیگر ضروری ساز وسامان مہیا کرنے کی عظیم مشکلات اور نقصانات سے دوچار ہوئی، جبکہ جنگ کے امور کو چلانے میں کسی خاص قسم کی مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔

شہید رجائی کی حکومت کے ذمہ جو دوسرے مسائل رکھے گئے تھے، ان میں امریکی یرغمالیوں کے مسئلہ کو حل کرنا تھا۔ جب لیبرل عناصر کی سیاسی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں اور شاہ کے مرنے کی وجہ سے اس کو واپس ایران لاکر عدالتی کاروائی کرنے کا مطالبہ منتفی ہوا، تو رہبر انقلاب نے مسئلہ کو حل کرنے کے طریقہ کار اور شرائط معین کرنے کی ذمہ داری، تشکیل پانے والی پارلیمنٹ کو سونپی، پارلیمنٹ نے بھی اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے چار شرائط (یعنی ایران کے اموال کو آزاد کرنا، شاہ اور اس کے خاندان کے توسط سے غارت کر کئے گئے اموال ملت ایران کو واپس کرنا، اقتصادی محاصرہ کو توڑنا اور امریکہ کا ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے) کا معاہدہ معین کر کے حکومت کو مأموریت دیدی تاکہ الجزائر کی حکومت کی ثالثی کے ذریعہ ضروری گفتگو انجام دے اور موضوع کو حل کرے۔ عراق کی طرف سے تجاوز آمیز جنگ شروع ہونے کی وجہ سے بھی یرغمالیوں کا مسئلہ تحت الشعاع میں قرار پایا تھا۔ اور چونکہ تمام طاقت حملہ آور کا مقابلہ کر کے اسے نکال باہر کرنے میں صرف ہونی چاہئے تھی، اس لئے یرغمالیوں کے مسئلہ کو فوری طور پر حل کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

دوسری طرف سے امریکہ کے صدارتی انتخابات منعقد ہونے اور کارٹر کی شکست اور ریگن کی کامیابی کی وجہ سے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے امریکہ کے نئے صدر جمہوریہ کو اقتدار منتقل کئے جانے تک آخری فرصت باقی بچی تھی۔ امریکی جاسوس خانہ پر قبضہ کے سیاسی مقاصد مکمل طور پر محقق ہو چکے تھے اور امریکہ نے اس ماجرا میں ایک چھوٹے ملک کے ہاتھوں شکست کا اعتراف کیا تھا اور امریکہ میں اس کا داخلی انعکاس کارٹر کی حکومت اور ڈیموکریٹک پارٹی کے زوال کے طور پر رونما ہو چکا تھا۔ اب جنگ کی حالت میں یرغمالیوں کو زیادہ دیر تک باقی رکھنا مصلحت نہیں تھی۔ لیکن قابل توجہ

بات یہ ہے کہ لیبرل عناصر سفارت خانہ پر قبضہ کرنے کی کاروائی کے ابتدائی ہی سے اس قدام کے مخالف تھے اور اسے انقلاب کے لئے نقصان دہ جانتے تھے اور رہبر وملت کو مطلع کئے بغیر سیاسی حیلوں اور خفیہ گفتگو کے ذریعہ خود مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر چکے تھے، اب جبکہ شہید رجائی کی حکومت مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مأمور ہوئی، تو انہوں نے افراتفری اور بدامنی کا ماحول پیدا کر کے خیانت وسازش کے بے بنیاد الزامات لگانے لگے، یہاں تک کہ صدر جمہوریہ نے جرم کا اعلان جاری کیا اور مرکزی بینک کے ڈائریکٹر جنرل نے ہر قسم کی ضروری اطلاعات فراہم کرنے میں حکومت کا تعاون کرنے سے انکار کیا۔ اس کے باوجود مذکورہ مسئلہ کارٹر کی صدارت کے آخری دن اور بالکل اسی لمحہ جب وہ ریگن کو صدر جمہوریہ کے عہدہ کا چارج دے رہا تھا، ایران اور امریکہ کی حکومتوں کے درمیان الجزائر بیانیہ پر دستخط کرنے سے حل ہوا اور یرغمالی مہر آباد کے ہوائی اڈہ سے روانہ ہوئے۔ اس طرح امریکی یرغمالیوں کا مسئلہ ۴۴۴ دن کے بعد حل ہوا۔[1]

حکمراں دو گروہوں کے درمیان اختلافات بدستور جاری تھے اور رہبر انقلاب کسی خاص گروہ کے حق میں براہ راست موقف اختیار کئے بغیر پند ونصائح کرتے رہے اور اگرچہ ایک گروہ ان کے بیانات اور اظہار نظر سے اپنے حق میں مطلب نکالتا تھا اور ان کے ایک پیغام یا تقریر سے اپنے روزناموں میں مختلف اور کبھی متضاد عناوین منتشر کرتا تھا، لیکن واضح تھا کہ رہبر انقلاب کی نصیحتوں کے اکثر مخاطب لیبرل عناصر تھے، یہاں تک کہ وہ کبھی اشارہ میں یا کھلم کھلا ان کی سرزنش بھی کرتے تھے۔ روزناموں کے صفحات میدان کارزار اور طرفین میں کشمکش کا منظر پیش کرتے تھے اور انقلابی اور مبارز لوگوں کے ذہنوں پر اثر ڈالتے تھے اور ان حالات میں جبکہ تمام فکریں اور توجہ ملک کے اصلی مسئلہ کے طور پر جنگ کے مسئلہ پر مرکوز ہونی چاہئے تھیں، انقلابیوں اور حکومت کے عہدہ داروں کی

۱۔ مزید مطالعہ کے لئے کتاب ''جمہوری اسلامی کی خارجی سیاست، اصول اور مسائل، ص ۱۳۷۔ ۱۴۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

توانائیاں اختلافات میں صرف ہو رہی تھیں۔

لیبرل عناصر کی ریشہ دوانیاں اس وقت عروج پر پہنچ گئیں، جب عاشور کے دن میدان آزادی میں بنی صدر نے تقریر کی اور اشترا کی و غیر مذہبی عناصر نے امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کے دن تالیاں بجا کر اپنی حقیقی ماہیت کا مظاہرہ کیا۔ اس سے اہم وہ دن تھا جب ۵ مارچ ۱۹۸۱ء کو ڈاکٹر مصدق کی سالگرہ پر تہران یونیورسٹی میں خط امام اور سازمان مجاہدین خلق، جو باضابطہ طور پر لیبرل عناصر کی صف میں کھڑے ہوئے تھے، کی ملیشیا کے درمیان سخت تصادم ہوا، رہبر انقلاب نے ان حالات میں، جب کہ ملک کا کنٹرول ہر ایک کے ہاتھ سے جا رہا تھا اور ہرج و مرج اور افراتفری پھیلنے والی تھی، لیبرل عناصر کو اتمام حجت کر کے ان کو ایک ایسی حالت میں قرار دیا کہ وہ رہبر انقلاب کے حکم کی سرپیچی کر کے مخالفت کا موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۸۱ء کو مسئولین اور معترضین کے درمیان اختلافات کو دور کرنے کے لئے امام کی خدمت میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ اسی رات امام نے مملکت کے مسائل کے بارے میں دس نکات پر مشتمل ایک بیانیہ میں اپنی رہنمائیوں کا اعلان کیا۔ من جملہ، اس بیانیہ کی شق نمبر ۶ میں اعلان ہوا تھا:

''اسلامی جمہوریہ کے عہدہ داروں کے درمیان جنگ کے مسائل اور تمام اخلاقی مسائل کے بارے میں شکایتوں کی تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو صدر جمہوریہ کی طرف سے ایک نمائندہ، دوسری طرف (بہشتی، رفسنجانی، اور رجائی) میں سے ایک نمائندہ اور میرے ایک نمائندہ پر مشتمل ہوگی۔ یہ لوگ شکایتوں کو حل کرنے کی کوشش کریں گے اور مذکورہ کمیٹی کی اکثریتی رائے معتبر ہوگی اور عہدہ داروں میں سے کسی ایک کی مخالفت کرنے کی صورت میں، اختلاف کرنے والے کو عوام کے سامنے پیش کر کے اس کا مؤاخذہ کرنا چاہئے۔[۱]''

۱۔ صحیفہ نور، ج ۱۴، ص ۲۴۳

یہ کمیٹی امام کے نمائندہ آیت اللہ مھدوی کنی، حکومت، عدلیہ اور قانون سازیہ کے نمائندہ آیت اللہ یزدی اور صدر جمہوریہ کے نمائندہ مرحوم آیت اللہ اشراقی پر مشتمل تھی، اور بنی صدر کی معزولی تک اپنا کام انجام دیتی رہی۔ اس دوران متخاصم عناصر سے کہا گیا تھا کہ افراتفری کو دور کرنے تک کسی قسم کے انٹریو اور تقریر کرنے سے پرہیز کریں۔

اس دوران، تحریک آزادی کے گروہ نے یہ مسئلہ پیش کر کے، کہ ملک تعطل سے دوچار ہوا ہے، آئین کے برخلاف عام لوگوں کی رائے جاننے کا مطالبہ پیش کیا۔ ان کی یہ درخواست ڈاکٹر مصدق کی اس کی حکومت کے اواخر میں انجام دی گئی حرکت کی یاد تازہ کرتی تھی۔ جس وقت ڈاکٹر مصدق نے باوجود اس کے کہ قومی پارلیمنٹ کی اکثریت کا مالک تھا اور پارلیمنٹ سے قانون سازیہ کے اختیارات بھی حاصل کر چکا تھا، پھر بھی، چونکہ پارلیمنٹ کو اپنے لئے رکاوٹ تصور کرتا تھا، ایک نام نہاد ریفرنڈم انجام دے کر پارلیمنٹ کو منحل کرنے کا اقدام کیا اور اس طرح پھر سے ڈکٹیٹرشپ کے لئے راہ ہموار کی

تعجب کی بات یہ ہے کہ لیبرل عناصر، آزادی اور ڈیموکریسی کی حمایت کرنے کے باوجود جب بھی ان دونوں (آزادی وڈیموکریسی) کو اپنے مقاصد اور ارادوں کے موافق نہیں پاتے، تو آزادی اور ڈیموکریسی کو مخدوش اور نابود کرنے میں کوئی پروانہیں کرتے تھے۔ ان کی نظر میں جو پارلیمنٹ مہدی بازرگان کی تجویز پر لوگوں کی رائے سے تشکیل پائی تھی اور اس میں لوگوں کے نمائندے تھے، اس کو ریفرنڈم کے ذریعہ منحل کرنا چاہئے تھا۔ اس سلسلہ میں نہ صرف حکومت کی تین رکنی کمیٹی نے اپنے موقف کا اعلان کر کے اس کا مؤاخذہ کیا، بلکہ رہبر انقلاب نے بھی ان کی ملامت کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ تم لوگ ہو جو تعطل سے دوچار ہوئے ہو، ملت ہرگز تعطل سے دوچار نہیں ہوتی۔[۱]''

بنی صدر بھی ایسا نہیں تھا جو خاموشی اختیار کرتا اور اپنے تنہا حربہ، افراتفری کے حالات کو ہوا دینے سے چشم پوشی کرتا۔ لہذا، اس نے تقریر اور انٹرویو دے کر جوں کی کمیٹی کو مجبور کیا کہ اس کا

۱۔ صحیفہ نور، ج ۱۴، ص ۲۴۳

خطا کار اور قصوروار کے طور پر تعارف کرائے۔

اب بنی صدر کی معزولی کی راہ مکمل طور پر فراہم ہو چکی تھی۔ تمام وہ افراد جنہوں نے عدم معرفت یا ''فاسد کے بجائے مفسدہ کو دور کرنے'' کی بنیاد پر اسے ووٹ دیئے تھے، گلی کوچوں میں آ کر مظاہرے کر کے اپنی رائے کو واپس لے لیا اور اس سے نفرت اور بیزاری کا اعلان کیا۔ ''قومی محاذ'' بھی اسلامی قوانین (قصاص) کی مخالفت کر کے میدان میں آ گئی اور حکومت کے خلاف کھلم کھلا حملہ کر کے ۱۵ ارجون کو میدان فردوسی میں مظاہرے اور اجتماع کا اعلان کیا، کہ رہبر انقلاب نے فوری اور قطعی موقف اختیار کر کے مذکورہ پارٹی کے خلاف حکم ارتداد جاری کیا، جس کے سبب لوگوں میں ایک عظیم لہر پیدا ہوئی، نتیجہ کے طور پر مظاہرے کے دن، قوم پرست اور ان کے حامی دم دبا کر بھاگ گئے۔[۱]

رہبر انقلاب نے بنی صدر کو کمانڈر انچیف کے عہدہ سے معزول کیا اور اس کے ضمن میں اسلامی پارلیمنٹ نے بھی ووٹوں کی اکثریت آراء سے، صدر جمہوریہ کے سیاسی طور پر نا اہل ہونے کا فیصلہ سنایا اور رہبر انقلاب کی تائید سے صدر جمہوریہ کے عہدہ سے بنی صدر معزول ہوا اور حکومت میں لیبرل عناصر کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح تاریخ انقلاب کا یہ مختصر لیکن اہم باب جب بند ہوا، تو اس سے زیادہ حوادث اور واقعات کے ساتھ ایک دوسرے باب کا آغاز ہوا۔

۱۔ صحیفہ نور، ج ۱۵ ص ۱۰

چوتھا مرحلہ:

تیسرا انقلاب

بنی صدر کے صدر جمہوریہ کے عہدہ سے معزول ہونے کے نتیجہ میں لیبرل عناصر سے آخری اجرائی مورچہ چھین لیا گیا اور حکومت میں ان کا وجود مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ یہ امر داخلی انقلاب دشمنوں اور سامراجی طاقتوں کے سیاسی طریقہ سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی تمام امیدوں پر پانی پھیرنے کا سبب بنا۔ یہ مسئلہ، سب سے زیادہ سازمان مجاہدین خلق کے لئے خلاف توقع اور حیرت انگیز تھا، کہ تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ووٹوں سے منتخب ہوئے صدر جمہوریہ کو آسانی کے ساتھ کیسے معزول کیا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ عوامی سطح پر نہ صرف کسی قسم کے اعتراض اور ردعمل کا سبب بنا، بلکہ ان افراد کے لئے شادمانی کا باعث ہوا جنہوں نے بنی صدر کے حق میں ووٹ ڈالے تھے۔

لیبرل عناصر، بنی صدر اور سازمان مجاہدین خلق کی بنیادی غلط فہمی ان کا یہ تصور تھا، کہ انہیں رہبر انقلاب کے بغیر براہ راست لوگوں کی حمایت حاصل ہے اور لوگوں کی اس پشت پناہی اور حمایت سے علماء، یہاں تک رہبر انقلاب کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور جس طرح ڈاکٹر مصدق، آیت اللہ کاشانی کو گوشہ نشین کرانے میں کامیاب ہوا تھا، وہ بھی ایسے ہی حالات پیدا کر کے علماء اور رہبر انقلاب کو گوشہ نشین کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے غافل تھے کہ اس بار علماء بیدار تھے اور امام خمینیؒ کا مرحوم کاشانی سے کافی تفاوت تھا۔

اسی غلط فہمی پر مبنی محاسبہ کی بنیاد پر سازمان مجاہدین خلق، انقلاب پر کاری ضرب لگانے اور حکمت عملی سے اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے صدر جمہوریہ بنی صدر کی حمایت کرتے تھے اور حقیقت میں اس زمانہ میں بہت سے معرکوں کو سر کرنے میں اشتراکی اور التقاطی مجاہدین کا ہاتھ تھا نہ لیبرل عناصر کا۔

سازمان مجاہدین خلق سے مربوط ا، بھی مخلوط آئیڈیالوجی، حکمت عملی اور اپنے منافقانہ رویہ سے، اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے انقلاب سے بہت پہلے منصوبہ بنا چکے تھے۔ انقلاب کے بعد انقلابی عناصر کی مصروفتیوں اور مشکلات کی وجہ سے پیدا شدہ حالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تنظیم کی ممبر شپ بنانے، تنظیم سازی اور اسلحہ جمع کرنے میں لگ گئے اور جوانوں کے جذباتی عوامل پر بھروسہ کر کے بعض افراد کو مدرسوں میں سرگرم عمل کیا تھا اور بعض قابل توجہ افراد کو مخفی سیاسی و عسکری تنظیموں میں جمع کر کے منظّم کر چکے تھے۔ دوسری طرف سے یہ تنظیم انقلاب کے بعد پیدا ہوئے پراگندہ حالات سے استفادہ کر کے اپنے افراد کو ملک کے حساس ترین اداروں میں تعینات کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

جب اس سازمان نے بنی صدر کے معزول ہونے کے بعد احساس کیا کہ اب سیاسی طریقہ

ا۔ اس سازمان کے بانیوں (محمد حنیف نژاد، سعید محسن اور اصغر بدیع زادگانی) نے ابتدائی سیاسی تجربے تحریک آزادی کی پناہ میں، اپنے طالب علمی کے زمانہ میں تہران یونیورسٹی میں (۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک) حاصل کئے تھے۔ اس کے علاوہ تحریک آزادی کے مذہبی رہبروں، بالخصوص آیت اللہ طالقانی اور مھدی بازرگان کے مذہبی طرز تفکر نے ان کی اسلامی فکر میں نئے افق پیدا کر دیئے تھے۔ بازرگان کی طرف سے دینی تعلیم کے سائنسی ہونے پر تاکید نے انھیں اس بات پر مطمئن کرایا تھا کہ اسلام میں دینی عقائد اور سائنسی قوانین کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ مجاہدین کی فکر میں جو نیا طرز عمل پیدا ہوا تھا، اس کی بناء پر وہ رفتہ رفتہ اپنے ابتدائی معلموں کے افکار اور تصور کائنات سے بھی آگے بڑھے اور مجاہدین نے کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہو کر تدریجاً مارکس کے بعض نظریات کو اسلامی عقائد سے جوڑنے کا اقدام کیا۔

سازمان مجاہدین خلق کے اول درجہ کے رہبروں اور لیڈروں کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۷۱ء میں سازمان کے رجحانات مارکسیزم کی طرف ہو گئے اور اسلام و مارکسیزم کے بارے میں ان کی سابقہ دوگانگی اسلام کو سازمان سے جدا کرنے کے بعد ختم ہو گئی۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں سازمان کے گرفتار شدہ سرکردہ افراد نے ایک ٹی، وی انٹریو میں باقاعدہ اور واضح طور پر اعلان کیا کہ وہ خود بھی مارکسیسٹ تھے اور سازمان کو بھی عملی طور پر مارکسیسٹ نظریات سے مسلح کر چکے ہیں۔ سازمان کے مارکسیسٹی ہونے کے اعتراف سے مجاہدین خلق کا تقدس ٹوٹ گیا اور سازمان میں موجود مذہبی عناصر کے سازمان سے جدا ہونے کا موقع فراہم ہوا۔ مجاہدین کے بعض مستقل افراد سازمان سے جدا ہوئے اور علیحدہ گروہ تشکیل دے کر لطف اللہ میثمی کے اطراف میں یا صلواتیون اور اعتراضیون کے عنوان سے جمع ہوئے۔

سے آگے بڑھنا اور اقتدار پر قبضہ کرنا ممکن نہیں ہے، تو بے بنیاد بہانہ سے مسلحانہ جنگ کا اعلان کر کے اپنی دہشت گرد سرگرمیوں کا آغاز کر دیا اور حزب جمہوری اسلامی کے مرکزی دفتر پر ایک زبردست بم دھاکہ کر کے پہلی ہولناک ضرب لگا دی۔ اس دھماکہ میں ملک کے اعلیٰ درجہ کے ۷۲ عہدہ دار، من جملہ سپریم کوٹ کے چیف جسٹس ڈاکٹر بہشتی شہید ہوئے۔ اس کے ایک ماہ بعد وزیر اعظم کے دفتر کی عمارت میں بم دھماکہ کر کے ملک کے صدر جمہوریہ محمد علی رجائی اور وزیر اعظم باہنر کو شہید کیا گیا۔

اس سازمان کے ٹروریستی اقدامات نے انقلاب کو زبردست نقصانی پہنچایا۔ تقریباً ڈھائی سال تک لیبرل اور انقلاب دشمن عناصر سے مشکلات اور کشمکش کے بعد انقلابی حکومت چند قابل قدر لائق، مکتبی اور انقلابی آئیڈیالوجی کے متعہد افراد کو پیدا کر کے ان سے استفادہ کرنے لگی تھی، کہ اچانک حکومت کے اہم عہدوں پر فائز ایک سو سے زائد افراد کی شہادت سے دوچار ہوئی۔ فطری بات ہے کہ یہ انقلاب کے پیکر پر ایک کاری ضرب تھی اور اس کو برداشت کرنا عراق کے ایران پر حملہ سے کئی گنا سخت تھا۔ اس منصوبہ کو مرتب کرنے والوں کا تصور یہ تھا کہ، اتنے لوگوں کو ایک ساتھ کھو دینے کے بعد انقلابی حکومت سرنگوں ہو جائے گی اور ان کے لئے اقتدار پر قبضہ کرنے کا موقع فراہم ہوگا۔ حقیقت میں اگر ایسا حادثہ کسی اور ملک میں پیش آتا تو ممکن نہیں تھا اس ملک کی حکومت اپنے آپ کو اس جان لیوا خطرہ سے نجات دے سکتی۔

انقلاب دشمن عناصر کی امیدوں کو پھر سے ناامیدیوں میں تبدیل کرنے اور انقلاب کے ماحصل کو حوادث کی گزند سے بچانے کے عوامل میں اولاً رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ کی ہوشیاری اور فوری اقدام تھا، کہ انہوں نے بروقت حالات پر قابو پانے اور شہداء کی وجہ سے پیدا ہوئے خلا کو پر کرنے سے لوگوں اور مسئولین کی ہمت بڑھا دی۔ ثانیاً لوگوں کا بے تحاشا اور وسیع پیمانہ پر میدان میں آنا تھا کہ جس نے دشمنوں کو اپنے ناپاک عزائم تک پہنچنے سے روکا۔ پیش آئے نقصانات سے چشم پوشی کرتے ہوئے، بنی صدر کے معزول ہونے سے انقلاب کے لئے قابل توجہ کامیابیاں حاصل کر چکا تھا جو سالہا سال کے لئے انقلاب کی ضمانت کا سبب بنیں:

۱۔ لیبرازم کو انقلاب کے لئے سب سے بڑی آفت کہا جا سکتا ہے۔ یہ عامل میدان میں موجود معاشرہ کے بعض طبقوں کی آرام طلب فطرت اور رجحانات سے استفادہ کر کے انقلاب کو رفتہ رفتہ منحرف کر سکتا تھا۔ انقلاب کے پہلے سال کے دوران رونما ہونے والے حوادث نے تمام لوگوں کے ذہنوں میں لیبرل عناصر کے اصلی چہرے دکھا دئے اور وہ اپنی یقینی شکست قبول کرنے پر مجبور ہو گئے، انھیں اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہر قسم کے پروپیگنڈے سے استفادہ کر کے عوام کو دھوکہ دینے میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ان میں سے چند افراد نے انقلاب دشمن عناصر کے دامن میں پناہ لے لی اور اسلامی جمہوریہ کے خلاف سازشوں میں لگ گئے، کہ سرانجام ان میں سے ایک کو سزائے موت دی گئی اور دو افراد بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ یعنی صدر جمہوریہ کے پہلے دور کے ایک امیدوار قطب زادہ کو سزائے موت دی گئی اور بنی صدر اور مدنی رفو چکر ہو گئے۔

۲۔ دوسری طرف سے، انقلاب دشمن گروہ بھی سیاسی کوششوں سے ناامید ہو کر مسلحانہ جنگ شروع کر کے ملت کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے لیکن بہت جلدی اپنے ساز و سامان اور نظم و انتظام کو کھو دینے کے بعد تتر بتر ہو گئے اور اس طرح ان کی طرف سے اور بالخصوص منحرف گروہوں کی طرف سے ایک بڑا خطرہ ٹل گیا جو انقلاب کو ختم کر سکتا تھا۔

۳۔ سچے اور مؤمن انقلابیوں میں سے بعض لوگ لیبرل عناصر کی ریشہ دوانیوں اور منافقین کی افواہ بازیوں سے متاثر ہو کر شک وشبہہ سے دوچار ہوئے تھے، لیکن ان کی اصلی ماہیت معلوم ہونے پر ان کا شک وشبہہ دور ہوا اور انہوں نے دوسرے انقلابیوں سے مل کر اپنی پوری طاقت کے ساتھ انقلاب کا دفاع کیا۔

۴۔ مغربی بڑی طاقت، امریکہ یا بقول رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ، بڑا شیطان، جو یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ لیبرل اور انقلاب دشمن عناصر دوبارہ اپنے گزشتہ مقام کو حاصل کر لیں گے، ایک بار پھر ناامید ہو گیا۔

۵۔ تیسرے انقلاب کا سب سے اہم اور نمایاں نتیجہ، عراق کی حملہ آور فوج کی پے در پے شکست

کا آغاز اور اسلام کے سپاہیوں کی حیرت انگیز کامیابیاں تھیں۔ بنی صدر کی صدارت کے دوران، جبکہ وہ مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بھی تھا، سب سے بڑے نقصانات میں، جنگجو سپاہیوں بالخصوص ملٹری اور سپاہ پاسداران کے درمیان بکھراؤ اور اختلافات کا پیدا ہونا تھا، وہ اپنے عہدہ اور اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر، فوجی مسائل سے عدم آشنائی کے باوجود بعض لیبرل خیال کے افسروں اور کمانڈروں کو موقع فراہم کر کے، ان میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے فوج کی سیاسی، اجتماعی شعبہ اور اس کے ذمہ داروں، جو علماء اور ولی فقیہ کے تحت نظر تھے، کو تنقید اور ملامت کا نشانہ بنا کر اور مسئلہ مہارت کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنے سیاسی موقف کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

دوسری طرف سے جنگ میں ''اشکانیوں کی'' روش کا سہارا لے کر اور اس سے استناد کر کے، اپنی کمانڈری کی کمزوری پر پردہ پوشی کرنا چاہتا تھا اور اکثر ناکامیوں کا سبب ''بے خبر اور ناقابل'' افراد کی مداخلت بیان کرتا تھا۔ اس قسم کی حکمرانی کے نتیجہ میں، ایرانی مسلح افواج کو پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا اور دشمن کے مقابلے میں اپنے اکثر حملوں میں ناکامی اور شکست سے دوچار ہوتے تھے۔

بنی صدر کے کمانڈر انچیف کے عہدہ، جو نفاق کا سب سے بڑا عامل تھا، سے معزول کئے جانے پر تمام مسلح افواج من جملہ ملٹری، سپاہ اور رضا کار رہبر انقلاب کی کمانڈ میں آ گئے اور نہ صرف ان میں ناقابل یقین اتحاد و اتفاق پیدا ہوا بلکہ ان کے حوصلے...... جو بنی صدر اور اس کے ساتھیوں کے کرتوتوں کی وجہ سے پست ہوئے تھے، پھر سے بلند ہو گئے اور اس قدر تقویت پائے کہ ان کے اثرات فوراً نمایاں ہو گئے۔ بنی صدر کی معزولی کے چند روز بعد ہی ایران کی طرف سے ''خمینی روح خدا فرماندہ کل قوا'' اور ''ثامن الائمہ'' کے نام سے جو فوجی آپریشن انجام پائے، ان میں اسلام کے سپاہیوں نے نمایاں فتوحات حاصل کیں۔ مذکورہ آپریشنوں کو جاری رکھتے ہوئے دوسرے عملیات من جملہ ''فتح المبین''، ''بیت المقدس'' اور دیگر کارروائیوں میں اسلام کے سپاہیوں نے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں، اس طرح ملت ایران نے ایک سال کے اندر ہی خرم شہر کی آزادی کا جشن منایا اور اپنی کارروائیوں کو جاری رکھتے ہوئے عراق کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد اسلام کے سپاہیوں کو مارچ ۱۹۸۸ء تک حاصل ہونے والی کامیابیوں کا سرچشمہ تیسرے انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا اتحاد و اتفاق تھا۔ ان کامیابیوں نے ایران کی مسلح افواج کو ایسی ہمت اور طاقت بخشی کہ دوست و دشمن کے لئے اس سلسلہ میں کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہا کہ اگر بڑی طاقتوں کی مداخلت نہ ہوتی تو صدام اور بعث پارٹی کا زوال قطعی تھا۔

۶۔ بنی صدر کے معزول ہونے کے بعد خط امام عناصر کو حاصل ہونے والی دیگر حیرت انگیز کامیابیوں میں تختہ الٹنے کی سازشوں کا انکشاف اور انھیں ناکام بنانا تھا، ان میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

الف) مخفی نما تودہ پارٹی اور کے۔ جی۔ بی اور اس کے نفوذی عوامل کا انکشاف اور ان کی نابودی۔

ایران کی تودہ پارٹی، نہ صرف ایران کی پرانی پارٹیوں میں سے تھی، بلکہ مشرق وسطی میں پہلی منظم کمیونسٹ پارٹی تھی۔ ایران میں سب سے پہلے کمیونسٹ پارٹی ۱۹۲۱ء میں تشکیل پائی اور ۱۹۳۱ء میں رضا شاہ کی طرف سے مارکسسٹی آئیڈیالوجی کی تبلیغات کو ممنوع قرار دینے تک سرگرم عمل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں متحدین کی طرف سے ایران پر تسلط جمانے اور رضا شا کو معزول کرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی نے تودہ پارٹی ایران کے نام سے اپنی سرگرمیوں کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ اس پارٹی کے مارکسسٹ لینینسٹ عقائد رکھنے کے باوجود پارٹی کے لئے حزب تودہ کے نام کے انتخاب کا سبب یہ تھا کہ، ایران کے مسلم معاشرہ میں کمیونسٹ نظریات کو قبول کرنے کے لئے مناسب ماحول موجود نہیں تھا اور یہ اقدام صرف لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے تھا۔[1]

1-Farhans Jahanpor'Iran:the rise and fall of the Tudeh Party The Word torley April'1984'p.153

تودہ پارٹی نے، چالیس سال تک اعلانیہ اور مخفی سرگرمیوں، تمام دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں بالخصوص سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی سے تجربہ حاصل کرنے اور ایران کی آشفتہ حالت کی وجہ سے دوسری عالمی جنگ کے بعد ایران میں اپنی بنیادیں نسبتاً مستحکم کی تھیں۔ لیکن چونکہ یہ پارٹی سوویت یونین کی سیاست کی ایک آلہ کار تھی اور اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ تمام احکام وہیں سے حاصل کرتی تھی، اس لئے ایران کے مسائل کے بارے میں واضح، یکساں اور مستقل موقف اختیار نہیں کر سکی تھی۔ نتیجہ کے طور پر پارٹی کے بعض اراکین نے غلط فہمی دور ہونے پر پارٹی سے علیحدگی اختیار کی اور پارٹی کئی حصوں میں بٹ گئی۔

دوسری طرف سے جب بھی ایران کی مرکزی حکومت اور بڑی طاقتوں بالخصوص سوویت یونین کے درمیان کوئی مفاہمت انجام پاتی اور بین الاقوامی ماحول سازگار ہوتا تو ایران کی حکومت ان کا قلع قمع کرنے کا اقدام کرتی تھی۔

ایران کی تودہ پارٹی کے لئے دو بار ایسا موقع ہاتھ آیا: ایک ۴ فروری ۱۹۴۹ء میں شاہ کو قتل کرنے کے اقدام کے بعد جب اس کا الزام تودہ پارٹی پر لگایا گیا۔ تو اس وقت مذکورہ پارٹی کو منحل کرنے کا اعلان کیا گیا اور اس پر ایک کاری ضرب لگادی گئی۔ اور پھر ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کی سازش اور تودہ پارٹی کے مخفی افسروں کا انکشاف بھی ملک میں اس پارٹی کی نابودی کا سبب بنا اور پارٹی کے مرکزی ارکان ایران سے بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

اسلامی انقلاب سے پہلے شاہ اور سوویت یونین کی حکومت کے درمیان قریبی تعلقات پیدا ہونے اور ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء میں ایران میں مذہبی تحریک کے ابھرنے کے دوران تودہ پارٹی کے سوویت یونین کے سیاسی موقف کی ایماء و اشارہ پر شاہ کی حمایت کرنے کے سبب تودہ پارٹی کی رہی سہی حیثیت بھی ایران میں ختم ہوگئی، حتی مارکسیسٹی رجحانات رکھنے والے جوانوں، من جملہ فدائی گوریلاؤں، پیکار اور رنجبران نے بھی اپنی حیثیت کھودی۔

۱۹۷۹ء میں ایران کی مسلمان ملت کے مبارزے عروج پر پہنچے تو ایران کی تودہ پارٹی

تدریجاً نابودی سے بچ گئی اور اس کے ارکان برسوں تک کمیونسٹ ممالک میں قیام کرنے کے بعد رفتہ رفتہ ایران لوٹے اور پھر سے اپنی سرگرمیاں شروع کرنے لگے۔ اس وقت تک تودہ پارٹی کی کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں تھی۔ ایران کے اندر اس پارٹی کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالنے والے

بہ آذین (اعتماد زادہ) نے ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ایک مفصل اعلانیہ میں ملک کے حالات پر تجزیہ و تحلیل کرنے کے ضمن میں ''جبہہ ضد استبداد'' کے نام پر ایک محاذ کھولنے کا اعلان کیا، لیکن مبارز عوام اور ان کے رہبروں کی طرف سے کسی قسم کی حمایت حاصل نہ کر سکا۔ جب اسلامی انقلاب کی کامیابی یقینی بن گئی تو، سوویت یونین کے موقف میں تبدیلی کے ضمن میں تودہ پارٹی نے بھی ان کی اطاعت میں اپنے موقف میں تبدیلی لا کر ملت ایران کے مبارزات کی تائید کی۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد تودہ پارٹی ایک دوراہے پر قرار پائی۔ اگر اپنی آئیڈیالوجی پر قائم رہتے ہوئے اپنے گزشتہ موقف پر باقی رہنا چاہتی تو اسے اعلانیہ طور پر انقلاب اور عوام کے مقابلہ میں آنا چاہئے تھا، یہ ایک ایسا کام تھا، جس کا نتیجہ ان کے مکمل قلع قمع کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ اسلامی معاشرہ پر مذہبی ماحول حکم فرما تھا اور اس کے علاوہ ملک کے اندر اس پارٹی کی بنیادیں کافی کمزور تھیں۔ دوسرا راستہ جو ان کے لئے ممکن تھا، وہ یہ تھا کہ اپنی آئیڈیالوجی سے دست بردار ہو کر مکمل طور پر اسلامی جمہوریہ کی تائید کرتے۔ اس طرح وہ انقلاب کے بعد رونما ہوئے کھلے ماحول سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے تھے اور پارٹی کو پھر سے منظم کر سکتے تھے۔ یہ وہ راستہ تھا جسے تودہ پارٹی نے سوویت یونین کی تائید سے منتخب کیا۔ اس طریقہ کو منتخب کرنا ان کے لئے دو مقاصد پورے کرتا تھا: اولاً یہ کہ اپنے افراد کے ذریعہ حکومت کے اجرائی اداروں میں نفوذ کرنے کا امکان فراہم کرتا تھا، اور اس طرح وقت گزرنے اور مناسب موقع پر اسلامی جمہوریہ کا تختہ الٹ کر ملک کو سوویت یونین کے حوالہ کر سکتے تھے۔ ثانیاً یہ کہ ملک میں اپنی موجودگی کے نتیجہ میں سوویت یونین کی جاسوسی ایجنسی کے۔ جی۔ بی۔ کو ملک میں نفوذ کرنے اور اہم اور حساس مسائل کے بارے میں اطلاعات فراہم کرکے امکانات فراہم کر سکتے تھے۔

دوسرے راستہ کو منتخب کرنے کے بعد تودہ پارٹی نے اعلان کیا کہ وہ خط امام اور اسلامی جمہوریہ کو قبول کرتی ہے۔ یہ لوگ ایسی چیزوں کا دعویٰ کرتے تھے جو ان کی آئیڈیالوجی سے موافقت نہیں رکھتی تھیں۔ بہر حال چونکہ یہ پارٹی اسلامی جمہوریہ کے موقف کی تائید کرتی تھی، اس لئے یہ لوگ ملک کے آئین اور دوسرے قواعد وضوابط سے استفادہ کرتے تھے، اس طرح یہ پارٹی اپنی نیم اعلانیہ اور نیم مخفی زندگی کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئی تا کہ نظام کے مشکلات اور انقلاب کے بعد رونما ہونے والی افراتفری سے فائدہ اٹھائے اور اپنے مذکورہ دو مقاصد کو کسی حد تک حاصل کر سکے۔ اس طرح اس پارٹی کے عوامل نے اتنا نفوذ کیا اور یہاں تک کہ ان کے نفوذیوں میں سے ایک شخص (ایڈمرل افضلی) اسلامی جمہوریہ کی بحری فوج کی سربراہی کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔

تیسرے انقلاب میں خط امام کے عناصر کی کامیابیوں میں ایک، تودہ پارٹی کی خفیہ سرگرمیوں اور نفوذ کرنے والے افراد کا انکشاف اور انھیں تہس نہس کرنا تھا۔ اس کامیابی کے وسیع ابعاد تھے۔ حکومت نے نہ صرف ان کی خفیہ آرگنائزیشن (کمیٹی) کا انکشاف کیا بلکہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے تمام اراکین کو گرفتار کر لیا۔ انہوں نے سیاسی مبارزوں میں سابقہ اور طولانی تجربہ رکھنے کے باوجود اپنی ناجائز سرگرمیوں، من جملہ سوویت یونین کے لئے کی جانے والی جاسوسی کا اعتراف کیا۔

اس پارٹی کے معروف مفکر اور تھیورٹیشن ''احسان طبری'' کے اعترافات، بالخصوص اس کا اپنے ارتکاب جرائم کے بارے میں توبہ کرنا، کمیونزم کی بین الاقوامی تاریخ میں اپنی نوعیت کا انوکھا مسئلہ تھا![1] اس کے علاوہ تودہ پارٹی اور مشرقی بڑی طاقت کی جاسوسی کے بہت سے اسرار فاش ہوئے اور اس کے ساتھ ہی سوویت یونین کے ۱۸ سفارت کار ملک بدر کئے گئے۔

دوسری طرف سے یہ کامیابی اس امر کا سبب بنی کہ لیبرل عناصر کی طرف سے پروپیگنڈہ کا تنہا ہتھیار اور الزام کہ ''حکومت اسلامی جمہوریہ تودہ پارٹی کے نفوذ کرنے والے عناصر کے زیر اثر ہے'' ان سے چھین لیا جائے۔ اسلامی جمہوریہ نے عملی طور پر ثابت کیا

۱۔ احسان طبری کی لکھی گئی کتاب ''کژراھہ، تودہ پارٹی کی تاریخ کی یادیں'' انتشارات امیر کبیر ۱۹۸۷ء ملاحظہ فرمائیں۔

کہ ''نہ شرقی۔ نہ غربی'' کے اپنے موقف میں مکمل طور پر وفادار ہے اور انہی حالات میں کہ مغربی بڑی طاقت سے مقابلہ کر رہی ہے، مشرقی بڑی طاقت کے فتنہ وفساد کی بنیادوں کو بھی اکھاڑ پھینک رہی ہے۔

ب) قطب زادہ کے توسط سے آیت اللہ شریعتمداری کی آگاہی میں انجام پانے والی امریکی تختہ الٹنے کی سازش کا انکشاف بھی تیسرے انقلاب کی اہم کامیابیوں میں سے ایک کامیابی تھی۔ شیعوں کے ایک مرجع تقلید آیت اللہ سید محمد کاظم شریعتمداری، آیت اللہ بروجردی کی رحلت کے بعد ان کے ایک جانشین مراجع میں سے ایک مرجع کی حیثیت سے سامنے آئے اور آیت اللہ سید محسن حکیم کی وفات پر محمد رضا شاہ پہلوی کی طرف سے اس (شریعتمداری) کے نام تعزیت کا پیغام بھیجنے کے پیش نظر حکومت کے منظور نظر مرجع تقلید کے طور پر معین ہوئے۔

آیت اللہ شریعتمداری حوزہ علمیہ قم کے اعتدال پسند اور اصلاح طلب علماء میں سے تھے۔ جو انقلابی طور طریقوں کے مخالف تھے۔ وہ اسلامی حکومت کی طرف تدریجی حرکت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

آیت اللہ شریعتمداری نے ۱۹۶۳ء میں حضرت امام خمینیؒ کے ہمراہ پہلوی حکومت کے خلاف مبارزہ شروع کیا تھا، لیکن اس کا طرز عمل امام کے برعکس پر امن اور اصلاح طلبانہ تھا۔ اس نے انقلابی تحریک کے عروج پر سلطنت کے تحفظ اور ملک کے آئین پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا جس کے نتیجہ میں امام کے حامی علماء نے اس کی مخالفت کی۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد، آیت اللہ شریعتمداری صف اول کے علماء کی حیثیت سے ابھرے اور ''حزب جمہوری اسلامی'' کے مقابلہ میں ''حزب خلق مسلمان'' تشکیل دینے میں پہل کی۔ اس پارٹی کے افراد نے تبریز میں کچھ سرگرمیاں کر کے اس شہر کے ریڈیو اور ٹی، وی پر تین دن تک قبضہ کر لیا۔ ۱۹۸۲ء میں تختہ الٹنے کی سازش کا انکشاف ہونے پر معلوم ہوا کہ آیت اللہ شریعتمداری اس سازش سے باخبر تھے لیکن اس کی تائید نہیں کی تھی۔ اس نے ٹی، وی پر سازش سے باخبر ہونے کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد حوزہ علمیہ قم کے اساتذہ کی تنظیم ''جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم'' نے تاریخ

شیعہ میں اپنی نوعیت کے اقدام سے ان سے مرجعیت چھین لی۔اس کے بعد مرتے دم تک شریعتمداری خانہ نشین رہے۔

ج)اس دوران انکشاف ہونیوالی بنیادی اور خطرناک سازشوں میں سے ایک سید مہدی ہاشمی کی غدّاری کا قضیہ بھی تھا۔اس نے رہبر کے جانشین آیت اللہ منتظری سے رشتہ داری کی آڑ میں اور انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد اپنی مہم جویانہ سرگرمیوں کے پیش نظر اس کے گھر میں ایسا اثر ورسوخ پیدا کیا تھا کہ وہ ان کے موقف کے اتخاذ میں مؤثر واقع ہوسکتا تھا۔اس طرح سے وہ بالخصوص امام کی رحلت کے بعد اپنے عزائم کو پورا کرنے کی غرض سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے راہ ہموار کر رہا تھا۔وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لئے ہر سازش من جملہ مخالفین کے قتل،اسلحہ جمع کرنے،داخلی اور خارجی انقلاب دشمن عناصر سے رابطہ قائم کرنے اور اسناد جعل کرنے کی بھی پروانہیں کرتا تھا اور اپنے آپ کو جانشین رہبری کے گھر میں محفوظ رکھے ہوا تھا۔

حضرت امام خمینیؒ کی دوراندیشی اور سراغ رسانی کی وزارت کے توسط سے حاصل کی گئی اطلاعات کی بناء پر اکتوبر ۱۹۸۶ء میں رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ کے براہ راست حکم اور مداخلت سے سید مہدی ہاشمی کو اپنے جرم میں شریک افراد کے ہمراہ پکڑ لیا گیا۔اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کیا اور اسے کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔اس طرح انقلاب کے لئے ایک اور بڑا خطرہ ٹل گیا۔اگرچہ یہ قضیہ بھی قربانی کے بغیر نہیں تھا۔یعنی رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ،انقلاب کے تحفظ کے لئے بالآخر آیت اللہ منتظری کو معزول کرنے پر مجبور ہوئے،جسے وہ اپنی عمر کا ماحصل سمجھتے تھے جبکہ اس نے انقلاب کے لئے سالہا سال تک مبارزہ کیا تھا اور رنج و مصیبتیں اور جسمانی اذیتیں برداشت کی تھیں۔[1]

د)انقلاب کی ایک اور کامیابی ''مک فارلین'' کے قضیہ میں امریکہ کی پھر سے رسوائی تھی۔کارٹر کی رسوائی اور ناکامیوں کے بعد ریگن،اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد وعدہ دے چکا تھا کہ امریکہ کی عالمی عظمت اور آبرو کو پھر سے زندہ کرے گا اور پوری طاقت کے ساتھ اسلامی جمہوریہ کا

۱۔اس سلسلہ میں دوسرے حصہ میں قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔

مقابلہ کرے گا۔ وہ بظاہر ایران کو ایک ٹرورسیٹ اور غیر مہذب ملک کے عنوان سے خطاب کرتا تھا، لیکن خفیہ طور پر اسلامی جمہوریہ ایران سے رابطہ برقرار کرنے کے لئے انتھک لیکن احمقانہ کوششیں کرتا تھا۔ اس کی یہ کوششیں بالاخر لبنان میں امریکی یرغمالیوں کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں ایران کو ضروری اسلحہ بیچنے کے بدلے میں اسلامی جمہوریہ کے معنوی اثر ورسوخ سے استفادہ کرنے کے معاملہ پر ختم ہوئیں۔ ریگن کے سابق قومی سلامتی کے مشیر مک فارلین کا جعلی پاسپورٹ پر تہران آنا اور ریگن کی طرف سے دستخط کی گئی انجیل کا ایک نسخہ بھیجنا، امریکہ کی کوششوں کا ایک حصہ تھا۔ اس قضیہ کے انکشاف نے واٹرگیٹ کی یاد تازہ کردی، جس کے نتیجہ میں وقت کے صدر جمہوریہ ریچرڈ نکسن کو استعفی دینا پڑا تھا۔ مک فارلین کے قضیہ کے انکشاف پر امریکہ میں متعدد کمیشن بٹھائے گئے اور اس کے نتیجہ میں امریکہ کے عالی سطح کے کئی عہدہ داروں، من جملہ وائٹ ہاوس کے رئیس، قومی سلامتی کے سربراہ اور ملک کے اٹارنی جنرل کو استعفی دینا پڑا اور مک فارلین نے خودکشی کی اور سی۔ آئی۔ اے۔ کے سربراہ کی موت واقع ہوئی۔ اگر امریکہ کی دو حکمراں پارٹیوں میں اتفاق نہ ہوتا اور یہ موضوع جاری رہتا تو بعید نہیں تھا کہ ریگن کا اقتدار بھی ہاتھ سے چلا جاتا۔[۱]

ھ) اسلامی جمہوریہ نے جو دوسری کامیابیاں حاصل کیں، ان میں فوج اور تمام سرکاری اداروں میں بچھے ہوئے امریکی جاسوسی ایجنسی سی۔ آئی۔ اے۔ کے جاسوسی اور اطلاعاتی جال کا انکشاف تھا۔ سی۔ آئی۔ اے۔ نے امریکی سفارت خانہ، دوسرے الفاظ میں جاسوس خانہ پر قبضہ کے بعد بڑی مشکل اور کافی رقومات خرچ کر کے اس جاسوسی کے جال کو بچھایا تھا، البتہ جنگ کے دوران دشمن کو اطلاعات فراہم کرنے کے نتیجہ میں ملک کو کافی نقصان پہنچتا رہا۔

د) اگست ۱۹۶۸ء میں اسلامی جمہوریہ ایران کی حکومت کی طرف سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۵۹۸ کو قبول کرنا اور ایران و عراق کی جنگ کا خاتمہ، انقلاب کی پہلی دہائی کے آخری اہم حوادث میں سے تھا۔ اگر چہ حضرت امام خمینیؒ اس واقعہ کو تلخ اور زہر پینے جیسی مثال سے یاد

۱۔ مزید مطالعہ کے لئے کتاب "سیاست خارجی جمہوری اسلامی ایران" کی پانچویں فصل ص ۱۴۷ ملاحظہ ہو۔

کرتے تھے لیکن یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ اس کے بعد والے حوادث، بالخصوص عراق کا ایک دوسری جنگ میں الجھنا، اسلامی جمہوریہ ایران کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس طرح نہ صرف ایران نے اپنی سرزمین کی ایک انچ بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہ دی، بلکہ ایران آج مشرق وسطیٰ میں فوجی لحاظ سے طاقت ورترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔[1]

انقلاب کے بعد اس چوتھے مرحلہ میں جو کامیابیاں خط امام کے عناصر نے حاصل کیں، وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو اس فصل میں بیان ہوئیں۔ جو کچھ ذکر ہوا، وہ نمایاں سیاسی و فوجی کامیابیوں کا صرف وہ حصہ تھا جو کسی شک وشبہہ کے بغیر قابل ذکر و لمس تھا۔ اس کے علاوہ خط امام والوں نے انقلاب دشمن عناصر کا قلع قمع کر کے، لیبرل ازم کو رسوا کیا اور افراتفری کا خاتمہ کر کے معاشرہ میں امن وامان کا ماحول قائم کر دیا، جو مختلف اقتصادی، علمی، ثقافتی اور سیاسی میدانوں میں ترقی، اور ایجادات کے لئے ضروری تھا اور اس سلسلہ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسلامی انقلاب نے جو کچھ اس دہائی میں حاصل کیا، اس کے لئے بڑی قیمت ادا کی اور بہت سے ایسے نقصانات اٹھائے کہ دنیا کے کسی بھی انقلاب نے انقلاب کے بعد اس قدر نقصانات نہیں اٹھائے ہیں۔ تقریباً دوسو انقلابی علماء اور حکومتی عہدہ داروں کی شہادت اور اسی طرح محاذ جنگ پر کئی لاکھ فداکار سپاہیوں کی شہادت ایک بھاری قیمت تھی جسے اسلامی انقلاب نے اس مرحلہ میں ادا کی۔

۱۔ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ اور قرارداد نمبر ۵۹۸ کو قبول کرنے کے عوامل کے بارے میں، مصنف کی کتاب ''سیاست خارجی جمہوری اسلامی ایران''، چھٹی فصل، ص ۱۵۸ ملاحظہ ہو۔

انقلاب کی دوسری دہائی

- مقدمہ
- پہلا مرحلہ: داخلی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں
- دوسرا مرحلہ: اسلامی انقلاب اور عالم اسلام میں تبدیلیاں
- تیسرا مرحلہ: اسلامی انقلاب اور عالمی تبدیلیاں

مقدمہ

۱۹۸۹ء انقلاب کی دوسری دہائی کا آغاز تھا۔ اس دہائی کے آغاز میں چند اہم حوادث اور اتفاقات رونما ہوئے۔ ان کی تحقیق کے لئے ایران میں سیاسی واجتماعی تبدیلیوں کی تاریخ اور اسلامی انقلاب کے سلسلہ میں ایک نئی فصل کھولنے کی ضرورت ہے۔ یہ اہم تبدیلیاں سوویت یونین کے زوال اور دو قطبی نظام کے خاتمہ سے شروع ہوئیں۔

مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کی سطح پر کچھ حوادث رونما ہوئے کہ ان میں سب سے اہم خلیج فارس کی جنگ کے نام پر ایک وسیع جنگ کا آغاز تھا۔ ملک کے اندر بھی کچھ اہم حوادث رونما ہوئے کہ ان میں سب سے اہم حضرت امام خمینیؒ کی وفات تھی۔

دوسری دہائی کے آغاز میں امام خمینیؒ کی رحلت کے پیش نظر اس بات کا رجحان پایا جاتا تھا کہ اس دور کا نام دوسری دہائی کے بجائے امام خمینیؒ کے بعد کا دور رکھا جائے۔ کیونکہ امام خمینیؒ کی بے مثال شخصیت اور انقلاب سے پہلے اور بعد میں ان کے حیرت انگیز اثر ونفوذ کے پیش نظر یہ توقع کی جاتی تھی کہ ان کی رحلت کے بعد ملک میں ایک غیر معمولی اور عظیم خلا ایجاد ہو جائے گا اور مغربی تجزیہ نگاروں کے مطابق امام کی رحلت کے بعد ملک نہ صرف داخلی کشمکشوں سے دوچار ہوگا بلکہ انقلاب کی راہ روش میں بھی اس کا گہرا اثر پڑتا اور بہت سے دوسرے معاشروں کے مانند، جن میں مایہ ناز رہبر غیر معمولی کردار ادا کرتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد معاشرے بحران اور عظیم مشکلات سے دوچار ہوئے ہیں، ایرانی انقلاب بھی اسی قسم کے بحران اور مشکلات سے دوچار ہوگا۔

اس کے باوجود، اس دہائی کے حوادث اور اتفاقات کا پہلی دہائی کے حوادث سے موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہیت اور مفہوم کے لحاظ سے ان دو دہائیوں کے حوادث اور اتفاقات میں نمایاں فرق ہے۔

ایران کا انقلابی معاشرہ پہلی دہائی میں عظیم بحرانوں سے دوچار ہوا۔ انقلاب کو اپنے سیاسی نظام کو تشکیل دے کر مستحکم کرنے کے ساتھ مختلف قسم کی اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑا کہ ان میں سب سے اہم عراق کے ساتھ آٹھ سال تک جنگ میں مشغول ہونا تھا کہ اس کی وجہ سے ملک کے اکثر مسائل تحت الشعاع میں قرار پائے۔ یہ حادثہ اور دوسرے حوادث جو پیش آئے، ان میں سے تنہا ہر ایک اس جدید نظام کو شکست اور نابودی سے دوچار کرنے کے لئے کافی تھا۔ جبکہ اسلامی انقلاب کی دوسری دہائی اندرونی اور بیرونی لحاظ سے نہ صرف سخت بحرانوں سے دوچار تھی، بلکہ ماضی میں رونما ہوئی تبدیلیوں کے باوجود انقلاب اور سیاسی نظام کی حیثیت زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوئی اور نظام میں گزشتہ مشکلات اور کمزوریوں کو حل کرنے کی قدرت بھی پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں اور اس وقت یہ نظام بلندی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

انہی علل و حوادث اور سیاسی تبدیلیوں کے پیش نظر، ہم اسلامی انقلاب کا تین جہات سے، اندرونی، علاقائی اور عالمی سطح پر تحقیق و تجزیہ کریں گے تاکہ اس دور میں اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کے نظام کو درپیش بلاواسطہ یا بالواسطہ حوادث اور اتفاقات کی ایک واضح تصویر پیش کرسکیں۔

پہلا مرحلہ:

داخلی، سیاسی اور سماجی تبدیلیاں

اس فصل میں جس چیز پر ہم ایران میں سیاسی واجتماعی تبدیلیوں کے عنوان سے بحث وتحقیق کریں گے، وہ ایسے مسائل ہیں جنہوں نے اسلامی انقلاب کے طریق کار پر اہم اثرات چھوڑ دیئے ہیں ورنہ ان اتفاقات کے بغیر اسلامی انقلاب کسی دوسرے راستہ پر گامزن ہوتا اور مکمل طور پر متفاوت حوادث اور اتفاقات سے روبرو ہوجاتا اور بعض اوقات ممکن تھا اس میں انحراف کے اسباب فراہم ہوتے اور انقلاب کے پیکر پر کاری ضرب لگ جاتی۔ ان حوادث اور اتفاقات کا تاریخ کی ترتیب سے یوں نام لیا جاسکتا: رہبری کی جانشینی سے آیت اللہ منتظری کی معزولی، آئین میں ترمیم، حضرت امام خمینیؒ کی رحلت اور حضرت آیت اللہ خامنہ ای کا ان کے جانشین کی حیثیت سے منتخب ہونا اور تعمیر وترقی کے دور کا آغاز۔

الف: آیت اللہ منتظری کی برطرفی:

۱۹۸۹ء کے اوائل میں ایک دن اچانک تمام سرکاری اداروں اور تنظیموں کے نام وقت کے وزیر اعظم جناب میر حسین موسوی کی طرف سے ایک حکم نامہ (سرکلر) جاری ہوا۔ اس سرکلر کا متن حسب ذیل تھا: ''حضرت امام خمینی کے حکم سے سرکاری اداروں اور انجمنوں سے آیت اللہ منتظری کی تمام تصویریں ہٹالی جائیں۔''

چونکہ یہ سرکلر کسی مقدمہ کے بغیر جاری ہوا تھا، اس لئے عوام کے لئے حیرت وتعجب کا سبب بنا۔ اس کے فوراً بعد آیت اللہ منتظری کا ۲۷ مارچ کا خط اور اس کے دوسرے دن امام خمینیؒ کا جواب ریڈیو اور ٹی، وی سے نشر ہوئے۔ آیت اللہ منتظری کا خط امام خمینیؒ کے ۲۶ مارچ کے خط کا جواب تھا۔ لیکن امام کے اس خط کا متن نشر نہیں کیا گیا۔ اس قضیہ نے نہ صرف عام لوگوں کو حیرت اور تعجب میں

ڈالا بلکہ اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کے نظام کے مستقبل کو بھی ابہام سے دوچار کیا۔

لوگوں نے آیت اللہ منتظری کو قائمقام رہبر اور ان کے جانشین کی حیثیت سے پہچان کر اور اسے قبول کرلیا تھا اور اپنی دعاؤں میں ''امید امت وامام'' کے عنوان سے یاد کرتے تھے اچانک کسی مقدمہ کے بغیر اس کی معزولی کے مسئلہ سے روبرو ہوئے۔ اور وہ بھی امام خمینیؒ کی طرف سے۔ لوگ جب آقای منتظری کی سابقہ مجاہدتوں، فقاہت اور مجلس خبرگان رہبری کی طرف سے اسے رہبر کے جانشین کے منصب پر منتخب کرنے اور خود امام خمینیؒ کی طرف سے رہبری کے قابل توجہ اختیارات اسے سونپے جانے پر سوچتے تھے تو انھیں تعجب اور حیرت میں پڑنے کا حق تھا۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے ممبر اور کابینہ کے وزراء بھی اس قضیہ میں اپنی حیرت پر کنٹرول نہ کرسکے۔ بالاخر حضرت امام خمینیؒ نے مجبور ہوکر اپنے خط میں ان سے مخاطب ہوکر، مختصر وضاحت کرتے ہوئے وعدہ دیا کہ جلدی ہی اس سلسلہ میں تفصیلات سے آگاہ کئے جائیں گے[۱]۔ اس کے بعد امام کے فرزند حجتہ الاسلام سید احمد خمینیؒ کا لکھا ہوا ''رنجنامہ'' کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع ہوا، جس سے کسی حد تک پس پردہ حقائق واضح ہوئے

۱۔ پارلیمنٹ کے نمائندوں کے نام امام خمینیؒ کے خط کا متن یوں تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدمت فرزندان عزیز، اسلامی پارلیمنٹ کے ممبر اور وزرائے محترم۔ دامت افاضاتہم

سلام علیکم۔ میں نے سنا ہے کہ آپ لوگ آقای منتظری کے مسئلہ سے آگاہ نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ قضیہ کیا ہے۔ اسی حد تک جان لیجئے کہ آپ کے بوڑھے باپ نے گزشتہ دو سال سے اپنے اعلانیوں اور پیغامات کے ذریعہ اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی کہ یہ قضیہ یہاں تک پہنچے، لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ دوسری طرف سے شرعی فریضہ کا تقاضا تھا کہ نظام اور اسلام کے تحفظ کے لئے ضروری فیصلہ کرے۔ لہذا میں نے خون آلود دل سے اپنی زندگی کے ماحصل کو اسلام اور نظام کی مصلحت کے لئے برطرف کردیا۔ انشاء اللہ برادران وخواہران کے لئے مستقبل میں کسی حد تک وضاحت ہوگی۔ اس موضوع کے بارے میں سفارش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام اور نظام قابل مذاق نہیں ہے اور خطا سرزد ہونے کی صورت میں ہر شخص خواہ کسی منصب پر ہو فوری طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ خداوند متعال سے آپ سب کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

روح اللہ الموسوی الخمینی، ۱۹۸۹/۴/۱۵

(صحیفہ امام، ج۲۱ص۳۵۰)

اس کے بعد وقت کی سراغ رسانی کے وزیر جناب محمدی ری شہری نے ''خاطرات سیاسی'' کے عنوان سے اپنے سیاسی یادوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کر کے پس پردہ تکلیف دہ مسائل پر مزید روشنی ڈالی ہے[1]

اس تاریخ کو اب تک دس سال سے زیادہ عرصہ گزرا ہے۔ جب ہم اس دور کے حوادث اور واقعات پر غور کرتے ہیں تو امام کے اس بروقت فیصلہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر منتظری کو برطرف نہ کیا جاتا تو انقلاب کا مقدر ہی بدل جاتا اور اگر دوسرے انقلابوں، جیسے فرانس اور روس کے انقلابوں کے مانند دس سال کے بعد ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل نہ ہوتا تو کم از کم قطعی طور پر خانہ جنگی اور اندرونی اختلافات سے دوچار ہوتا جس کا انجام معلوم نہیں تھا کیا ہوتا

امام خمینیؒ نے اپنے ۲۶ مارچ ۱۹۸۹ء کے خط میں اس قسم کے حادثہ کے رونما ہونے پر افسوس کا اظہار کرنے کے ضمن میں آقای منتظری کو قائمقام رہبری کے منصب سے برطرف کرنے کے دلائل بیان کئے ہیں اور ان کی طرف سے بعض نااہل افراد من جملہ سید مہدی ہاشمی اور گروہ منافقین کی حمایت کو اپنے فیصلہ کی سب سے اہم دلیل بیان کی ہے۔

اس خط (۲۶/مارچ کے خط) کو اسی وقت نشر کرنے کے لئے امام کی تاکید کے باوجود نظام کے سربراہوں کے اصرار پر امام اس خط کو شائع نہ کرنے پر راضی ہوئے تھے۔ اور کچھ مصلحتوں کی بناء پر یہ خط دس سال تک شائع نہیں کیا گیا۔

ب) آئین میں ترمیم۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو منعقدہ ریفرنڈم کے ذریعہ اسلامی جمہوریہ کے نظام کی تشکیل کا اعلان ہونے کے فوراً بعد حکومت نے عام انتخابات کے ذریعہ ملک کے آئین کو مرتب کرنے کے لئے مجلس خبرگان کو تشکیل دیا اور اس مجلس نے اسلامی جمہوریہ کا پہلا آئین مرتب کیا۔ اس آئین کو ایک ریفرنڈم کے ذریعہ لوگوں نے منظور کیا۔ مجلس خبرگان کے پاس اس

۱۔ مزید مطالعہ کے لئے حجۃ الاسلام والمسلمین آقای سید احمد خمینیؒ کی طرف سے شائع کئے گئے پمفلٹ ''رنجنامہ'' اور حجۃ الاسلام والمسلمین جناب محمدی ری شہری کی تالیف کردہ کتاب ''خاطرات سیاسی'' کی طرف رجوع کیا جائے۔

آئین کو اسلام کے اصولوں کے علاوہ وقت کے حالات اور ضرورتوں کے مطابق مرتب کرنے کے لئے کوئی تجربہ شدہ نمونہ نہیں تھا اور اس کے نظریاتی ڈھانچہ کے سلسلہ میں علماء اور یونیورسٹی کے دانشوروں کے درمیان عام اتفاق بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ بالخصوص عبوری حکومت کے لیبرل نظریہ کے اراکین کی طرف سے مرتب شدہ مجلس خبرگان کو پیش کیا گیا مسودۂ آئین فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک کے آئین کا چربہ تھا اور یہ آئین بیشک ایک الٰہی اور اسلامی حاکمیت پر مبنی نظام ، بالخصوص ولایت فقیہ کے اصول کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی لئے اس مسودہ کو مسترد کر دیا گیا اور مجلس خبرگان نے خود آئین کے ڈھانچہ اور اصول کو مرتب کرنے کا اقدام کیا۔ فطری طور پر حکومت اسلامی کے پہلے تجربہ اور دنیا کے ایک مکمل عوامی انقلاب کی کامیابی کے بعد مرتب کیا گیا آئین خامیوں اور مشکلات سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ ان مشکلات میں سے اہم ترین مشکل شورائی مدیریت کی طرف مبالغہ آمیز حد تک ترجیح دینا تھی جس کے بارے میں سخت موقف اختیار کرنے کا سرچشمہ پہلوی نظام کی مطلق العنانیت کا تلخ تجربہ تھا۔ لیکن پہلی دہائی کے دوران تجربہ سے ثابت ہوا کہ میدان عمل میں شورائی نظام زیادہ کارآمد نہیں ہے۔

مئی ۱۹۸۹ء میں ملک کے اندرونی حالات سازگار ہوئے تاکہ ان نقائص کو دور کرنے کے لئے آئین میں ترمیم کی جائے افسوس کہ ۱۹۷۹ء کے آئین میں، ضرورت کے وقت اس میں ترمیم کرنے کا طریق کار تک ذکر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اسلامی پارلیمنٹ کے نمائندوں اور عدلیہ کی شورائے عالی کے ارکان نے مجبور ہو کر حضرت امام خمینیؒ سے درخواست کی تاکہ وہ ولایت مطلقہ فقیہ کے اختیارات سے استفادہ کر کے آئین میں ترمیم کرنے کی اجازت اور حکم جاری فرمائیں۔ بالآخر انہوں نے ایک حکم کے ذریعہ ۲۵ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کو مأموریت دی، تاکہ مندرجہ ذیل معین موضوعات میں ترمیم کر کے منظور شدہ مسودہ کو عام رائے شماری کے لئے پیش کریں:

۱۔ رہبری: رہبری کے بارے میں آئین میں دو مشکلات موجود تھیں۔ ایک یہ کہ رہبر یا شورائے رہبری کے انتخاب کا دائرہ مراجع تقلید تک محدود تھا اور دوسری مشکل یہ تھی کہ اعلمیت

یا اولویت کے عدم وجودگی کی صورت میں ملک کی رہبری کے لئے تین یا پانچ افراد پر مشتمل رہبری کی شوریٰ رکھی گئی تھی۔ آیت اللہ منتظری کو رہبر کی جانشینی کے منصب سے برطرف کئے جانے کی وجہ اور مراجع وقت کی ادھیڑ عمر کے پیش نظر رہبری کے لئے مرجع یا چند مراجع کا انتخاب مشکل اور ناممکن کام بن گیا تھا۔ اس لئے حضرت امام خمینیؒ نے آئین میں ترمیم کرنے والی کمیٹی کے نام اپنے ایک خط میں رہبر کو مراجع میں سے انتخاب کرنے کی شرط ہٹا کر اعلان فرمایا: ''رہبر کے لئے علمی لحاظ سے صرف اجتہاد اور فقاہت کافی ہے۔'' اس طرح آئین کی دفعہ نمبر ۱۰۷ میں اصلاح ہو کر فقہا و مجتہدین میں سے رہبر کو منتخب کرنے کا راستہ ہموار ہوا۔

اسی طرح رہبر کے ولی فقیہ کے عنوان سے اختیارات قابل بحث ہونے، حضرت امام خمینیؒ کے ولایت مطلقہ فقیہ کی اصل کے معتقد ہونے اور ۱۹۷۹ء کے آئین میں اس مسئلہ پر وضاحت نہ ہونے کے پیش نظر آئین کی دفعہ نمبر ۵۷ میں اصلاح کر کے ولایت مطلقہ فقیہ کی حاکمیت اور یہ کہ ملک کی تینوں قویٰ (اجرائی، قانون سازیہ اور عدلیہ) کا ان کے تحت نظر ہونا واضح طور پر بیان ہوا۔

۲۔ وزیراعظم کے منصب کا حذف:

۱۹۷۹ء کے آئین کے مطابق صدر جمہوریہ لوگوں کی براہ راست ووٹنگ سے منتخب ہوتا تھا اور وزیراعظم صدر جمہوریہ کی تجویز اور پارلیمنٹ کے اعتماد کے ووٹ پر منتخب ہوتا تھا اور وزراء بھی تین مراحل کو طے کرنے، یعنی وزیراعظم کی طرف سے معرفی، صدر جمہوریہ کی تائید اور پارلیمنٹ کی منظوری پر معین ہوتے تھے۔ اس طرح اجرائی قدرت کی ذمہ داری وزیراعظم پر تھی اور وزیراعظم اور وزراء کے منتخب ہونے کے بعد حقیقت میں صدر جمہوریہ کی حیثیت صرف اعزازی بن جاتی تھی اور یہ امر صدر جمہوریہ کے لوگوں کی طرف سے براہ راست منتخب ہونے اور انتخابی مہم کے دوران لوگوں کو دئے گئے وعدوں اور لوگوں کی توقعات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے اجرائی امور میں ایک قسم کا دوہرا پن پیدا ہوتا تھا جس کی وجہ سے انقلاب کی پہلی دہائی کے دوران کچھ مشکلات پیدا ہوئیں۔ اس لئے آئین کی ترمیم میں وزیراعظم کا منصب حذف کیا گیا اور صدر جمہوریہ کو اجرائی امور کے سربراہ کی حیثیت

سے وزیر اعظم کا عہدہ بھی سونپا گیا۔

۳۔عدلیہ:

۱۹۷۹ء کے آئین کے مطابق عدلیہ کو چلانے کی ذمہ داری ملک کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، اٹارنی جنرل، کہ یہ دونوں ہی رہبری کی طرف سے منصوب ہوتے تھے، اور ملک کے ججوں کی طرف سے منتخب کئے گئے تین ججوں پر مشتمل ایک شوریٰ پر تھی۔ اس مسئلہ نے بھی عدلیہ کے امور کو چلانے اور اس کی پالیسی میں اور اسی طرح شوریٰ کے اراکین کی ذمہ داری سنبھالنے میں واقعی مشکلات پیدا کئے تھے اور اس مسئلہ کے پیش نظر کہ عدلیہ کو ولی امر مسلمین کے تحت ہونا چاہئے، عدلیہ کی شوریٰ کے تین ارکان کا انتخابی ہونا اس اصل کے منافی تھا۔ اس لئے آئین کی ترمیم کرنے والی کمیٹی نے عدلیہ کے مربوطہ دفعہ میں ترمیم کر کے اس کو چلانے کی ذمہ داری عدلیہ کے سربراہ کی حیثیت سے رہبری کی طرف سے معین کئے گئے ایک مجتہد کو سونپی۔

۴۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن:

۱۹۷۹ء کے آئین کے مطابق ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو چلانے کی ذمہ داری تین اداروں (قانون سازیہ، عدلیہ اور اجرائی) پر تھی، یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا ڈائریکٹر مذکورہ تین اداروں کے نمائندوں کی طرف سے منتخب ہوتا تھا اور ان ہی کے سامنے جوابگو بھی ہوتا تھا۔ فطری طور پر حکومت، پارلیمنٹ کے نمائندے اور عدلیہ کے متغیّر ہونے کے پیش نظر ذرائع ابلاغ کا یہ قومی ادارہ اپنے ارادہ میں ثابت قدم اور پائیدار نہیں ہوسکتا تھا۔ بالخصوص جب ان تین اداروں کے نمائندوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور ہر ایک کوشش کرے کہ اس ادارہ پر اپنے ہی نظریات نافذ کر کے ذرائع ابلاغ کے اس قومی ادارہ کو اپنی پارٹی کی پالیسی اور مرضی کے مطابق منظّم کرے۔ انقلاب کی پہلی دہائی کے دوران ان تین اداروں کے نمائندوں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایڈمنسٹریشن کے درمیان اختلاف نظر پیدا ہونے کی وجہ سے امام کے لئے مداخلت کرنے کی نوبت آتی تھی اور اس ادارہ کو چلانے کی روش طرز

عمل میں مشکلات سامنے آ گئے اور ان خبر رساں مراکز کا طرز عمل عام ہو گیا۔ آئین کی ترمیم میں اس دفعہ میں بھی اصلاح کی گئی اور طے پایا کہ اس ادارہ کا ڈائریکٹر رہبر کی طرف سے نامزد ہوگا اور مذکورہ تین اداروں (اجرائی، قانون اور عدلیہ) کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی اس کی نگرانی کرے گی اور اس طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا ادارہ بھی گروہی تصرف سے نکل گیا۔

۵۔ مجمع تشخیص مصلحت نظام:

۱۹۷۹ء کے آئین کے مطابق پارلیمنٹ میں پاس ہوئے تمام قوانین کا شرع اور ملک کے آئین کے مطابق ہونے کے سلسلہ میں شورائے نگہبان کی طرف سے تائید ہونی چاہئے تھی اور بعض مواقع پر پارلیمنٹ اور شورائے نگہبان میں اختلاف نظر پیدا ہوتا تھا، لیکن ان اختلافات کو دور کرنے کے لئے کوئی طریق کار معین نہیں تھا۔ امام خمینیؒ نے حکومت کے تین اداروں کے سربراہوں کی درخواست اور اسلامی پارلیمنٹ کی منظوری پر ے فروری ۱۹۸۸ء کو "مجمع تشخیص مصلحت نظام" کے نام پر ایک ادارہ تشکیل دیا تاکہ پارلیمنٹ اور شورائے نگہبان کے درمیان اختلافی مسائل کو اس مجمع کے حوالہ کیا جائے اور اس کا فیصلہ قطعی اور حکم فیصل ہو۔ آئین میں ترمیم کے وقت اس موضوع پر توجہ کی گئی اور آئین کی دفعہ نمبر ۱۱۲ میں اضافہ کر کے "مجمع تشخیص مصلحت نظام" کو پارلیمنٹ اور شورائے نگہبان کے درمیان اختلافی مسائل کو حل کرنے کے اختیارات دئے گئے۔ اس مجموعہ کا نام، رہبر کی طرف سے کوئی مسئلہ اس مجموعہ کی طرف مراجعہ کرنے کی صورت میں، رہبر کا مشاورتی ادارہ رکھا گیا۔

۶۔ آئین میں ترمیم:

اس موضوع کے بارے میں ۱۹۷۹ء کے آئین میں کوئی اشارہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے آئین میں ایک دفعہ (نمبر ۱۷۷) کا "آئین میں ترمیم کی دفعہ" کے نام سے اضافہ ہوا۔ اس کے مطابق جب بھی رہبر انقلاب ضروری سمجھیں، مجمع تشخیص مصلحت نظام سے صلاح و مشورہ کے بعد صدر جمہوریہ کو تجویز دیں گے کہ آئین میں بیان شدہ تفصیل کے مطابق آئین کی ترمیمی کمیٹی کو تشکیل دیں اور اصلاحات

انجام دینے کے بعد اصلاح شدہ مسائل کی رہبر کی طرف سے تائید کے بعد ان پر ریفرنڈم کرایا جائے۔

۷۔ پارلیمنٹ کے نام میں تبدیلی:

چونکہ ۱۹۷۹ء کے آئین میں قوم پرست عناصر کے زیر اثر قانون ساز ادارہ (پارلیمنٹ) کا نام ''مجلس شورائے ملی'' رکھا گیا تھا اور امام خمینیؒ کی طرف سے ۱۹۸۰/۶/۲۵ء کو جاری کئے گئے ایک حکم کے مطابق تمام خط و کتابت اور مخاطبات میں ''مجلس شورائے ملی'' کے بجائے ''مجلس شورائے اسلامی'' کے عنوان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ لہذا آئین میں ترمیم کے دوران آئین میں باضابطہ طور پر ''مجلس شورائے ملی'' کے بجائے ''مجلس شورائے اسلامی'' کا نام لایا گیا۔

مذکورہ اصلاحات کے بارے میں عام لوگوں کی رائے شماری کی گئی اور لوگوں نے ان کی منظوری دیدی اور اس طرح نظام کے مختلف اداروں میں پیدا ہونے والی مشکلات حل ہوئیں اور عملی طور پر ثابت ہوا کہ نظام کے مختلف اداروں کو کارآمد بنانے میں یہ اصلاحات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ج۔ امام کی رحلت اور آیت اللہ خامنہ ای کا بعنوان رہبر انتخاب:

حضرت امام خمینیؒ نے ایک مدت تک بیمار رہنے اور آپریشن کے بعد سرانجام ۴رجون ۱۹۸۹ء کو اس دار فانی کو وداع کیا، اور ۲۵ سال تک مبارزہ اور تاریخ اسلام کے عظیم ترین انقلاب کی قیادت کرنے کے بعد ان کی بابرکت عمر کی شمع حیات بجھ گئی اور آپ اپنے لاکھوں شیدائی مسلمانوں اور مریدوں کو داغ مفارقت دے گئے۔

ملک کے اندر اور باہر انقلاب دشمن عناصر کی ایک بڑی امید یہ تھی کہ، رہبر انقلاب کی وفات کے بعد انقلاب کو کمزور کر کے نابود کرنے کا موقع فراہم ہوگا۔ کیونکہ امام خمینیؒ کا اپنے پیروں میں غیر معمولی اثر و نفوذ اور ان کی استثنائی کشش اور قدرت کے پیش نظر وہ انقلاب کی کامیابی، اسے دوام

بخشنے اور انقلاب دشمن عناصر کی تمام سازشوں کو ناکام بنانے میں اس قدر اہم کردار ادا کرتے تھے، کہ انقلاب کے دشمنوں کے خیال میں کسی اور کے ذریعہ یہ خلا پر ہونا ممکن نہیں تھا۔

دوسرے انقلابوں کا تجربہ اور سیاسی، اجتماعی تبدیلیاں بھی اپنے رہبروں کی قدرت پر استوار اور منحصر ہونے کے پیش نظر مذکورہ نظریہ کی تائید کرتی تھیں۔

بعض افراد فوجی بغاوت کو ناقابل انکار سمجھتے تھے[1] یا انقلاب کے دوام رہنے کو امام کے دل کی دھڑکن سے مربوط جانتے تھے اور تصور کرتے تھے کہ امام کے دل کی دھڑکن رکنے کے ساتھ ہی انقلاب بھی دم توڑ بیٹھے گا۔[2]

کچھ لوگ حد درجہ خوش فہمی کی بنا پر اس مسئلہ پر نظر دوڑاتے تھے تو، قوی احتمال یہی دیتے تھے کہ ملک خانہ جنگی سے دوچار ہو جائے گا، اگر چہ یہ لوگ اس قسم کی جنگ کو اسلامی نظام کو سرنگوں کرنے میں کامیاب ہونے کو بعید جانتے تھے۔[3]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کی رحلت کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ ان کے پیروؤں کے لئے بھی مسلسل اور گہری فکر و پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا، اسی لئے وہ اپنے نعروں اور دعاؤں میں حضرت امام زمانہ (عج) تک ان کی طول عمر کی تمنا کرتے تھے۔ یہ پریشانی صرف عام لوگوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ نظام جمہوری اسلامی کے اعلیٰ درجہ کے عہدہ داروں کو بھی عمیق حد تک یہ پریشانی لاحق تھی اور بہت ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود آیت اللہ منتظری کو امام کے جانشین کی حیثیت سے منتخب کرنے میں جلد بازی کا سرچشمہ امام کی دل کی بیماری اور انہی پریشانیوں کا سبب تھا۔ امام کی رحلت سے صرف ۷۰ دن پہلے آقای منتظری کی معزولی نے ان پریشانوں میں مزید اضافہ کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام کی قدر و منزلت، محبوبیت اور ان کے غیر معمولی جاذبہ اور

1.Erranol Abrahimian' the Iranian Mujahedin, Yale unirersity press,1989,p77

2.Shayl Bakhash, The Reign of the Ayatollahs, Guernsy,press, u.k1965,p,264

3. Dilip Hird'iran Under The Ayatollahs, Routledge Kejan Paul London 1985'p.367

انقلاب میں ان کی بے نظیر رہبری اور ہدایت نے تاریخ اسلام اور دنیا کے انقلابوں کی تاریخ میں ان کی ایک استثنائی تصویر کھینچی تھی جو فطری طور پر اسی قدرت، جاذبہ اور صلاحیت کے ساتھ ان کی جانشینی کو ناممکن دکھاتی تھی۔ امام بھی خود اس مسئلہ سے آگاہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے کچھ غیر معمولی کوششیں کر کے نہ صرف انقلاب کے راستہ سے تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا، بلکہ قابل قدر طریق کار کو پیش کر کے، اپنے جانشین کے لئے انقلاب کی ہدایت کی راہ ہموار کر دی۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی رحلت سے پہلے آقای منتظری کی معزولی اور آئین میں ترمیم کے بارے میں ان کے قطعی اور فوری فیصلے انہی بنیادوں پر تھے۔ یہاں تک کہ امام نے منتظری کو برطرف کرنے کے بعد اپنے اشاروں اور کنایوں میں موجودہ رہبر کی صلاحیت اور شائستگی کی تائید کی تھی اور اس طرح ''مجلس خبرگان'' کو رہبری کو تذبذب اور پریشانی سے نکالا۔

امام خمینیؒ کی کارکردگیوں میں سے ایک کارکردگی، انقلاب کی تحریک کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر، بالخصوص انقلاب سے پہلے کے اداروں کی تعمیر نو اور تحفظ کرتے ہوئے نظام جمہوری اسلامی کی ساخت کو استحکام بخشنے کے لئے تیزی کے ساتھ موازی انقلابی اداروں کو تشکیل دینا تھا۔ امام نے انقلابی اداروں کو تشکیل دے کر نگرانی اور کنٹرول کا ایک بے مثال سسٹم ایجاد کیا۔

امامؒ کا الٰہی، سیاسی وصیت نامہ بھی ایک لافانی منشور کے مانند آئندہ نسلوں کے لئے باقی رہا ہے جو مستقبل کے رہبروں اور امام کے شیدائیوں کے لئے واضح طور پر صحیح راستہ معین کرتا ہے اور اس راہ سے انحراف کو انقلاب کے اصولوں سے انحراف کے مترادف جانتا ہے۔

امام خمینیؒ کی تدفین و تکفین کی رسوم (تشیع جنازہ) میں نوے لاکھ ایرانیوں کی شرکت اور ان کی رحلت کے غم میں دسیوں افراد کا مر جانا، لاکھوں انسانوں۔ کے ان کے تئیں ناقابل بیان عشق و محبت کا ثبوت تھا۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تشیع جنازہ کے دن تہران میں شائد ہی کوئی شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہا ہوگا۔

امام کی شخصیت، ان کے رول اور کردار و رفتار کی خصوصیتوں کے بار میں کئی کتابیں لکھنے کی

ضرورت ہے اور حقیر کا قلم اس سلسلہ میں عاجز ہے۔ چونکہ اس کتاب میں اجمالی طور پر تجزیہ کی روش مدنظر ہے، اسلئے صحیفۂ امام کے دیباچہ میں ان کے جانشین کے قلم سے لکھے گئے ان مطالب پر اکتفا کرتے ہیں:

''دینا کے کسی بھی نقطہ میں اگر کوئی انسان علم وعقل اور بلند فکری یا تقویٰ اور پرہیز گاری اور مستحکم ایمان یا عظمت ودلیری اور بلند ہمت یا زیرکی ودوراندیشی اور سیاسی پختگی سے ایک عظیم کام کے لئے میدان میں قدم رکھے اور پائیداری وصبر واستقامت سے ایک مقصد کے لئے کوشش کرے، تو بیشک اپنے ملک وملت یہاں تک بشریت کو عظیم فخر ومباہات اور لافانی ترقیوں سے ہم کنار کرسکتا ہے۔ جن لوگوں کا نام تاریخ کی نامور شخصیتوں کی فہرست میں ثبت ہوا ہے، وہ مذکورہ خصوصیات میں سے صرف بعض کے مالک تھے''

عصر حاضر کے ایک عظیم نامور، یعنی امام خمینیؒ میں یہ تمام خصوصیات ایک ساتھ پائی جاتی تھیں وہ بھی آسانی سے حاصل نہ ہونے والی اور کم نظیر ہیں۔ وہ ایک متقی دانشور، پرہیز گار عقلمند، سیاست داں حکیم وفلسفی، مفکر مؤمن، شجاع وہوشیار عارف، عادل حاکم اور ایک فداکار مجاہد تھے۔ وہ ایک فقیہ ، اصولی، فلسفی، عارف، معلم اخلاق، ادیب اور شاعر تھے۔ طولانی مدت تک تدریس کی عالی ترین کرسی اور حوزہ علمیہ کا سرگرم ترین علمی اجتماع ان سے متعلق تھا۔ ان میں قرآن مجید کے معارف سے حاصل کی گئی اور دل وجان کو ان سے مزین کی گئی خداداد نمایاں خصلتیں موجود تھیں، جنہوں نے انھیں ایک عظیم، جاذبہ اور مؤثر شخصیت کے طور پر ابھارا تھا۔ حالیہ ایک صدی کے دوران، جو عظیم شخصیتوں ، اور دینی سیاسی اور اجتماعی نامور مصلحوں کی صدی ہے، ابھری ہوئی تمام نمایاں شخصیتیں ان کے مقابلہ میں معمولی نظر آتی تھیں۔ جس کام کے لئے انہوں نے قدم اٹھایا اور ایمان، توکّل، حکمت عملی اور صبر واستقامت سے کام لیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے، وہ بھی اس قدر عظیم، ناقابل یقین اور حیرت انگیز تھا۔

ان کی ممتاز اور درخشاں شخصیت، ان کی سیاسی زندگی کے ہر دور میں چکا چوندھ لگا دینے والی اور

بے مثال تھی۔اس وقت بھی جب قم میں دینی مرجعیت کے منصب سے پہلوی خاندان کی کٹھ پتلی اور فاسد حکومت اور اس کے بے جا مداخلت کرنے والے حامی امریکہ کے خلاف انبیائے الٰہی کے جیسا مبارزہ شروع کر کے چیلنج کیا اور شاہ اس کے حامیوں کے ظلم ،استبداد ،زر و زور اور دین مخالف تحریکوں کے مقابلہ میں عوامی غیظ و غضب کا طوفان لا کھڑا کیا اور اس وقت بھی جب پندرہ سالہ دشوار گزار اور کٹھن مبارزہ کے بعد ملت ایران کے عظیم جہاد کے ذریعہ خائن ، نالائق اور فاسد حکومت کو سرنگوں کر کے اسلامی نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔انہوں نے ہر حالت میں اپنی عمیق حکمت عملی ،تدبیر اور عقلمندی کے ساتھ اپنے اندر موجود قوی ایمان ،شجاعت اور فداکاری کا مظاہرہ کیا۔

وہ ایران کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ایک جہت سے ایران کی جغرافیائی ،سیاسی ، بے شمار قدرتی اور انسانی استعداد اور اس کی عظیم تمناؤں اور مقاصد کی حالت سے واقف تھے اور ایک جہت سے اس کی حالیہ ۱۵۰ سالہ ناگفتہ تاریخ ،اجنبیوں اور لٹیروں کے تسلط ، پہلوی خاندان اور اس سے مربوط ایک ہزار خاندانوں کی خیانت ،فسق و فجور اور خودخواہی ،اور لوگوں پر مسلط کئے گئے فقر اور علمی ، صنعتی اور اخلاقی پسماندگی ......اور اس سے بڑھکر اس مملکت کی عظیم ،شجاع اور باایمان ملت سے آگاہ تھے۔

وہ دنیا ،سامراجی چنگل میں پھنسی ملتوں ،استعماری حکومتوں ،حیران اور حقیقت کے تشنہ نوجوان نسل ،بالخصوص مسلمان ممالک اور امت اسلامیہ کی افسوس ناک حالت سے بھی آگاہ تھے اور ان کے لئے ہمدرد تھے اور فلسطین کا غمناک مسئلہ ان کی روح کو تکلیف پہنچا رہا تھا۔

دینی ذمہ داری کے احساس نے انھیں ایک ایسے عظیم اور تاریخی میدان کارزار میں لاکر کھڑا کردیا کہ تاریخ کی استثنائی شخصیتوں کے علاوہ کسی نے ایسے میدان میں قدم نہیں رکھا ہے اور گنے چنے افراد کے علاوہ کوئی اس میدان سے کامیاب نہیں نکلا ہے۔

انھیں ایک ایسی فاسد حکومت کے چنگل سے ایران کو نجات دلانے کی فکر تھی جس نے اس ملک پر فقر ،انحطاط اور اقتصادی ،اخلاقی و علمی پسماندگی مسلط کردی تھی اور اس کا واحد علاج اسلام کی طرف پلٹنے ،اسلامی سیاسی نظام اور الٰہی اقدار پر مشتمل حکومت کو تشکیل دینے میں سمجھتے دیتے تھے۔انہوں نے

اس راستہ کو کھول کرامت اسلامیہ کے سامنے ایک زندہ نمونہ پیش کیا اور عالم اسلام میں ایک نئی لہر دوڑادی پیدا کی کہ جس کا پہلا مبارک پھل مسلمانوں میں اسلامی حقیقت کا دوبارہ زندہ ہونا تھا۔انہوں نے اپنے مبارزہ کو ابتداء سے ہی خدا کے نام اور لوگوں کی وسیع پیانہ پر حمایت سے شروع کیا۔لوگوں سے مخاطب رہے اور مدد کے لئے ان سے ایمان، عقل اور ہمت کی درخواست کی۔کبھی پارٹیوں اور گروہوں کے پیچھے نہیں دوڑے۔غالباً ان کے تحرکوں کے بارے میں شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی سیاسی ملی بھگتوں اور وابستگیوں سے متنفر تھے۔لوگوں کے ساتھ ہمیشہ سچائی اور ہمدردی سے مخاطب ہوتے تھے اور ایک صاحب بصیرت معلم اور آگاہ رہنما کے مانند مبارزہ کے طولانی راستہ پر اپنی عقل وحکمت اور معرفت کو راہیوں کے اختیار میں رکھا۔

جب دنیا والوں کے یقین نہ کرنے کے باوجود ملت ایران کا مبارزہ کامیاب ہوا اور ایران کی ملت نے متفقہ طور پر ان کی رہبری اور حکمرانی کو دل وجان سے قبول کرلیا، تو انہوں نے اپنے طریق کار اور کردار سے اس ملک کی سیاسی تاریخ میں عظیم ترین تبدیلی ایجاد کی۔یعنی ایک ظالم ،ستمگر اور دنیا پرست سلطنت کو خدا اور بندگان خدا کی حکومت یعنی امامت میں تبدیل کردیا۔اپنے اقتدار کو عدل وانصاف سے مزّین کیا اپنی ناقابل انکار برتری اور فوقیت کو عبودیت اور خاکساری سے منور کیا اپنی طاقت وکامیابی کا تقویٰ اور پرہیز گاری سے اظہار کیا۔انہوں نے خدا اور خدا کی بندگی کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں چھوڑا۔چونکہ ایک سنگین امانت کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر لئے ہوئے تھے،اس لئے اپنی روح کو مزید چوکس اور محتاط کیا۔ان کے ذاکر وخاشع دل سے اٹھی ہوئی بات اور دین سے حاصل کئے گئے کردار نے ،ان کی معنویت اور صاف گوئی کی شیدائی ایرانی ملت کی فکر وذہن میں معرفت وحکمت کے صاف شفاف چشمے جاری کئے اور حکومت کے عہدہ داروں ،ذمہ داروں اور عام لوگوں کو بے شمار دشمنیوں، ریشہ دوانیوں، مکاریوں اور زبردستی پیدا کی گئی حد سے زیادہ مشکلات کو حل کرنے کے لئے آمادہ ومسلح کیا۔

امام کی زندگی کے آخری دس سال، اسلام کے سیاسی نظام کی پیدائش اور دنیا کے مسلمانوں میں

اسلام کی اصلی صورت کے زندہ ہونے اور ہمارے ملک میں اسلام کا پرچم لہرانے کا دور ہے۔ یہ ایران کی آزادی واستقلال، قومی سر بلندی وغرور اور ملت کی بے مثال سرافرازی اور تعمیر وترقی کی طرف بڑھنے کا دور ہے۔ یہ انقلابی جوش وجذبہ، سیاسی شعور اور ملک کے تحفظ وتعمیر وترقی کا دور ہے۔ یہ عالمی سطح پر ایران کی سربلندی اور بین الاقوامی حوادث کو تحت تاثیر قرار دینے کا دور ہے۔ ہمارے ملک میں ایک نیا راستہ کھلنے کا دور ہے۔ اس کو جاری رکھتے ہوئے اسلامی ایران مادی اور معنوی سر بلندی حاصل کر سکتا ہے۔ حکیم ودانا امام نے اس راستہ کو مخصوص نشانیوں سے معین کیا ہے اور انھیں دسیوں راہ گشا تقریروں میں واضح کر دیا ہے۔ یہ نشانیاں اور راہنمائیاں آج بھی اسی طرح گراں قیمت، مضبوط اور راہ گشا ہیں اور ایران کی حکومت اور ملت کو کامیابی اور مادی ومعنوی ترقی کی منزل کی طرف نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے آج بھی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی ضرورت ہے۔

مجلس خبرگان رہبری نے امام کی رحلت کے دن ہی (۴ جون ۱۹۸۹ء) جلسہ منعقد کیا اور امام کے وصیت نامہ کو سننے کے بعد ایک خفیہ جلسہ کر کے دس گھنٹے سے کم وقت میں امام کا جانشین انقلاب کا نیا رہبر منتخب کیا گیا اور وقت کے صدر جمہوریہ حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ، کو رہبر انقلاب کی حیثیت سے منتخب کرنے کی خبر ذرائع ابلاغ نے ایران کے لوگوں اور دنیا کے لئے منتشر کر دی۔ مجلس خبرگان میں کس طرح اور کس گفتگو کے نتیجہ میں کسی مخالفت کے بغیر کیسے اتنی جلدی یہ اہم فیصلہ لیا گیا مکمل طور پر واضح نہیں ہے، کیونکہ گفت وشنید خفیہ تھی۔ اس کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آئین میں ترمیمی کمیٹی کے نام امام کا ۱۹۸۹/۵/۶ء کے خط اور اسی طرح مجلس خبرگان کے ووٹوں کو متفرق ہونے سے بچانے کے لئے حضرت امام کے اشاروں اور ہدایات نے، مطلوب فیصلہ لینے میں کلیدی اور بنیادی رول ادا کیا۔ اس طرح مغربی تجزیہ نگاروں اور انقلاب دشمن عناصر کی تمام پیشنگوئیوں کے برعکس کسی مشکل اور رکاوٹ کے بغیر بالکل آرام وسکون سے اقتدار منتقل ہوا اور معاشرے کے تمام طبقات سے مربوط لوگوں، سیاسی اور مذہبی گروہوں اور مسلح افواج نے نئے رہبر کی بیعت کر کے مجلس خبرگان رہبری کے فیصلہ کی تائید کی۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای ۱۹۳۹ء میں ایک عالم گھرانے میں پیدا ہوئے اپنے باپ اور اجداد کی طرح دینی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوئے اور اپنے والد بزرگوار اور شہر نجف اور قم کے حوزہ علمیہ کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور جلدی ہی خود حوزہ کے اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے استاد اور مرشد کے مبارزہ وسیاست کے درس میں ۲۵ سال تک سرگرمی کے ساتھ شرکت کرتے رہے اور ایک مستعد شاگرد کی حیثیت سے طاغوتی نظام کے خلاف مبارزہ میں سرگرم عمل رہتے ہوئے کئی بار گرفتار اور جلاوطن کئے گئے اور پہلوی حکومت کی طرف سے جسمانی اذیتیں برداشت کیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ، امام کی تحریک اور مبارزہ کے آغاز سے انقلاب کی کامیابی تک امام کے گنے چنے ساتھیوں کے مانند مبارزہ میں ثابت قدم اور پایدار رہے[1]!

اسلامی انقلاب کی کامیابی نے ان پر اور امام کے دوسرے ساتھیوں پر مزید اہم اور حساس ذمہ داریاں ڈالیں اور انہوں نے حساس اور خطرناک ذمہ داریاں قبول کرتے ہوئے انقلاب کی کشتی کے ناخدا کی حیثیت سے پتوار ہاتھ میں لے کر اسلامی انقلاب کا نظام تشکیل پانے کے بعد مختلف قسم کے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مقابلہ کیا۔

حضرت آیت اللہ خامنہ ای نے آیت اللہ بہشتی اور حجتہ الاسلام ہاشمی رفسنجانی کے دوش بدوش انقلاب کے میدان میں بیشتر کردار ادا کیا۔ انقلابی کونسل کی رکنیت، اسلامی پارلیمنٹ کی نمائندگی، اسلامی جمہوریہ کے صدر اور بالاخر تہران کی نماز جمعہ کی امامت وہ منصب تھے جن پر فائز رہ کر انہوں نے انقلاب کی پُر تلاطم اور نشیب وفراز سے بھری پہلی دہائی کے دوران ملک کے اندر اور باہر، محاذ جنگ میں اور محاذ کے پیچھے اور بین الاقوامی سطح کے مختلف پلیٹ فارموں پر کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھائی۔ اس کے علاوہ وہ امام کے ایک مطیع اور فرمانبردار شاگرد رہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ امام اپنے اس انقلابی شاگرد کے واضح اور درخشاں کارناموں کے پیش نظر اس نتیجہ پر

۱۔ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے کتاب ''زندگی نامہ مقام معظم رہبری'' انتشارات موسسہ فرہنگی قدر ولایت، طبع چہارم، ۱۳۷۹ھ ش ملاحظہ ہو۔

پہنچے تھے کہ وہ انقلاب کی رہبری اور ان کے جانشینی کی لیاقت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے اپنی رحلت سے پہلے مملکت کے سربراہوں کے سامنے ایک دن پورے اطمینان کے ساتھ اپنے اس نظریہ کا کھلم کھلا اعلان کیا تھا۔ اگرچہ وہ عمر کے لحاظ سے اس عظیم ذمہ داری کے لئے جوان دکھائی دیتے تھے، لیکن اس مدت کے دوران میدان عمل میں انہوں نے اپنی شائستگی کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ لوگ ان کے اندر امام کی صورت کا مشاہدہ کرتے تھے اور جلدی ہی اپنے قائد کی فرقت کے غم کو ان کی موجودگی میں فراموش کر گئے۔

غیر ملکی اور داخلی تجزیہ نگاروں اور دانشوروں کے تجزیوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت آیت اللہ خامنہ ای اسی راستہ پر چل رہے ہیں جس پر امام خمینیؒ گامزن تھے اور اسی وجہ سے آیت اللہ خامنہ ای کی رہبری کے کارنامہ کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ امام کے بعد والے دور میں امام کے دور کی نسبت کوئی متفاوت کام انجام پایا، اس لئے اس دور کو امام کے بعد والے دور کے نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۲۹ رنومبر ۱۹۹۴ء کو آیت اللہ اراکیؒ کی وفات کے بعد جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم کی تائید پر آیت اللہ خامنہ ای کا ایک مرجع تقلید کی حیثیت سے تعارف ہوا اور اس طرح مرجعیت کے بلند منصب پر بھی فائز ہوئے۔

ہم نے اس سے پہلے کہا ہے کہ انقلاب کی کامیابی اور اس کے دوام کی بنیاد کے تین رکن: رہبری، عوام اور مکتب ہیں۔ امام کی رحلت، رہبری کے رکن اور اس کے دوسرے دو ارکان سے رابطہ میں کوئی قطعی خلاء پیدا نہیں کر سکی اور آیت اللہ خامنہ ای کے منتخب ہونے پر ولایت فقیہ کا منصب بدستور مستحکم و استوار باقی رہا جو انقلاب اور اسلامی نظام کے خیمہ کا اصلی ستون ہے۔

د) تعمیر و ترقی کے دور کا آغاز۔

ایران کی طرف سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر (۵۹۸) کو قبول کرنے اور مسلط کی گئی جنگ کے خاتمہ پر اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی میدانوں میں ضروری تعمیر و ترقی کے لئے

ملک کے وسیع پیمانہ پر منصوبہ بندی کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ بیشک آٹھ سالہ جنگ نے نہ صرف ملک میں پیداوار کو معمول کی راہ سے ہٹا کر جنگ کے حوالے کر دیا تھا اور ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا تھا، بلکہ بمباری اور شہروں اور اقتصادی منابع کی ویرانی کے نتیجہ میں جنگ کی خرابیوں نے جنگ کے بعد حکومت کے کندھوں پر سنگین بوجھ ڈالا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک ملک کو جنگ کے دوران ہوئے نقصانات کو شاذ و نادر ہی کسی دوسرے ملک کی مدد کے بغیر پورا کیا جا سکتا ہے۔ یورپ میں دوسری عالمی جنگ کی خرابیوں کی اصلاح امریکہ کی مالی مدد اور ہنگامی منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائی۔ جبکہ اسلامی انقلاب کے حالات اور ایران کے بارے میں مغرب، بالخصوص امریکہ کا سخت موقف، اسلامی جمہوریہ کے لئے اس قسم کا موقع فراہم نہیں کرتا تھا۔ ایسے حالات میں ایک ملک کی ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داریاں سنبھالنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

۱۹۸۹ء میں آیت اللہ خامنہ ای کا صدر جمہوریہ کا دور ختم ہونے اور آئین میں ترمیم کے ذریعہ وزیر اعظم کا منصب حذف کر کے صدر کے اختیارات میں اضافہ کئے جانے کے پیش نظر ضروری تھا کہ اس عہدہ کے لئے ایک قوی ایڈمنسٹریٹر منتخب کیا جائے۔ ایران کے لوگوں نے صدر جمہوریہ کے چناؤ میں جناب ہاشمی رفسنجانی کو اس منصب کے لئے منتخب کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلامی انقلاب کے حامیوں حتی انقلاب کے مخالفین کی نظروں میں بھی انقلاب کے بعد جناب ہاشمی رفسنجانی کا حساس اور کلیدی رول نا قابل انکار ہے۔ یہاں تک کہ انقلاب کی کامیابی سے پہلے بلکہ ۵ جون ۱۹۶۳ء (۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ھ ش) سے پہلے بھی ہاشمی رفسنجانی نے امام کے گنے چنے شاگردوں اور حامیوں میں سے ایک شاگرد کی حیثیت سے نظام سلطنت کے خلاف مبارزاے میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور حقیقت میں امام کے حواریوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس نے انقلابی کونسل، وزارت داخلہ، پارلیمنٹ کے سپیکر، نماز جمعہ کے خطیب، جنگ کو کمانڈ کرنے اور بالاخر صدر جمہوریہ کی حیثیت سے اپنی توانائی کو ثابت کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب ہاشمی رفسنجانی

اس کے علاوہ کہ وہ کس کی منصب پر فائز ہوں اور کس طرح فیصلہ لیں، ہمیشہ کلیدی اور حساس فیصلے لینے کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کے سپیکر ہوتے ہوئے خارجی بھی سیاست کے حساس مسائل کی راہنمائی و ہدایت کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ جنگ کی کمانڈ بھی کرتے تھے۔

کسی ملک کی تاریخ اور تقدیر بنانے میں ناقابل انکار رول ادا کرنے والی شخصیتیں معدود چند ہوتی ہیں اور بیشک جناب ہاشمی رفسنجانی ان میں سے ایک ہیں۔ وہ بحران سے مقابلہ کرنے، حساس اور بڑے فیصلے لینے اور اہم ذمہ داریوں کو قبول کرنے والے سورما ہیں کہ ان کے نتائج سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوتے اور انقلاب کے تحفظ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے کارآمد افراد سے کام لینے اور ان کے اپنی پارٹی کے نظریات کے ملک کی ایڈمنسٹریشن میں ہر قسم کی خلل اندازی کو روکنے کی توانائی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی ذمہ داری کے دوران پارٹی اختلافات اور کشمکشیں کم ترین حد تک پہنچ گئی تھیں۔ یہ وہی لڑائیاں تھیں جو جنگ کے مسائل سے غفلت برتنے کا سبب بن گئی تھیں اور محاذ جنگ پر ایسے اثرات ڈال چکی تھیں کہ بیشک قرارداد نمبر ۵۹۸ کو قبول کرنے میں ان کے نتائج رونما ہوئے۔[1]

ہاشمی رفسنجانی کی صدارت کے دوران، اقتصادی ترقی بالخصوص پیداوار میں اضافہ کا مسئلہ، موجودہ بحران کے تنہا راہ حل کے عنوان سے مدنظر رکھا گیا۔ اس کے علاوہ اسلامی جمہوریہ کی تاریخ میں پہلی بار پنجسالہ اول اور پنجسالہ دوم کے عنوان سے ایک منظّم منصوبہ مرتب کیا گیا اور اسے پارلیمنٹ کی تائید ملنے کے بعد نافذ کیا گیا۔ جس ملک نے گزشتہ حکومت کے فساد اور بیرونی طاقتوں سے بری طرح وابستہ ہونے کے نتیجہ میں انقلاب برپا کیا تھا اور اس سے پہلے کہ گزشتہ حکومت کی خرابیوں کی تلافی کی فرصت پیدا کرے اس پر، ایک وسیع، طولانی اور تباہ کن جنگ ٹھونسی گئی ہو، اس ملک کے لئے اقتصادی پروگرام اور تعمیر و ترقی کے پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی کرنا ایک غیر معمولی اور مشکل کام تھا اور

۱۔ کتاب ''سیاست خارجی جمہوری اسلامی ایران'' (اصول مسائل) تالیف مصنب انتشارات دادگستر طبع دوم ۱۳۷۹ ھ ش یہ فصل چھٹی ص ۱۷۰۔

مختلف بلکہ بعض متضاد مقاصد کے پیش نظر ان کی کامیابی بعید تھی۔ بالخصوص ہر اقتصادی پروجیکٹ پر عمل درآمد مشکلات بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی انقلاب سے چوٹ کھا کر زخمی ہوئے سامراج بالخصوص امریکہ کی دشمنیوں کے مسئلہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ امریکہ نے انقلاب کو ناکام بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے اور جب تک نظام کا سامراج دشمن موقف باقی رہے گا وہ اپنی اس روش کو جاری رکھے گا۔

اس کتاب میں خلاصہ اور اختصار کی رعایت کے پیش نظر اسلامی انقلاب کی دوسری دہائی کے آغاز میں ملک کی اقتصادی حالت کی ایک فہرست حسب ذیل بیان کی جاسکتی ہے:

فقر، بڑے پیمانہ پر طبقاتی فاصلے، پادشاہی نظام کے دوران ایران میں ایجاد شدہ مایوسیاں گزشتہ نظام کی چھوڑی ہوئی ویرانیاں، اسلامی انقلاب کی وجہ سے سیاسی، سماجی اور ثقافتی ڈھانچہ میں رونما ہوئی تبدیلیوں کے ناقابل اجتناب اثرات، آٹھ سالہ تھوپی گئی جنگ اور ملک پر پڑے اس کے نقصانات، انقلاب کے ذریعہ ضربہ کھائے ہوئے داخلی اور خارجی عوامل کی ریشہ دوانیاں، پیٹرول کی قیمت میں شدید اتار چڑھاؤ، کیونکہ ملک کا اقتصاد تیل کی درآمد سے وابستہ ہے اور پیٹرول کی قیمتوں میں یہ اتار چڑھاؤ ملک کے اقتصادی پروگرام کی کامیابی یا ناکامی پر ناقابل انکار اثر ڈال سکتا ہے، ملک کے ثقافتی اور اجتماعی ڈھانچے کی بناوٹ کے پیش نظر دفتری نظام کا ناکارہ ہونا اور اس میں موجود بیوروکریسی، شاہ کی حکومت نے لوگوں کو سرکاری آمدنی سے وابستہ کر کے اس آمدنی کی مقدار کو بڑھاوا دیا تھا اور فطری طور پر اس کی کیفیت گھٹ گئی تھی اور اسلامی انقلاب اسلام کے بعد بھی پرائیویٹ کمپنیوں کے بہت سے مدیروں کے بھاگنے اور ان کے اموال اور کمپنیاں قومی سرمایہ کے طور پر ضبط ہونے کی وجہ سے سرکاری بیوروکریسی اور فیصلوں کے مرکوز ہونے میں اضافہ ہوا تھا، یہ ان مشکلات میں سے کچھ تھے جن کا نئی حکومت کو سامنا تھا۔ مذکورہ بیان شدہ مشکلات کے پیش نظر باقیماندہ مشکلات اور بحرانوں پر قابو پانے کے لئے پہلے پانچسالہ منصوبہ پروگرام کے اقتصادی اصلاحات کے طریق کار کے اصلی محور معین کرنے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل مقاصد پر توجہ کی گئی:

۱۔صنعتوں، معادن اور تمام صنعتی پیداوار کو غیر سرکاری بنانے کے سلسلہ میں پرائیویٹ اداروں کو وسعت دینا۔دوسری دہائی کے آغاز پر قومی پیداوار میں پرائیویٹ کمپنیوں کا حصہ ۲۵ فیصدی سے کم تھا ۔اس کو ایک مقصد کے طور پر ۷۵ فیصدی تک پہنچانا۔

۲۔مالیات سے مربوط اداروں اور بینکوں میں موجود بیوروکریسی اور اقتصادی سرگرمیوں کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے والے قوانین کو حذف کرنا۔

۳۔ملک کے داخلی اقتصادی حدود میں غیر ملکی سرمایہ گزاری کی ہمت افزائی کرنا اور غیر ملکی سرمایہ گزاری کو جذب کرنے کے لئے پر امن ماحول پیدا کرنا۔

۴۔ایسے طریقوں سے غیر ملکی قرضے حاصل کرنا تاکہ ان کو ادا کرنا ملک کے لئے آسان ہو اور ملک کے لئے مشکل اور وابستگی کا سبب نہ بنیں۔

۵۔آزاد تجارتی علاقے ایجاد کرنا تاکہ مذکورہ علاقوں کی تعمیر وترقی کے علاوہ ترقی یافتہ دنیا سے ٹیکنالوجی اور صنعتی میدان مین رابطہ بڑھایا جاسکے۔

۶۔ملک کے قومی پیسے کو توازن بخش کر اسے دیگر ممالک کے معتبر زرمبادلہ کے مقابلہ میں اپنی اصلی قیمت تک پہنچانا، تاکہ حکومت کے لئے مالی ذخائر کو پیداوار میں لگانے کے نئے امکانات مہیا ہوں۔

۷۔سبسڈی میں رفتہ رفتہ کمی کر کے اس کے مصارف سے پیداوار بڑھانے والے کی طرف منتقل کرنا تاکہ پیداوار بڑھانے والے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۸۔آزاد تجارت کی محدودیتوں کو ہٹا کر اسے پرائیویٹ شعبے میں تبدیل کرنا۔

۹۔قیمتوں کو تجویز اور تقاضا کے قانون کی بنیاد پر آزاد کرنا، کیونکہ جنگ کے دوران عدم کفایت کے پیش نظر قیمتوں پر لازمی طور پر سخت کنٹرول تھا۔

۱۰۔ایرانی ماہرین کی حوصلہ افزائی کرنا اور بیرونی ممالک سے ایرانی سرمایہ کو واپس لانا۔[1]

۱۔اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے ،انوشیروان احتشامی کی کتاب ''سیاست خارجی ایران در دوران سازندگی، اقتصادی، دفاع، امنیت'' ترجمہ ڈاکٹر متقی اور پوستین چی، ناشر مرکز اسناد انقلاب اسلامی ۱۳۷۸ھ ش ص ۱۷۔۶۳

تیسرے دور کی اسلامی پارلیمنٹ میں پاس ہوئے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں اقتصادی ماہرین کی طرف سے مختلف نقطہ نظروں سے کچھ تنقیدیں کی گئی ہیں، جن کو بیان کرنا اس کتاب کے دائرہ اور مصنف کی مہارت سے خارج ہے۔ اس کے باوجود اعتراف کرنا چاہئے، کہ حتی اگر قبول بھی کریں کہ اس پروگرام میں بعض نقائص موجود تھے، لیکن آج تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے اور تیسرے منصوبہ میں مورد توجہ قرار پائے گئے پہلے منصوبہ کے بہت سے اصلی محور اور صحیح معنوں میں منتخب کی گئی بڑی اقتصادی پالیسیاں بالکل اسی طرح اپنی جگہ پر موجود ہیں اور بعد والی حکومتوں نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو چیز قابل اہمیت ہے اور اس کی قدر کی جانی چاہئے، وہ یہ ہے کہ جناب ہاشمی رفسنجانی نے ایک بے مثال جرأت اور ہمت سے مالی بحران کے حالات میں بڑے اقتصادی منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایسے پروجیکٹوں پر عمل درآمد کر کے ملک کو جنگ کے دوران تعطل کی حالت اور اس کے برے نتائج سے باہر نکالنے میں کامیابی حاصل کی اور فوری ترقی کے لئے ضروری ماحول پیدا کیا۔ اس لحاظ سے ان کی حکومت کامیاب تھی اگر چہ حد سے زیادہ اقتصادی ترقی پر توجہ دینے کی وجہ سے ان پر کچھ تنقیدیں بھی کی جاتی ہیں۔

دوسرا مرحلہ:

اسلامی انقلاب اور عالم اسلام میں تبدیلیاں

انقلاب کی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں میں ملک کے اندر پیدا ہونے والے حالات کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام میں بھی اہم اور مؤثر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں نے نہ صرف اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کے فیصلوں پر اثر ڈالا بلکہ علاقہ کے سوق الجیشی حالات میں اس قدر تبدیلیاں ایجاد کیں کہ انقلاب کی پہلی دہائی میں انقلاب کو پیش آنے والے موضوعات اور مسائل میں بنیادی فرق پیدا ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں عراق کا کویت پر حملہ اور کثیر الاقوام، بالخصوص امریکی فوج کی اس بحران میں مداخلت، سوویت یونین کا زوال، قفقاز اور سنٹرل ایشیا میں نئی مسلمان مملکتوں کا وجود میں آنا، افغانستان سے روسی فوج کا نکلنا اور اس ملک میں طالبان کے نام سے ایک نئی چیز کا وجود میں آنا اور اسی طرح فلسطینیوں کو اسرائیل کے ساتھ ملانے کی امریکی سازش، جس کے نتیجہ میں اسلو معاہدہ پر دستخط کئے گئے اور فلسطین کی مقبوضہ سرزمین پر انتفاضہ کا آغاز من جملہ ان تبدیلیوں میں سے تھا۔

ذیل میں ہم ان تبدیلیوں پر ایک مختصر بحث کریں گے اور ان تبدیلیوں پر اسلامی انقلاب کے اثرات اور ان حوادث سے مربوط اسلامی انقلاب کے موقف کے بارے میں کچھ بیان کریں گے۔

ان حوادث پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں اور ان کے بارے میں اسلامی جمہوریہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اصولی پالیسی اپنانے کے نتیجہ میں اسلامی انقلاب نے مسلمانوں اور علاقہ کی مسلمان حکومتوں میں ایک وسیع شہرت پائی اور اسلامی جمہوریہ علاقہ میں سب سے بڑی طاقت کے عنوان سے پہچانی اور قبول کی گئی۔ اس بنیاد پر اسلامی جمہوریہ نے علاقہ کے تمام ممالک اور بین الاقوامی نظام کے ساتھ اپنے روابط منظم کئے۔

الف) عراق کا کویت پر حملہ اور خلیج فارس کی جنگ کا آغاز۔

اگست ۱۹۹۰ء میں عراق کا کویت پر بھرپور حملہ اور اس شیخ نشین اور پیٹرول سے مالا مال ملک پر قبضہ کرنے کے مسئلہ نے نہ صرف بین الاقوامی مسائل کے ناظرین اور تجزیہ نگاروں کو، بالخصوص صدام کی حکومت کے ایران کے ساتھ ایک طولانی جنگ میں شکست کھانے کے بعد، حیرت میں ڈال دیا، بلکہ دنیا کے ممالک اور بین الاقوامی نظام کو بھی اس بحران کے سلسلہ میں ردعمل دکھانے اور براہ راست مداخلت کرنے پر مجبور کیا۔

ایران کے ساتھ جنگ ہارنے کے بعد صدام نے کیوں یہ دیوانگی کی اور ایسا شرمناک اقدام کیا؟ ایک ایسا سوال ہے جس پر ابھی بھی سیاسی مطالعہ کرنے والے دانشور تجزیہ کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ امریکہ کی طرف سے صدام کی حکومت کو ایران پر حملہ کے وقت ہری جھنڈی دکھانے کے مانند کویت پر حملہ کے وقت بھی امریکہ کا اشارہ اس کو یہ قدم اٹھانے میں ہمت افزائی کا سبب بنا تا کہ امریکہ اپنی حامی اور زیر تسلط حکومتوں کی مدد کے بہانے علاقہ، خاص کر خلیج فارس میں مزید مداخلت کرنے کا جواز پیدا کر سکے اور اس کام کو قانونی حیثیت بخشے، جبکہ اس سے قومی استقلال والا دوسرا نظریہ بھی موجود ہے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ صدام، ایران کے ساتھ آٹھ سالہ جنگ میں اپنے جاہ طلبانہ عزائم کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے عراقی عوام کے لئے فقر، بدبختی اور بیچارگی اور لاکھوں انسانوں کی قربانی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد ملک پر کروڑوں ڈالر کے قرضہ کا بوجھ بھی بڑھا دیا۔ اس لئے کویت پر حملہ اور اس تازہ جنگ سے نہ صرف اپنی اقتصادی مشکلات کو حل کرنا

۱۔ مزید مطالعہ کے لئے پیر سالینجر، اریک لوران کی لکھی گئی کتاب ''محرمانہ اسناد کی نگاہ میں جنگ خلیج فارس'' ترجمہ ہوشنگ لاہوتی ۱۳۷۰ھ ش۔ ملاحظہ ہو۔

چاہتا تھا، بلکہ اپنی دیرینہ آرزوؤں کو بھی عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا جبکہ وہ اپنی آرزوؤں میں سے کسی ایک کو حاصل نہ کر سکا بلکہ اس کے برعکس سلامتی کونسل کی طرف سے عائد کی گئی پابندیوں سے ملک پر ایسا دباؤ پڑا کہ دس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی، جس ملک کا زرمبادلہ ایران سے جنگ سے قبل تیس ارب ڈالر سے زیادہ تھا آج ایک سو ارب ڈالر کا مقروض ہے۔

چونکہ صدام نے اسلامی انقلاب کی یلغار اور پھیلاؤ کے سامنے ایک مضبوط رکاوٹ کے عنوان سے رول ادا کیا تھا اور قدامت پسند عرب ممالک اور بااثر مغربی طاقتوں کے منافع کو علاقہ میں تحفظ بخشا تھا، اس لئے اپنے لئے اس حق کا قائل تھا کہ عرب ممالک نہ صرف اس کے قرضوں کو معاف کریں، بلکہ چاہتا تھا کہ اسے نئے قرضے دے کر ملک کی تعمیر جدید میں اس کی مدد کریں۔ دوسری طرف سے ایسا استنباط کرتا تھا کہ امریکی حکومت اس کے اسلامی انقلاب سے مقابلہ کے پیش نظر اس کی مہم جوئی اور خودخواہی کے بارے میں مخالفت نہیں کرے گی۔ امریکی عہدہ داروں کی مبہم اور مشکوک پالیسیاں بھی اس کے اس تصور کو تقویت بخشتی تھیں۔

اس نے مذکورہ استدلال کی بنا پر کویت کے خلاف اچانک حملہ کیا اور ۴۸ گھنٹے سے کم وقت میں کویت کی سرزمین پر عراقی فوج کے ذریعہ قبضہ کر لیا۔ کویت کا امیر ہیلی کواپٹر کے ذریعہ سعودی عرب بھاگ گیا۔

امریکی حکومت، اس فرصت اور دو قطبی نظام کے زوال سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کثیر الاقوام فوج کو تشکیل دے کر میدان میں اتر آئی اور ایک غیر مساوی جنگ میں عراق کے مقابلہ میں کھڑی ہوگئی۔ اگر چہ صدام نے اپنے سیاسی موقف کو بدل کر عراق کے پرچم پر ''اللہ اکبر'' کا لفظ نصب کیا تھا اور اسرائیل کے خلاف سخت موقف اختیار کر کے اسلامی اور عرب ممالک کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن نہ صرف وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوا بلکہ فوجی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے بھی انتہائی کمزور ہو گیا، یہاں تک کہ اس ملک کی قومی حاکمیت کو زبردست نقصان پہنچا اور خود صدام کی تقدیر بھی امریکہ کے رحم و کرم سے وابستہ ہوگئی۔

اس جنگ نے اسلامی جمہوریہ ایران کے لئے نئے حالات پیدا کر دیئے۔اس بحران کے بارے میں نظام کے ذمہ داروں کی حکمت عملی اور تدبیر اس امر کا سبب بنی کہ کارٹر حکومت کی قومی سلامتی کے مشیر برجنسکی کو یہ کہنا پڑا کہ: ''عراق کی کویت اور کثیر الاقوام حکومتوں کے درمیان جنگ میں صرف ایک طرف، یعنی اسلامی جمہوریہ ایران کو فتح حاصل ہوئی۔''

اس سلسلہ میں اسلامی جمہوریہ کے ذمہ داروں کے لئے تین راہیں تھیں:

اول یہ کہ عراق کے ایک دوسری جنگ میں الجھنے کی وجہ سے اس کے لئے پیدا ہوئے حساس حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عراق کے ساتھ اپنی سرحد پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس کی سرزمین میں داخل ہو کر نہ صرف صدام کی حکومت کے ظالمانہ تجاوزات کا انتقام لے لے بلکہ قوی پوزیشن میں قرار پا کر اپنے مطالبات کو عراقی حکومت پر ٹھونس دے۔صدام کی حکومت کو پہلے سے اس کا احتمال اور خوف تھا اور اسی لئے اس نے ایران کی حکومت کے ساتھ خط و کتابت شروع کر کے سرانجام ایران کے مطالبات من جملہ ۱۹۷۵ء کی الجزائر قرارداد کو پھر سے قبول کرنا، فوجوں کو قانونی سرحدوں تک واپس بلانا اور طرفین کے جنگی قیدیوں کے تبادلہ کو قبول کر کے اس پر عمل کرنا، مان لیا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ اسلامی جمہوریہ، عراقی حکومت کے ساتھ اپنی آٹھ سالہ دشمنی کو فراموش کرنے اور اب جبکہ صدام کی حکومت ''بڑے شیطان'' یعنی امریکہ کے مقابلہ میں قرار پائی تھی، اس کی مدد کے لئے آگے بڑھ کر دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد و اتفاق برقرار کر کے امریکہ کے علاقہ میں تجاوز کا مقابلہ کرے۔بعض داخلی سیاسی شخصیتیں بھی اس نظریہ کی حامی تھیں۔بعض لوگ صدام کو ''خالد بن ولید'' کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔اس پالیسی پر عمل کرنے سے بیشک ملک اور اسلامی جمہوریہ کے نظام کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔امریکہ اس بہانہ سے استفادہ کر کے مناسب بین الاقوامی حالات کے پیش نظر عراق و ایران دونوں سے نمٹ لیتا۔

تیسرا راستہ، جو یقیناً اسلامی جمہوریہ کے لئے کم ترین نقصان پہنچا سکتا تھا، یہ تھا کہ اس جنگ میں عملاً داخل ہونے سے پرہیز کر کے پہلے دو طریقوں کے خطرات سے اپنے آپ کو بچائے۔یہ وہ

پالیسی تھی جسے بالاخر نظام کے ذمہ داروں نے اختیار کیا، اس طرح کہ عراق کے کویت پر حملہ کی مذمت کرنے کے ضمن میں بڑی طاقتوں کی علاقہ میں مداخلت کو بھی مسترد کیا۔ انقلاب اور اسلامی نظام کے لئے اس پالیسی کے مندرجہ ذیل نتائج نکلے:

۱۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کی طرف سے بالاخر عراقی حکومت کا ایرانی سرزمین پر حملہ آور کے عنوان سے تعارف کرا گیا اور اس طرح اسلامی جمہوریہ کا دیرینہ مطالبہ پورا ہوا۔

۲۔ ۱۹۷۵ء کی الجزائر قرارداد، جسے صدام نے جنگ کے آغاز میں مسترد کر کے پھاڑ ڈالا تھا۔ پھر سے قبول کی گئی اور ایران کی تمام مقبوضہ سرزمین دوبارہ ایران کو واپس مل گئی۔

۳۔ جنگی قیدیوں کے تبادلہ کے نتیجہ میں ایران کے آزادگان سربلندی کے ساتھ اپنے وطن لوٹے اور ان کے خاندان والوں کی فکر و پریشانیاں دور ہوئیں۔

۴۔ خلیج فارس کے علاقہ کی عرب حکومتوں کو معلوم ہوا کہ اسلامی جمہوریہ کی حکومت طاقت رکھنے کے باوجود بھی، ان کی طرف سے جنگ کے دوران صدام کو مدد کرنے کی وجہ سے انتقام لینے پر نہیں اتری بلکہ اپنے اصولی موقف پر ڈٹ کر رہی، اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ خلیج فارس کی جنگ کے خاتمہ کے بعد صدام کی حکومت سے خوف کی وجہ سے ان ملکوں کے اسلامی جمہوریہ سے تعلقات بہتر ہوئے۔ اور چپقلش سے اجتناب کی ایرانی پالیسی کامیاب ہوئی اور بڑی طاقتوں کی طرف سے اُکسانے کے باوجود اسلامی جمہوریہ کے اپنے جنوبی ہمسایوں کے ساتھ تعلقات بہتر ہونے لگے۔

۵۔ امریکہ کی طرف سے اس دہائی کے دوران عراق و ایران دونوں کو کمزور کرنے کی پالیسی کے باوجود، اسلامی جمہوریہ ایران کے بارے میں اس کی یہ پالیسی ناکام رہی اور اس جنگ میں ایران کے دشمن شمار ہونے والے ملک، عراق کے کمزور ہونے اور اس پر مختلف پابندیاں عائد ہونے کے نتیجہ میں، آج اسلامی جمہوریہ کو علاقہ کی ایک بڑی طاقت کے عنوان سے قبول کیا گیا ہے۔ یہ ملک، اس مدت کے دوران نہ صرف جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئے اپنے مسائل کو حل کر سکا ہے بلکہ اپنی اقتصادی، فوجی، سیاسی اور ثقافتی حالت کو وسعت اور تقویت بخشنے میں کامیاب ہوا ہے اور حقیقت میں بقول

برجنسکی: خلیج فارس کی جنگ میں صرف اسلامی جمہوریہ ایران کامیاب تھا۔

ب: سوویت یونین کا زوال اور نئی حکومتوں کی تشکیل۔

علاقہ کی اہم جغرافیائی تبدیلیوں میں سے ایک سوویت یونین کا زوال اور نئی حکومتوں بالخصوص سنٹرل ایشیا اور قفقاز کے علاقہ میں مسلمان حکومتوں کا وجود میں آنا تھا۔اس واقعہ سے پہلے ایران کی، دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک یعنی سوویت یونین کے ساتھ ۲۵۰۰ کلومیٹر لمبی مشترک سرحد تھی اور یہ مسئلہ ایران کے لئے ہمیشہ ایک خطرہ شمار ہوتا تھا اور مغربی ممالک کی مشرقی بلاک کو محاصرہ کرنے کی پالیسی کے سبب ایران کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔اب اسلامی جمہوریہ ایران کی ہمسائیگی میں بحرخزر کے دوطرف چند چھوٹے اور ایسے مسلمان ممالک ہیں جو اقتصادی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی مشکلات سے دوچار ہیں اور اس کے علاوہ ان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ آزاد سمندر تک رسائی نہ ہونے کے سبب تجارتی روابط قائم کرنے کے لئے اپنے ہمسایہ ممالک خاص کر اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ خصوصی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہیں۔

علاقہ کی سیاسی جغرافیہ میں اس بنیادی تبدیلی نے انقلاب اور اسلامی جمہوریہ ایران کے لئے مناسب حالات پیدا کرنے کے باوجود اس ملک کے شمال میں کچھ نئے اور حساس مسائل اور مشکلات پیدا کئے۔قرہ باغ کے علاقہ میں آذربایجان اور ارمنستان کے درمیان سرحدی اختلافات، تاجکستان میں دو طاقتور سیاسی پارٹیوں میں لڑائی اور دوسری طرف سے ان نئے ایجاد شدہ ممالک میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنے کے لئے مغربی ممالک بالخصوص امریکہ، ترکیہ اور اسرائیل کی ہماہنگ کوششیں، ایسے مسائل تھے جنھوں نے اس علاقہ میں نئے مشکلات پیدا کئے، اس لئے ان کی طرف توجہ دینا ضروری تھا۔

ان حکومتوں کی بنیادی مشکل یہ تھی کہ اولاً اقتصادی لحاظ سے ماسکو کے ساتھ مطلق وابستگی کی وجہ سے اپنے اقتصاد کو آسانی کے ساتھ روس سے جدا نہیں کرسکتی تھیں اور ثانیاً متمرکز اشتراکی نظام کو ایک آزاد اقتصادی نظام میں تبدیل نہیں کرسکتی تھیں۔یہ دو حالتیں ایسی تھیں، جن کی وجہ سے ان تمام

حکومتوں کی مدیریت سوویت یونین کے دور کے باقی بچے ایڈمنسٹریٹروں کے ہاتھ میں تھی، جس نظام کے ساتھ ان کی عادت تھی اور ان کے لئے نئے نظریات پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر چہ تاریخی پس منظر کے باوجود، کمیونسٹوں نے ۷۰ سال سے زیادہ عرصہ کے دوران ان ممالک میں تمام اسلامی آثار کو مٹانے اور لوگوں کے دینی عقائد سے مقابلہ کرنے کے لئے انتھک کوششیں کیں، لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو رسمی طور پر مسلمان جانتے تھے بغیر اس کے کہ اسلامی اصول کے بارے میں کوئی عمیق اطلاع رکھتے ہوں۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے ان حکومتوں کی آزادی کے اعلان کے بعد ایک ایک کر کے باقاعدہ طور پر انھیں قبول کیا اور ان ملکوں کی سرزمینوں پر کسی قسم کا دعوی کئے بغیر ان کی تعمیر نو میں مدد اور تعاون کرنے کا اعلان کیا۔

اسلامی جمہوریہ ایران نے اس دہائی کے دوران اپنی شمالی سرحد میں نئے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ جو پالیسی اپنائی وہ اس علاقہ کی ثقافتی اور عقیدتی میدانوں میں وسعت اور تقویت بخشنے، فوری اقتصادی مدد اور آزاد سمندر تک ان کی رسائی کے عبوری راستوں کو کھولنے پر مبنی تھی۔ مشہد، سرخس، تجن ریلوے لائن کا رابطہ اس امر کا سبب بنا کہ سنٹرل ایشیا کے ممالک ریل کے ذریعہ بحر عمان اور خلیج فارس تک ٹرانزٹ کا ارتباطی راستہ پیدا کر سکیں اور اس کے علاوہ ملک کے اندر تیل کی پائپ لائنیں بچھا کر ان ممالک کے تیل کو آزاد دنیا تک منتقل اور فروخت کرنے کے مناسب امکانات فراہم ہوئے۔

امریکہ اور ترکیہ کی حکومتوں نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش کی کہ بھاری لاگت سے باکو جیحان تیل کی لائن بچھانے کے پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنا کر ایران سے مقابلہ کریں اور ایران کو اس اسٹریٹیجیک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ لیکن ان حکومتوں نے تا بحال اس پروجیکٹ کی منظوری نہیں دی اور اس پر عمل درآمد بعید نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی جمہوریہ ایران نے ان ممالک کے باہمی اختلافات من جملہ قرہ باغ کے بحران اور تاجکستان کے داخلی تنازعوں کو حل کرنے کے لئے ثالثی کا رول ادا کیا اور کم از کم تاجکستان

میں مختلف گروہوں کے درمیان صلح وصفائی ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا۔

دوسری طرف سے ایران نے سابقہ سوویت یونین کے اہم وارث کی حیثیت سے روس کے ساتھ قریبی تعلقات برقرار کر کے امریکیوں کے اس علاقہ میں اثر نفوذ پیدا کرنے کے خلاف مقابلہ کیا اور انھیں اس علاقہ میں پیر جمانے کی اجازت نہیں دی۔ اگر چہ بحر خزر کی حاکمیت کے بارے میں اس سمندر کے ساحلی ممالک کے درمیان ابھی تک کسی قسم کا توافق نہیں ہوا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تلاش جاری ہے کہ اس سمندر سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں اس کے ساحلی ممالک کے درمیان ہماہنگی پیدا کر کے جتنا ممکن ہو سکے جلدی مشکل کو حل کیا جائے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے سنٹرل ایشیا اور علاقہ قفقاز کے ساتھ آئندہ روابط کے بارے میں بظاہر یہ حقیقت ہے کہ زمانہ کے گزرنے اور ثقافتی، جغرافیائی اور اقتصادی حالات کے پیش نظر یہ حکومتیں ایران کے نزدیک تر آئیں گی اور اسلامی جمہوریہ ایران کا رول ایک مرکزی کردار میں تبدیل ہوگا۔ بالخصوص علاقہ میں تین بڑی طاقتوں، امریکہ، روس اور ایران کے درمیان مقابلہ میں امریکہ کی خودخواہی اور اثر ونفوذ کی نسبت روس اور ایران کے درمیان مفاہمت کے امکانات کئی گنا زیادہ ہیں۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس علاقہ کی حکومتوں کے مسائل اور پالیسیاں یکسان نہیں ہیں بلکہ ہر ایک ملک کے اپنے مخصوص مسائل اور مشکلات ہیں۔

اگر چہ ان حکومتوں کا علاقہ کی اقتصادی تعاون کی آرگنائزیشن ''اکو'' کے ساتھ الحاق ان حکومتوں کے درمیان تعاون کے آسان اور وسیع ہونے کا سبب بنے گا، پھر بھی ان حکومتوں کی اپنی جگہ پر مشکلات باقی رہیں گی۔ اگر آذربائیجان اور ارمنستان کا آپسی اختلاف حل نہ ہوا تو بیشک مغربی ممالک کے لئے نفوذ کرنے کا موقع فراہم ہوگا۔ خاص کر آذربائیجان نے کئی بار نیٹو کو اپنا فوجی اڈہ قائم کرنے کی دعوت دی ہے، لیکن مغرب کے ساتھ ارمنستان کے روابط اور ثقافتی تعلقات کے پیش نظر آذربائیجان میں اس قسم کا اڈہ قائم ہونا بعید دکھائی دیتا ہے۔

ج) افغانستان میں تبدیلیاں اور ایران کے مشرق میں طالبان کا ظہور۔

۱۹۸۰ء میں امریکی سیاسی مفکر اور امریکہ کی خارجہ سیاسی کمیٹی کے رکن ہنری کسنجر، جو پہلے سوویت یونین کے اثر ونفوذ کو سب سے بڑا خطرہ جانتا تھا، نے، اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد مشرق وسطیٰ کے حوادث اور واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے، اپنے موقف میں تبدیلی لا کر اعلان کیا: اس علاقہ اور حقیقت میں مغرب اور امریکہ کے منافع کے لئے سب سے بڑا خطرہ شیعہ انتہا پسندی، اسلامی اصولی میلان اور ایران کا اسلامی انقلاب ہے۔ اور اس نے اعتراف کیا کہ ایرانی انقلاب کے براہ راست خطرہ نے سوویت یونین کے طولانی مدت خطرہ کو تحت الشعاع میں قرار دے دیا ہے[۱]

اس نئی موجود مظہر سے مقابلہ کرنے کے لئے، کیسنجر نے تجویز پیش کی تھی کہ اسلامی انقلاب کو تمام اسلامی معاشروں میں پھیلنے اور اثر انداز ہونے سے روکنے کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ ہم اہل سنت کے اندر منصوبہ بند اور امریکی پالیسی اور چاہت کے مطابق ایک حرکت ایجاد کر کے اسلامی انقلاب کا مقابلہ کریں۔ امریکی جاسوسی ایجنسی، سی، آئی، اے۔ اسی وقت سے اس قسم کی حرکت ایجاد کرنے میں لگ گئی۔ اس نے پہلے کوشش کی کہ ایران کے اندر اہل سنت اقلیت سے استفادہ کر کے اپنا مقصد پورا کرے اور اس سلسلہ میں ''شمس نامی'' ایک ناراضی اور نظام مخالف شخص کے ذریعہ ''شورائے مرکزی اہل سنت'' کے نام پر ایک تنظیم تشکیل دی، لیکن نظام کے ذمہ داروں کی ہوشیاری کے پیش نظر یہ تحریک کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن ملک سے باہر بالخصوص افغانستان میں یہ منصوبہ نسبتاً کامیاب رہا۔ اس طرح کہ ایک منظّم پروگرام کے تحت اور کافی پیسہ خرچ کر کے پاکستان اور سعودی عربیہ کے دینی مدارس میں نوجوانوں کو ٹرینگ دے کر طالبان نام کی ایک تنظیم وجود میں لائی گئی۔

افغانستان، ایران کے مشرق میں واقع ہے اور اس کی ایران کے ساتھ ایک طولانی سرحد ہے۔ اس کے باشندے زبان وثقافت کے لحاظ سے ایرانی عوام سے مشترک ہیں۔ اسلامی انقلاب

۱۔ مجلہ ''الدستور''، طبع انگلستان، مورخ ۵ جنوری ۱۹۸۲ء

سے پہلے ہی افغانستان، ملک کے خارجی سیاست کے ذمہ داروں کی فکروں کو مسلسل مشغول کرر کھا تھا ۔اس ملک میں متعدد قبائل اور قوموں کا وجود،شدید ثقافتی اور اقتصادی پسماندگی،منشیات کی کاشت اور اس کا ایران کے راستہ سے یورپ بھیجنا اور ایران میں بیس لاکھ سے زائد افغان مہاجر من جملہ ان مسائل میں سے ہیں جو ایران کے لئے سخت مشکلات اور نظام کے ذمہ داروں کے لئے فکر و پریشانی کا سبب بنے۔

افغانستان میں پے در پے فوجی بغاوتیں اور کمیونسٹ حکومتوں کے برسر اقتدار آنے اور سر انجام ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے پہلے سال سوویت یونین کی فوجوں کا اس ملک میں داخل ہوکر قبضہ کرنا اور افغانستان کی جہادی تنظیموں کا ایران کے تازہ برپا ہوئے اسلامی انقلاب سے توقعات نے افغانستان کے مسئلہ کو رہبران انقلاب کی پالیسیوں کا مرکز بنا دیا۔

حضرت امام خمینیؒ اور ان کی پیروی میں اسلامی جمہوریہ ایران کی حکومت نے افغانستان کے بارے میں اپنی پالیسی کو دو بنیادوں پر قرار دیا:

اول یہ کہ افغانستان میں روس کے تجاوز کی مذمت کی جائے اور حملہ آور فوج کے خلاف افغانستان کی ملت کی بھرپور مدد کا اعلان کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ جہادی گروہوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے پوری کوشش کی جائے ،اگر چہ اس کے نتائج کم ہی نکلے اور دوسری طرف سے ان جہادی گروہوں کے سوویت یونین کے خلاف لڑنے کے لئے امریکہ کی طرف میلان پیدا کرنے سے روکنے کی کوشش کی جائے۔

البتہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افغانستان کے مسائل کے بارے میں سوویت یونین کے علاوہ بین الاقوامی اور علاقائی ممالک، جیسے امریکہ،سعودی عرب اور پاکستان بھی سرگرم عمل تھے اور سرگرم رول ادا کرتے تھے۔اسلامی انقلاب کی پہلی دہائی کے دوران مذکورہ پالیسیوں کے مطابق افغانستان کے مسئلہ کے بارے میں درج ذیل اقدامات کئے گئے:

۱۔افغانستان کے مہاجروں کو قبول کر کے ان کے لئے خصوصی کیمپ اور روزگار فراہم کرنا۔

۲۔حملہ آور اور متجاوز فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے میں جہادی گروہوں کی بھر پور مالی،فوجی اور فکری مدد کرنا۔

۳۔ جہادی گروہوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔

۴۔افغانستان سے ایران کے راستے دوسرے ملکوں کو لئے جانے والی منشیات کا زبردست مقابلہ کرنا۔

یہ پالیسی افغانستان سے سوویت یونین کی فوجوں کے ۱۹۸۹ء میں نکل جانے تک جاری تھی۔ سوویت یونین کا زوال اور افغانستان سے روسی فوجوں کا نکلنا ملت افغانستان کے لئے ایک عظیم کامیابی ہوسکتی تھی اور اسے بیرونی طاقتوں کے تسلط سے آزاد کرسکتی تھی،لیکن افسوس کہ قبیلوں،قومی اور مذہبی اختلافات نئے اندرونی بحران پیدا ہونے کا سبب بنے،جنھوں نے نہ صرف اس ملت کے لئے امن وسلامتی پیدا نہ کی بلکہ مغربی طاقتوں کے لئے مداخلت کا موقع بھی فراہم کیا اور ان کے ہمراہ ''طالبان'' نام کی ایک نئی موجود بھی وجود میں آ گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ''طالبان'' یا دینی طلبہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے پاکستان اور سعودی عربیہ میں دینی اور فوجی ٹریننگ حاصل کی ہے اور اکثر پشتو قبیلہ سے منتخب کئے گئے ہیں جو افغانستان کے بڑے قبائل میں سے ہے۔اس قبیلہ کا پاکستان میں بھی قابل توجہ اثر ورسوخ ہے، یہاں تک کہ یہ لوگ پشتونستان کی حکومت کی تشکیل اور پاکستان کے ایک حصہ کو آزاد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس گروہ نے افغانستان کی کمیونسٹ حکومت کے باقی بچے جنرلوں کی حمایت اور سعودی عربیہ اور امریکہ کی مالی مدد اور پاکستان کی اسٹرٹیجک پشت پناہی سے افغانستان کے اکثر علاقوں پر تسلط جمانے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۹۷ء میں مزار شریف میں ایرانی سفارت کاروں کو بے دردی سے قتل عام کرنے کے نتیجہ میں طالبان نے ایران سے براہ راست مقابلہ کا خطرہ مول لیا۔ یہ حادثہ سرانجام اسلامی جمہوریہ ایران کا پاکستان سے لڑنے کا سبب بن سکتا تھا،جس کے بہانہ امریکہ کی مداخلت کا احتمال تھا،لیکن نظام کے عہدداروں کی عاقلانہ تدبیر سے یہ خطرہ ٹل گیا۔افغانستان کے اکثر علاقوں پر

اپنا تسلط جمانے کے باوجود طالبان مندرجہ ذیل دو وجوہات کی بنا پر بین الاقوامی معاشرہ میں اپنی پوزیشن کو ایک حکومت کے عنوان سے قبول نہ کرا سکے:

ا۔ اسلام کے بارے میں طالبان کا تنگ نظری پر مشتمل عقیدہ آج کل کی دنیا کے مسلمانوں کے لئے نامانوس اور ناقابل قبول ہے۔ چونکہ اس گروہ کے قائدین کے طریقہ کار اور پالیسی میں تبدیلی آنے کا احتمال کم ہے، اس لئے بعید ہے کی اسے مستقبل قریب میں بھی باضابطہ طور پر قبول کیا جائے۔

۲۔ پاکستان کے علاوہ افغانستان کے تمام ہمسایہ ممالک من جملہ ایران، ترکمنستان، ازبکستان، تاجکستان اور چین نے بھی اس حکومت کی بھرپور مخالفت کی اور طالبان کے مخالفوں کی کھلم کھلا حمایت کا اعلان کیا، اس کے علاوہ خود پاکستان بھی افغانستان میں پختونوں کی حکومت تشکیل پا کر مستحکم ہونے کے بارے میں سخت فکر مند تھا۔[۱]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانستان کے بارے میں اسلامی انقلاب نے کچھ کامیابیاں حاصل کیں اور کچھ ناکامیوں سے دوچار ہوا۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی یہ تھی کہ افغانستان میں امریکی حکومت کے اثر ونفوذ کو وسعت ملنے اور وہاں پر ایران کی مشرقی سرحد کو ناامن کرنے والی کسی حکومت کی تشکیل پانے میں رکاوٹ پیدا کی۔ اس کے باوجود اسلامی انقلاب جہادی گروہوں میں اتفاق و یکجہتی ایجاد کر کے افغانستان کے محروم عوام کی مرضی کے مطابق اسلامی نظام کی تشکیل میں ناکام رہا۔

آخر پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان کا مستقبل کیا ہوگا اور اس ملک کے سلسلہ میں اسلامی انقلاب کا کیا موقف ہوگا؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ افغانستان کے مستقبل کا زیادہ تر دارومدار دنیا میں تشکیل پانے والے مستقبل کی نئی بلاک بندی اور کئی قطبی نظام پر ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران، روس، چین اور ہندوستان کے درمیان روابط کا پھیلاؤ بالقوہ طور پر امریکہ اور مغربی بلاک کے مقابلہ میں ایک نئے بلاک کو جنم دے سکتا ہے، اس کے نتیجہ میں افغانستان کا مسئلہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے یوری گانگوفسکی کا مقالہ ''طالبان: جدید قدرت'' ملاحظہ ہو جو مجلّہ ''مطالعات ایشیای مرکزی و قفقاز'' جلد ۶، دورہ سوم شمارہ ۱۷، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۳۔۱۴۸

د) اسلامی انقلاب اور فلسطین کی تحریک۔

ملت فلسطین جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ کے دوران صہیونزم کے ساتھ برسر پیکار رہ کر اس حکومت کے ظلم و جبر کو برداشت کر چکی ہے، ہر زمانہ میں اپنے عرب بھائیوں میں سے بعض افراد، عرب دنیا کے ایک رہبر اور فلسطین کی گوریلا تنظیموں سے اُمید باندھی ہوئی تھی۔ مدتوں تک جمال عبدالناصر (مصر کے سابق صدر جمہوریہ) کے ''پان عربی ازم'' سے اُمید لگائے ہوئے تھی، لیکن جمال عبدالناصر کے جانشین اور نائب نے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے ابتدائی دنوں میں، اپنی پالیسی بدل دی اور بیت المقدس کا سفر کیا، اور اسرائیل کے سربراہوں سے ملاقات کر کے فلسطین کی تحریک پر کاری ضرب لگا دی اور سرانجام ۱۹۷۹ء میں کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر اپنے آپ کو فلسطین کے حامیوں کے لسٹ سے خارج کیا اور اسرائیل کے ساتھ دوستی اور محبت کا ہاتھ ملایا۔ اس جرم کے رد عمل کے طور پر امام خمینیؒ کے حکم سے مصر کے ساتھ ایران نے تعلقات توڑ دیئے۔ فلسطینیوں نے اگرچہ مصر کو اپنی تحریک کے حامیوں کے پیش قدم گروہ کے عنوان سے کھو دیا تھا، لیکن اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسرائیل کی حامی شاہ کی حکومت کے زوال نے ان کے لئے ایک بہتر تحفہ پیش کیا۔

فلسطین کی آزادی کی تحریک کا سربراہ، یاسر عرفات پہلا شخص تھا جس نے انقلاب کی کامیابی کے بعد ایران کا سفر کیا اور عوام اور حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ انقلاب کے بعد اکثر اجتماعات میں ''آج ایران کل فلسطین'' کا نعرہ سننے میں آتا تھا۔ یاسر عرفات خیال کرتا تھا کہ وہ اسلامی انقلاب اور ایرانی عوام کو اپنے مقاصد کے لئے پشت پناہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کر سکتا ہے، لیکن وہ اس حقیقت سے غافل تھا کہ اسلامی انقلاب اور اس کا رہبر امام خمینیؒ فلسطین کے مسئلہ کے بارے میں اپنا خاص نقطہ نظر اور پروگرام رکھتے ہیں جو لازمی طور پر عرفات کے پروگراموں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود کہ اسلامی جمہوریہ ایران نے اسرائیل کے سفارت خانہ کو عرفات کے نمائندہ کے اختیار میں دیا تا کہ وہیں پر فلسطین کا سفارت خانہ کھولا جائے، جلدی ہی عرفات اور اس کے ساتھیوں کے اسلامی انقلاب کے قائدین سے اختلافات آشکار ہوئے

اور عرفات اسلامی انقلاب کے دشمنوں، جیسے مجاہدین خلق اور حکومت عراق سے جاملا اور اس کی سازش کاری کا طریقہ، خود ایک گریلا تنظیم کا لیڈر رہوتے ہوئے، رفتہ رفتہ آشکار ہوا۔ جو یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اسرائیلیوں کو دریا میں ڈالنا چاہیے، وہ اپنے موقف سے تدریجاً پیچھے ہٹ گیا اور ملت فلسطین کے جانی دشمنوں کے ساتھ ہاتھ ملالیا اور امریکہ کی حمایت کی اُمید پر اپنے اس قول کے مطابق کہ ''اگر ممکن ہو سکے گا تو ایک گدھے کی پشت پر بھی فلسطینی حکومت کو تشکیل دے گا'' قدم قدم پر سازش کا شکار ہوتا گیا۔

عرفات کی طرف سے شرمناک سازش ''اسلو معاہدہ'' کو قبول کرنے سے اسلامی انقلاب کی دوسری دہائی کا آغاز ہوا۔ اسلامی انقلاب نے سازشی منصوبوں کی بھرپور مخالفت کی اور یہ مخالفت ایسی حالت میں تھی کہ اکثر عرب اور مسلم ممالک نے اس سازش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

انقلاب کے قائدین اور اسلامی جمہوریہ کے نظام کے نظریہ کے مطابق، فلسطین کا مسئلہ نہ صرف دنیائے عرب کا مسئلہ ہے بلکہ عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ امام خمینیؒ کی طرف سے ماہ رمضان کے آخری جمعہ کو ''یوم قدس'' کے عنوان سے معین کرنا اسی امر کی یاد دہانی تھی۔ اسلامی انقلاب کے نظریہ کے مطابق اسرائیل کی صہیونی حکومت طاقت کے علاوہ کسی اور راہ حل کو نہیں جانتی ہے، اس لئے طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہی کیا جانا چاہیے۔ ملت فسطین کو پارٹیوں اور گروہوں کی سیاست سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے، بلکہ اسے خود قیام کرکے ایران کے لوگوں کی طرح اپنا حق حاصل کرلینا چاہیے۔

لبنان میں حزب اللہ کے توسط سے کثیر الاقوام اور اسرائیلی فوج کے مقابلہ میں حاصل کی گئی کامیابیاں صرف عقائد اور پختہ ایمان کی بنیادوں اور شہادت کے اصول پر بھروسہ کرکے حاصل ہوئی ہیں اور یہ بذات خود اس علاقہ میں اسلامی انقلاب کے اثرات میں سے ایک اثر تھا، جس نے انقلاب کے قائدین کے دعویٰ کا ایک مناسب نمونہ فراہم کیا ہے اور سرانجام فلسطین کے عوام بالخصوص نوجوان نسل نے ان سازش کار قائدین سے نا اُمید ہوکر عوامی مبارزہ کے راستہ کو منتخب کیا ہے اور اس طرح ''انقلاب سنگ'' کا آغاز ہوا ہے۔

اسلامی انقلاب کی دوسری دہائی ''انتفاضہ'' اور ''انقلاب سنگ'' کے نام کی ایک نئی موجود سے

روبرو ہوئی۔ انتفاضہ نے اپنے راستہ میں اسلامی انقلاب سے درس حاصل کر کے صہیونیوں کے خلاف اپنے انتھک اور مسلسل مبارزہ کا آغاز کیا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے اور اس کے علاوہ حماس اور جہاد اسلامی جیسی تحریکیں جو مکتب اسلام پر بھروسہ کر کے تشکیل پائی ہیں، نے عرب دنیا میں پائی جانے والے مادی نظریات سے اپنی امیدیں توڑ دی ہیں۔

اس تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ وہ سارے گروہ اور پارٹیاں جو کبھی نیشنلزم، سوشلزم اور لیبرل ازم کی آئیڈیالوجیوں کے معتقد تھیں، آج اس بات کا اعتراف کرنے لگی ہیں کہ فلسطین کی نجات کا راستہ صرف مکتب اسلام میں ہے۔

صہیونیوں اور حزب اللہ کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کے بغیر اور صرف شہادت طلب کار کردگیوں کے نتیجہ میں جنوب لبنان سے اسرئیلوں کا بھاگ جانا، فلسطینیوں کی قدرت میں اضافہ کا سبب بنا۔ اس طرح ''انقلاب سنگ'' اور ''انتفاضہ'' ''قدس'' کے مقابلہ میں اسرائیلی پریشان وحیران ہیں اور عرفات کی خود مختار حکومت ہمیشہ کی نسبت اسلو معاہدہ سے نجات پانے میں عاجز اور پریشان ہے۔ اور یہاں تک کہ قدامت پسند عرب حکومتیں بھی دنیائے عرب کے عوامی دباؤ کے نتیجہ میں انتفاضہ تحریک کی حمایت کرنے پر مجبور ہوئیں۔

اگر ہم حقیقت میں علاقہ کی سطح پر اسلامی انقلاب کے مسائل پر نظر ڈالیں، تو مشاہدہ کریں گے کہ یہ انقلاب اپنے پیغام کو دنیا کے محروم ومستضعف لوگوں تک پہنچانے اور ایک نمونہ اور مبارزہ کے طور پر اپنی حیثیت کو مسلمانوں میں پہچنوانے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے الفاظ میں اس لحاظ سے انقلاب برآمد ہونے میں کامیاب رہا اور اس وقت فلسطین کی تحریک، ایک دوسرا اسلامی انقلاب کا روپ اختیار کر چکی ہے اور دنیا والوں کے افکار کو اپنی طرف جذب کر چکی ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ یہ ناقابل سازش طریقہ جس طرح ایران اور لبنان میں بارآور ثابت ہوا ہے، فلسطین میں بھی اپنے مقصد، یعنی صہیونیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوگا اور زمانہ کسی صورت میں سامراج اور صہیونزم کے حق میں پلٹنے والا نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ بات ناقابل فراموش ہے کہ اسلامی

انقلاب کے اثرات صرف لبنان اور فلسطین کی سرزمین تک محدود نہیں تھے بلکہ اسلامی تحریکوں کو ترکیہ، الجزائر اور دوسرے تمام اسلامی ممالک میں تقویت بخشنے میں اسلامی انقلاب کا کردار ناقابل انکار ہے۔

ھ) اسلامی انقلاب اور خلیج فارس کے جنوبی ساحل کے ممالک۔

ان ممالک کی حکومتوں اور شاہ کی حکومت کے درمیان پائی جانے والی شباہت کے پیش نظر، اسلامی انقلاب کی کامیابی اور شاہ کے زوال کی سب سے پہلی لرزش اور پریشانی، ان کمزور، چھوٹی اور مغربی تسلّط اور نفوذ والی حکومتوں کے لئے پیدا ہوئی۔ یہ حکومتیں اپنے مستقبل کے بارے میں اس قدر مضطرب اور پریشان ہوئیں، کہ صدام کے ایران پر حملہ کی خبر سنتے ہی، اس کے ساتھ اپنی دیرینہ دشمنی کو فراموش کر کے اپنی بھرپور مالی اور دیگر وسائل کی مدد کے ساتھ عراق کی حمایت میں آگے بڑھیں تا کہ شاید ایران کی شکست کے نتیجہ میں ان کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔ دوسری طرف سے ایرانی حجاج کا ہر سال حج کی لوگوں سے چھلکتی ہوئی تقریبات میں شرکت کرنا اور بالخصوص وہاں پر مشرکین سے بیزاری اور برائت کا پروگرام منعقد کرنا، ان کے لئے ایک ایسا خطرہ تھا، جس کو وہ روکنے کی فکر میں تھے۔

اسلامی انقلاب نے ان تمام دشمنیوں کے باوجود، وسعت قلب اور ہمت وحوصلہ سے انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ انقلاب نہ صرف ان کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان کی مدد کرسکتا ہے تا کہ وہ سامراج اور امریکہ کے تسلط سے آزاد ہو جائیں۔

دوسری دہائی کے آغاز پر خلیج فارس کی جنگ اور حکومت عراق کا ایران کے ساتھ جنگ میں اپنی حامی حکومت کویت پر حملہ نے ان ممالک کے لئے حقائق واضح کر دیئے کہ اسلامی جمہوریہ نہ انتقام لینے کی فکر میں ہے اور نہ ان کی سرزمینوں پر حریصانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد "خلیج فارس تعاون کمیٹی"، تشکیل پائی اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہیں ہے کہ اس کے مقاصد میں سے ایک اسلامی انقلاب سے مقابلہ کرنا تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ ایران کے تین جزائر پر دعویٰ کر کے

اتفاق رائے سے قراردادیں پاس کرتے تھے۔اس کے باوجود کہ امریکی اور برطانوی سامراج ان ممالک اور جمہوری اسلامی ایران کے درمیان اختلافات اور دشمنیاں ایجاد کرنے کی کوششیں کرتے تھے،لیکن اسلامی جمہوریہ ایران نے انتہائی صبر وتحمل اور تدبیر سے استعماری طاقتوں کی اپنا الوسیدھا کرنے کی پالیسیوں کو کامیاب ہونے نہیں دیا اور ان ممالک کے درمیان روابط کو بہتر بنانے کی کوشش کی،آج ہم ان ممالک کی پالیسیوں میں نمایاں تبدیلی کا مشاہدہ کررہے ہیں کہ وہ اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ اچھے تعلقات کو تقویت بخشنے کی کوشش میں لگے ہیں۔اس سے خلیج فارس کے علاقہ میں امن وسلامتی برقرار ہونے اور امریکہ اور انگلستان جیسی بڑی طاقتوں کی مداخلت کو کم کرنے کا سبب بنا ہے۔اس کے علاوہ ان ممالک کے مشترک سرمایہ یعنی تیل کے ذخائر، جو مغرب کی اقتصاد وصنعت کی شہ رگ ہے، سے بہتر استفادہ کرنے کا موقع فراہم ہوگا۔

ہم نے اس حصہ میں اسلامی جمہوریہ ایران کی خارجہ پالیسی اور علاقہ اور ہمسایہ ممالک میں اسلامی انقلاب کے اثرات کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ،اسلامی انقلاب کے راستہ میں بڑی رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود، مشرق وسطی کے علاقہ میں،دوسری دہائی کے دوران اسلامی انقلاب کی کارکردگی مثبت تھی۔آج مشرق وسطیٰ میں سب اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کے نظام کے مقتدر اور مستحکم ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایک ایسے سوق الجیشی اور حساس علاقہ میں، جہاں ناپائیداری اور بحران چھایا ہوا ہے اور اس علاقہ کے اکثر ممالک سامراج کی میراث میں چھوڑی گئی بڑی پریشانیوں اور مشکلات سے دوچار ہیں،اسلامی انقلاب بدستور اپنے معین کردہ راستہ پر گامزن ہے اور سامراج مخالف،اسلام خواہی اور تدبیر وحکمت عملی سے کام لینے کی اپنی پالیسی پر چلتے ہوئے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اپنے اصولی موقف اور مقاصد کے سلسلہ میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا ہے۔یہ سب ایسی حالت میں ہے کہ مغربی طاقتیں بالخصوص امریکہ اپنی وسیع فوجی طاقت سے علاقہ میں کوشش کرتا ہے اپنے اثر ونفوذ کو پھیلا کر اپنے مقاصد کو پورا کرے اور بیشک مستقبل میں بھی بڑی طاقتیں تیل کے ذخائر،اسرائیل کی

حمایت اور علاقہ کی سوق الجیشی حالت کے پیش نظر ان کوششوں اور اقدامات سے فروگزاشت نہیں کریں گی۔ اس لئے اسلامی انقلاب اور نظام کو مغرب، بالخصوص امریکہ کی طرف سے اس علاقہ میں آئندہ ایجاد کئے جانے والے بحرانوں کے لئے آمادہ رہنا چاہئے۔

تیسرا مرحلہ:

اسلامی انقلاب اور عالمی تبدیلیاں

مذکورہ دو دہائیوں کے دوران اسلامی انقلاب کے اثرات اور انعکاس صرف ایران کے اندر، مشرق وسطیٰ یا عالم اسلام تک محدود نہیں تھے، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اس انقلاب نے علاقہ سے بالاتر بالخصوص بین الاقوامی نظام پر بھی اپنے اثرات ڈالے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایران میں اسلامی انقلاب ایک ایسے زمانہ میں رونما ہوا، جب دنیا پر دو قطبی نظام حاکم تھا اور دنیا مشرق و مغرب کے دو بلاکوں میں تقسیم ہوئی تھی۔ دنیا کی دو بڑی طاقتیں یعنی امریکہ اور سوویت یونین نے ان دو بلاکوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اگرچہ ۱۹۵۷ء میں تیسری دنیا یا غیر جانبدار ممالک کے نام پر چند ملکوں کا اتحاد وجود میں آیا تھا اور رفتہ رفتہ تشکیل پا رہا تھا، لیکن یہ اتحاد ہرگز دو قطبی نظام کے سسٹم پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد دو قطبی نظام کے وجود میں آن کے زمانے سے یہ مسئلہ زیر بحث تھا اور عملاً اس پر تجربہ ہو رہا تھا کہ دنیا میں پیدا ہونے والا ہر حادثہ اور تبدیلی یا مختلف ممالک کے نظاموں میں پیدا ہونے والی ہر تغییر دو بلاکوں میں سے ایک کی طاقت کے توازن کو نفع یا نقصان کی صورت میں تغیر دے سکتی ہے۔ لہذا ان دو بڑی طاقتوں کا مقابلہ اس حادثہ کے وجود میں آنے اور اس کے طریقہ کار کے دائرے میں قابل توجہ ہے۔ دو قطبی نظام کا چالیس سالہ تاریخی تجربہ اس نظریہ کی تائید کرتا ہے۔

۱۹۴۹ء میں انقلاب چین کی کامیابی، ۱۹۵۲ء میں کوریا کی جنگ، مشرق وسطیٰ کے عرب علاقوں میں فوجی بغاوتیں، مجارستان کا بحران، برلین کی دیوار، کیوبا کے میزائل کا بحران اور اسی طرح ویٹنام کی جنگ من جملہ حوادث اور اتفاقات تھے جو دو بڑی طاقتوں میں سے ایک کی حمایت کے نتیجہ میں رونما

ہوئے اور ٹکراؤ کا سبب بنے۔

قابل ذکر بات ہے کہ ایران میں انقلاب سے پہلے رونما ہونے والے حوادث میں بھی ان دو بڑی طاقتوں کی رقابت واضح طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلہ میں روسی فوجیوں کے توسط سے آذربایجان پر تسلط کا سلسلہ، تیل کو قومیانے کی تحریک ۲۸ مرداد (۱۹ اگست) کی سازش اور ۱۹۵۰ء کی دہائی کے حوادث کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ ۱۹۵۳ء کی تختہ الٹنے کی سازش کے بعد ایران کو مغربی بلاک کے ایک حصہ کے طور پر پہچانا جاتا تھا اور مغرب کے فوجی، سیاسی اور اقتصادی معاہدوں میں رکنیت حاصل کرنے کی وجہ سے اس کا اٹوٹ انگ شمار ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود ایران کی ۲۵۰۰ کلومیٹر سرحد مشرق کی بڑی طاقت سے مشترک ہونے اور غیر معمولی سوق الجیشی حالات کے پیش نظر سوویت یونین کی حکومت ایران کے مسائل کے بارے میں بے خیال نہیں رہ سکتی تھی اور عام طور پر ایران کے خارجی مسائل کے بارے میں ردعمل ظاہر کرتی تھی۔

امام خمینیؒ کی رہبری میں اسلامی تحریک کے آغاز سے ۵ رجون ۱۹۶۳ء کو اس کے عروج تک پہنچنے کے باوجود امامؒ کے حملوں کا نشانہ اکثر امریکہ ہوا کرتا تھا، پھر بھی یہ امر سوویت یونین کے لئے اس امریکہ مخالف تحریک کے بارے میں مثبت موقف اختیار کر کے اس کی حمایت کرنے کا سبب نہیں بنا۔ سوویت یونین نے نہ صرف اس تحریک کی حمایت نہیں کی، بلکہ انتہائی حیرت انگیز حالت میں مشاہدہ کیا گیا کہ اس عوامی انقلاب کے خلاف امریکہ کے متحد ممالک کی طرح منفی موقف اختیار کیا۔ یہ پالیسی درج ذیل دو مسائل کی وجہ سے تھی:

۱۔ تحریک کی دینی اور اسلامی ماہیت۔ مشرق و مغرب کی طاقتیں آپس میں اختلافات رکھنے کے باوجود دینی بالخصوص اسلامی تحریکوں کے خلاف مشترک موقف رکھتی ہیں۔

۲۔ حضرت امام خمینیؒ نے اپنی تحریک کے آغاز پر ہی ان دو بڑی طاقتوں کے بارے میں اپنے موقف کا اعلان کیا تھا اور اپنا وہ معروف جملہ کہا تھا: "امریکہ انگلستان سے بدتر ہے، انگلستان امریکہ سے بدتر ہے اور سوویت یونین دونوں سے بدتر ہے سب ایک دوسرے سے پلید تر ہیں، لیکن آج ہمارا

سرو کاران خبیثوں سے ہے، امریکہ سے ہے[1]" اور یا یہ مطلب کہ "ہم بین الاقوامی کمیونزم کے ساتھ اسی قدر برسرِ پیکار ہیں جس قدر امریکہ کی سرکردگی میں مغربی سامراجوں کے ساتھ ہیں[2]"
ان جملوں میں دو بڑی طاقتوں کے لئے یہ پیغام تھا کہ دونوں طاقتیں اس تحریک کے عروج تک پہنچنے اور کامیاب ہونے سے نقصان اٹھا چکی ہیں اور اس انقلاب نے عالمی نظام میں ان کی برتری کو چیلنج کیا ہے۔

اسلامی انقلاب کے ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء میں عروج تک پہنچنے اور "نہ شرقی نہ غربی، جمہوری اسلامی" کا نعرہ بلند کرنے کے پیش نظر دونوں بڑی طاقتوں کی طرف سے شاہ کی حمایت اور اسلامی انقلاب کے دشمنوں بالخصوص زبردستی لادی گئی جنگ کے دوران عراقی حکومت کی مشترکہ طور پر حمایت نے ثابت کیا کہ اسلامی انقلاب دو قطبی نظام کے لئے قابل برداشت نہیں ہے بلکہ انقلابی مسلمانوں کے توسط سے حاصل کی گئی کامیابی اور عوامی فوج اور رضا کاروں کی عراق ایران جنگ کے دوران استقامت اور پائیداری نے دو قطبی نظام کی بنیادوں کی کمزوری کو ثابت کیا۔
شائد یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اس کی دو بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک پر بھروسہ نہ کرنے کی پالیسی دو قطبی نظام کے زوال میں موثر تھی۔
میخائیل گورباچوف کے کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری اور سوویت یونین کے صدر جمہوریہ کی حیثیت سے برسر اقتدار آنے اور "پرسترویکا" اور "گلاس نوست" پر مبنی سیاست کو پیش کرنے کے نتیجہ میں مشرقی بلاک اور اسی کے ساتھ دو قطبی نظام کے زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔
حضرت امام خمینیؒ نے اسی زمانہ میں ان تبدیلیوں پر غائرانہ نظر ڈالی اور وہ اس سلسلہ میں فکر مند تھے کہ ایسا نہ ہو کہ مشرقی بلاک کا زوال مغربی بلاک کی کامیابی ثابت ہو اور مشرقی بلاک کے ممالک بھی

۱۔ صحیفہ نور، ج ۱، ص ۱۰۵

۲۔ صحیفہ نور، ج ۱۲، ص ۱۲

مغرب اور امریکہ کی آغوش میں چلے جائیں اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو نمونہ بنانے کی تشویق ہو۔ انہوں نے گورباچوف کے نام لکھے گئے اپنے ایک تاریخی خط میں اسے ان خطرات سے آگاہ کیا اور مشرقی بلاک کی اصلی مشکل یعنی خدا سے جنگ کے بارے میں اسے توجہ دلائی اور پوری طاقت سے اعلان کیا کہ اسلام کا سب سے بڑا اور طاقتور مرکز، اسلامی جمہوریہ ایران سوویت یونین کے عوام کے عقیدتی خلاء کو پر کرسکتا ہے۔ اس پیغام کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس کے بعض اقتباسات کو ذیل میں درج کرتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب محترم گورباچوف، صدر مجلس اعلیٰ، سوشلسٹ سوویت یونین۔

آپ کی اور روسی قوم وملت کی خوش بختی و نیک بختی کی امید کرتے ہوئے۔

جب سے آپ نے اپنا عہدہ سنبھالا ہے یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ نے سیاسی واقعات کے تجزیے خصوصاً دور جدید میں روس، جن مسائل سے دوچار ہے، انکی طرف نئے سرے سے انقلاب آمیز نظر ڈالی ہے۔ دنیاوی حادثات و واقعات کے سلسلہ میں آپ کے بے باکانہ فیصلے، ہوسکتا ہے کہ موجودہ دنیا پر حاکم توازن میں خلل پڑنے اور ایک بڑی تبدیلی رونما ہونے کا سبب بنیں۔ اس لئے میں نے چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ کو مبذول کرانا بہتر سمجھا!

بہت ممکن ہے آپ کا دائرہ فکر اور آپ کے نئے عزائم محض پارٹی کے مسائل اور اس کے ذیل میں روسی عوام کے بعض مشکلات کا حل ڈھونڈ نکالنے تک محدود ہوں، پھر بھی، جس نظریہ نے سالہا سال دنیا کے فرزندان انقلاب کو اپنے آہنی حصاروں میں مقید کر رکھا تھا، اس نظریہ پر اتنے دلیرانہ انداز سے آپ نے جو تجدید نظر فرمائی ہے، یہ بھی قابل تعریف ہے۔ اور اگر اس سے کچھ اور بلند ہو کر آپ غور وفکر کریں، تو سب سے پہلا مسئلہ جو آپ کے لئے یقیناً کامیابی کا باعث ہوگا، وہ یہ ہے کہ آپ کے بزرگوں کا جو

نظریہ خدا سے دوری اور دین دشمنی پر مبنی تھا اور جس نے ملت روس کو زبردست نقصان پہنچایا ہے، آپ اس نظریہ کے بارے میں تجدید نظر کریں اور پھر سے سوچیں۔ آپ یقین کیجئے کہ دنیاوی مسائل کے واقعی حل کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ممکن ہی نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اقتصادی میدان میں غلط طریقہ عمل اور اقتدار پر قابض گزشتہ کمیونسٹ لیڈروں کی غلط کارگزاریاں مغربی ممالک کو سبز باغ دکھائیں، لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ اگر آپ اس سلسلہ میں سوشلزم اور کمیونزم کے اقتصادیات کی الجھی گتھیوں کو مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے سایہ میں سلجھانا چاہیں گے تو نہ صرف یہ کہ آپ اپنے معاشرہ کے درد کا علاج نہیں کر سکیں گے بلکہ آئندہ آنے والوں کو آپ کی لغزشوں کی تلافی کرنا پڑے گی کیونکہ اگر آج مارکسیزم اپنی اقتصادی و اجتماعی روش میں حائل دیوار کو عبور کرنے سے عاجز ہے تو مغربی دنیا بھی ان ہی مسائل میں البتہ ایک دوسرے انداز سے دیگر مسائل کے تحت حادثات سے دوچار ہے۔

جناب گورباچوف!

حقیقتوں سے منہ نہیں موڑنا چاہئے، آپ کے ملک کی اصلی مشکل مالکیت، اقتصاد اور آزادی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ آپ کی تمام پریشانیوں کی اصل جڑ خدا پر اعتماد نہ ہونا ہے، وہی مشکل جس نے مغرب کو بھی تباہی و بربادی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے، یا پہنچا کے رہے گی۔ آپ کی اصل مشکل مبداء وجود وہستی، خداوند عالم کے مقابلہ میں ایک عرصہ سے جاری فضول ٹکراؤ ہے۔

جناب محترم گورباچوف!

یہ بات سب پر روشن ہو چکی ہے کہ اب اس کے بعد کمیونزم کو دنیا کی سیاسی تاریخ کے عجائب گھر ہی میں ڈھونڈھنا پڑے گا۔ کیونکہ مارکسی نظریہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے سے قطعی قاصر ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ایک مادی نظریہ ہے۔ اور آج مشرق

ومغرب کا معاشرہ جس بنیادی بیماری میں مبتلا ہے وہ ''بشریت کا معنویت پر عدم اعتقاد'' ہے اور اس بحران سے بشریت کو مادیات کے ذریعہ نجات نہیں دلائی جاسکتی۔

محترم گورباچوف!

ممکن ہے آپ نے مقام اثبات میں مارکسیزم کے بعض پہلوؤں سے روگردانی کی ہو اور آج کے بعد بھی انٹرویو وغیرہ میں اس پر اپنے مکمل عقیدہ اور اعتماد کا اظہار فرمائیں ۔مگر یہ بات آپ خود بھی جانتے ہیں کہ مقام ثبوت میں ایسا نہیں ہے۔کمیونزم پر سب سے پہلی کاری ضرب چینی قیادت[۱] نے لگائی، دوسری اور بظاہر آخری کاری ضرب آپ نے لگائی ہے۔اب اس وقت دنیا میں کمیونزم نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔لیکن میں آپ سے پوری سنجیدگی کے ساتھ اتنا ضروری چاہتا ہوں کہ مارکسیزم کی خیالی دیواروں کو توڑنے میں آپ، مغرب اور شیطان بزرگ (امریکہ) کے زندان میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ دنیائے کمیونزم کی ستر سالہ کجی کے آخری بوسیدہ نقاب کو بھی اپنے ملک اور تاریخ کے چہرے سے نوچ کر پھینک دیں گے اور اس طرح واقعی ایک قابل افتخار کارنامہ انجام دیں گے۔اب آپ کی طرفدار وہ حکومتیں بھی جن کے دل اپنے وطن و اہل وطن کے لئے دھڑک رہے ہیں، کسی قیمت پر اپنے ملکوں کے زمینی و غیر زمینی ذخیروں کو کمیونزم کا تفوق ثابت کرنے کے لئے، جس کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں خود ان کے فرزندوں کے کانوں تک پہنچ چکی ہیں، خرچ کرنے کے بعد تیار نہ ہوں گی۔

محترم گورباچوف!

جس وقت آپ کی بعض جمہوریتوں میں واقع مسجدوں کے گلدستۂ اذان سے ''اللہ اکبر'' اور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی رسالت کی گواہی کی صدا ستر سال کے بعد سنی گئی تو

۱۔ماوزے تنگ

''خالص محمدیؐ اسلام'' کے طرفداروں کی آنکھوں سے وفور شوق میں آنسو نکل آئے۔ لہذا میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے گوش گزار کردوں کہ ایک بار پھر سے مادی والٰہی تصور و کائنات کا جائزہ لیجئے۔

میں آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ پوری سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے بارے میں تحقیق اور چھان بین کریں۔ اور یہ خواہش اس لئے نہیں ہے کہ اسلام اور مسلمین آپ کے محتاج ہیں، بلکہ اسلام کے آفاقی وعظیم اقدار کی بنا پر ہے جو تمام قوموں کی نجات کا سبب اور باعث راحت وآرام بن سکتے ہیں اور یہی بشریت کے بنیادی مشکلات کی گرہیں کھول سکتا ہے۔ اسلام کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ، ہوسکتا ہے کہ آپ کو افغانستان اور اسی قسم کے دنیا کے دیگر مسائل سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دے۔ ہم دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو اپنے ملک کے مسلمانوں کی طرح سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے آپ کو ان کی سرنوشت میں شریک سمجھتے ہیں۔ آپ نے سوویت روس کی بعض جمہوریوں میں نسبتاً جو مذہبی آزادی دی ہے اس سے لگتا ہے کہ اب آپ یہ خیال ترک کرچکے ہیں کہ مذہب معاشرہ کے لئے افیون ہے۔

سچ بتایئے جس مذہب نے ایران کو بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں ایک پہاڑ کے مانند استوار کر رکھا ہے، کیا وہ معاشرہ کے لئے نشہ آور ہوسکتا ہے؟ آیا جو مذہب پوری دنیا میں عدالت وانصاف کے اجرا کا مطالبہ کرتا ہے اور انسان کو ہر قسم کی معنوی و مادی قید سے آزاد دیکھنے کا خواہاں ہے معاشرہ کے لئے افیون ہے؟ البتہ جو مذہب اسلامی وغیر اسلامی ممالک کے مادی ومعنوی تمام سرمایہ کو بڑی طاقتوں اور حکومتوں کے حوالہ کردینا چاہتا ہے اور برسر عام چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ سیاست دین سے جدا ہے، یقیناً ملک وقوم کے لئے افیون اور نشہ آور ہے۔ لیکن وہ اس صورت میں واقعی مذہب نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس مذہب کو ہمارے یہاں کے لوگ ''امریکی مذہب'' کہتے ہیں۔

آخر میں میں پھر صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ ایران عالم

اسلام کا عظیم ترین و طاقتور ترین مرکز ہونے کی حیثیت سے بڑے اطمینان کے ساتھ آپ کے اعتقادی نظام کے خلا کو پُر کر سکتا ہے۔ بہر حال ہمارا ملک ماضی کی طرح حسن ہمسائیگی اور برابری کے روابط کا قائل ہے اور اس کا احترام کرتا ہے۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

(جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو)

روح اللہ الموسوی الخمینی

۲۲ رجمادی الاول ۱۴۰۹ھ (یکم جنوری ۱۹۸۹ء)

سوویت یونین کی پالیسیوں میں تبدیلی رونما ہونے اور اس کے بعد روسی فیڈریشن کی آزادی کے پیش نظر اسلامی جمہوریہ ایران نے بھی اپنے اس شمالی ہمسایہ کے بارے میں نیا موقف اختیار کیا۔

حقیقت میں انقلاب کی دوسری دہائی کا آغاز اپنے اس شمالی ہمسایہ کے ساتھ نئے اور سوق الجیشی روابط سے ہوا کہ یہ رابطہ اس پوری مدت میں اور اب تک عالمی اور علاقائی تبدیلیوں میں ایک کلیدی رول ادا کر چکا ہے اور گزشتہ بین الاقوامی موازنات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی جمہوریہ نے ایک طرف سے سابقہ سوویت یونین کی تازہ آزاد ہوئی جمہوریتوں کے ساتھ ایک خاص باریک بینی سے اپنے روابط کو وسعت بخشی، کہ ہم نے گزشتہ فصل میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری طرف سے ماسکو کے ساتھ فوجی، اقتصادی اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں روابط برقرار کئے۔

امامؒ کی رحلت کے فوراً بعد جناب ہاشمی رفسنجانی کی ماسکو کی مسافرت نے اس رابطہ کی راہ ہموار کی اور کئی معاہدوں کو منعقد کرنے سے اس رابطہ کو استحکام ملا۔ ان معاہدوں میں سب سے اہم معاہدہ اسٹریٹجک اسلحہ سازی کی ٹیکنالوجی اور ٹیکنکل سائنس کے تبادلہ کے بارے میں تھا، جس کے نتیجہ میں اسلامی جمہوریہ ایران لڑاکو ہوائی جہاز، ٹینک اور آب دوز کشتیوں کے بارے میں جنگ کے دوران ایجاد شدہ خلاء کو پر کر سکا۔ جرمنی کی طرف سے معاہدہ کے باوجود امریکی دباؤ پر ادھورے چھوڑ گئے بو شہر کے ایٹمی بجلی گھر کو روس کی طرف سے مکمل کرنے کی منظوری نے امریکہ کو سخت پریشان کر دیا۔ دو

قطبی نظام کے زوال کے اثرات صرف ایران کے روسی فیڈریشن سے جدید تعلقات تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ مسئلہ مستقبل میں بین الاقوامی نظام، مغرب کے موقف بالخصوص امریکہ کے موقف پر بھی اثر انداز ہوگا۔

سوشلسٹ سوویت یونین کا زوال اس طاقتور نظام کے ڈھانچے میں تغیر و تبدیلی کا سبب بنا۔ اس نے دو قطبی نظام کی حاکمیت کے دور کے خاتمہ کے ساتھ عالمی معاشرہ کو اس اہم سوال سے روبرو کر دیا کہ دنیا کا آئندہ نظام کس قسم کا ہوگا اور کن معیاروں اور قواعد وضوابط پر استوار ہوگا؟

مشرق کی بڑی طاقت کا زوال اور مارکسیسزم، لینینزم کی ناکامی کے ضمن میں سوویت یونین کی بظاہر ناقابل شکست طاقت کا ڈوب جانا اور اس کا مشرقی بلاک کی رہبری سے کنارہ کشی کرنا دوسری بڑی طاقت امریکہ کے لئے موقع فراہم کرنے کا سبب بنا، تا کہ وہ اس خلاء سے استفادہ کر کے اپنے بلا مقابلہ تسلّط کو تمام دنیا میں پھیلائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ امریکہ کے نظریہ پیش کرنے والے مدعی تھے کہ مشرقی بلاک کا زوال نہ صرف مارکسیزم۔ لینینزم آئیڈیالوجی کی ناتوانی کو ثابت کرتا ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام عالم بشریت پر اپنا تسلط اور برتری جمانے کا حق رکھتا ہے۔ اور ''فوکویاما'' کے دعویٰ کے مطابق یہ برتری تاریخ کے خاتمہ تک جاری رہے گی۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمہ اور مشرقی بلاک کے زوال کا سبب دوسری بڑی طاقت کو مغربی دنیا کی رہبری سے بے دخل کرنے کے خطرہ کی پریشانی بھی رکھتا تھا۔ اس امر نے امریکہ کے سیاستمداروں اور زمامداروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ایک نئی سیاست اور ایک قسم کی چارہ جوئی کو اپنائیں اور مغربی دنیا پر اپنی رہبری کو جاری رکھتے ہوئے تمام دنیا پر تسلط جمانے کے لئے ضروری اقدام کریں۔

بعض امریکی نظریہ پیش کرنے والے، سرد جنگ کے خاتمہ کو یہ نظریہ ایجاد کرنے کے لئے مناسب فرصت جانتے تھے کہ عالمی نظم وانتظام اور صلح کے لئے ایک تسلط جمانے والی طاقت کی ضرورت ہے جو مادی منابع اور اپنی مطلق قدرت پر بھروسہ کر کے عام لوگوں کے لئے امن وسلامتی اور فلاح و بہبود کی ضامن ہو۔ ان امریکی نظریہ پیش کرنے والوں نے ''دنیا کا نیا نظام'' کے عنوان سے

ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ نظریہ کی بنیاد اس پر استوار ہے کہ سرد جنگ کے زمانہ سے باقی بچی تنہا بڑی طاقت ، یعنی امریکہ، دنیا میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کے لئے ، قابل توجہ حد تک اپنی فوجی طاقت کو عالمی سطح پر تقویت بخشنے کی بدستور نیاز مند ہے۔ مذکورہ نظریہ نے امریکی یونیورسٹیوں میں بعض بین الاقوامی سیاست کے مفکروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور انھیں اس کی توجیہ اور دفاع کرنے میں مشغول کیا۔

جبکہ نظم جدید کے جاری رہنے اور پائیداری کی شرط ذیل کی دو بنیادوں پر استوار ہوسکتی تھی:

اولاً یہ کہ امریکی حکومت عالمی نظام کی فوجی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی لحاظ سے رہبری کرنے کی بدستور توانائی اور طاقت رکھتی ہو۔

ثانیاً یہ کہ عالمی معاشرہ کے ممالک اس قسم کے نظم کی پیروی اور امریکی مطالبات کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں اور نافرمانی کی صورت میں سرکش اور باغی ملک کی تنبیہ کر کے اسے کچل دیں۔

دو قطبی نظام کے زوال اور یک قطبی نظام کے منصوبہ کے بعد، اسلامی انقلاب بڑی طاقتوں کے ایجاد کئے ہوئے ظالم نظاموں کے ساتھ اپنی صلح ناپذیر موقف پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے یک قطبی نظام میں پہلا ''سرکش'' اور نافرمان کے طور پر پہچانا گیا اور امریکی حکومت نے اس ''نافرمان'' کی تنبیہ کرنے میں انتھک کوششیں کیں تا کہ اس جدید نظام کی قانونی حیثیت کو استحکام اور پائیداری بخش کر عالمی معاشرہ میں اپنے اقتدار کو بلا مقابلہ جاری رکھ سکے۔ امریکہ کے ''گین گریج''، ''ڈیماٹور'' اور ''دوگانہ لگام حکمت عملی'' جیسے منصوبے امریکہ کے ایران پر دباؤ کی کوششوں میں سے شمار ہوتے ہیں۔

یک قطبی نظام قبول کرانے اور اسے استحکام بخشنے کے سلسلہ میں ایران کے خلاف امریکہ کی یہ کوششیں نہ صرف فائدہ مند ثابت نہیں ہوئیں بلکہ اسلامی جمہوریہ ایران کی استقامت دوسرے ممالک کے لئے بھی اس ظالمانہ نظام کی مخالفت کرنے میں تشویق کا سبب بنی، اور بالاخر اسی وجہ سے اس نظام کو قبل از وقت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ حقیقت میں حالیہ برسوں کے دوران تمدنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پیش کیا گیا یہ منصوبہ نہ صرف یک قطبی نظام کی قبل از وقت ناکامی کا اعلان تھا بلکہ دنیا

کے عمومی افکار میں انحراف کا سبب اور اس کے حقیقی تضاد پر پردہ پوشی کرنا تھا جسے حضرت امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب نے طشت از بام کیا تھا، یعنی ایک طرف سے سامراجی طاقتوں اور دوسری طرف سے ملتوں کے درمیان تضاد اور مختصر یہ کہ مستکبرین اور تمام دنیا کے مستضعفین کے درمیان تضاد۔ اسلامی انقلاب کے رہبر، حضرت امام خمینیؒ نے اس نظریہ کے معمار کی حیثیت سے مستضعفین کی حمایت اور مستکبرین سے مبارزہ کے پرچم کو ہاتھ میں لے کر دنیا کی سامراجی طاقتوں کے خلاف قیام کیا:

''سامراجی طاقتیں اپنے سیاسی کارندوں کے ذریعہ لوگوں پر مسلط ہوئی ہیں، ان پر ایک ظالمانہ اقتصادی نظام ٹھونس دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں: ظالم اور مظلوم......[۱]''

دوسرے الفاظ میں اسلامی انقلاب نہ صرف ظالم شہنشاہی نظام پر ملت ایران کی کامیابی کا سبب بنا ہے، بلکہ محروم اور مظلوم ملتوں کی بیداری اور انقلاب پر بھروسہ کر کے عالمی ستمگروں اور ظالموں کے نظام کو درہم برہم کرنے کی ایک عالمی تحریک کا آغاز ہے، کہ ہم امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب کے توسط سے توصیف کئے گئے نظام کے ڈھانچہ کو ذیل میں پیش کرتے ہیں:

اسلامی انقلاب، ایک آئیڈیالوجک انقلاب کی حیثیت سے اور مکتب اسلام سے سرچشمہ حاصل کئے گئے اپنے ایک خاص تصور کائنات کے پیش نظر، نہ صرف قومی سطح پر حکومت اور حکمرانی کے لئے اسلام کے خاص نظریات کے پروگراموں کو زندہ کرتا ہے، بلکہ اسلام کے عالمی ہونے کے پیش نظر عالمی سطح پر خاص افکار و نظریات کا مالک ہے اور اپنا خاص عالمی نظام پیش کرتا ہے۔

اسلامی انقلاب نے ہر دوسرے انقلاب کے مانند، اپنے پروگراموں اور مقاصد کی ماہیت کے پیش نظر، خاص مفاہیم اور اصطلاحات کو تحفہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ ان میں سے بعض خود خالص تفکر کی ایک دنیا ہیں، جیسے: مستضعفین، مستکبرین، عالم استکبار اور مستضعفین کی حکومت وغیرہ کے

۱۔ امام خمینی، ولایت فقیہ، ص ۴۲۔۴۳

مانند اصطلاحات قابل ذکر ہیں۔

اسلامی انقلاب اور اس کے رہبر نے نہ صرف ماکیاول، ہابس اور مورگنٹا کے طرز تفکر سے سرچشمہ لئے ہوئے طاقت کو حق جاننے والے، بین الاقوامی تعلقات اور دنیا پر حاکم نظریات کو مسترد کیا، بلکہ یہ عقیدہ اور نظریہ پیش کیا کہ:

''دنیا کی امن وسلامتی مستکبرین کی نابودی پر منحصر ہے اور جب تک یہ تسلط جمانے والے بدتہذیب دنیا میں موجود ہیں، مستضعفین کی حکومت حق ہے۔[۱]''

حضرت امام خمینیؒ اسلامی تحریک کی ابتداء سے بالخصوص اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اپنے بیانات اور تحریروں میں ہمیشہ اسلام اور اسلامی انقلاب کے نظریہ کے مطابق مطلوبہ عالمی نظام کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ ان کے مطالب اور تحریروں سے استفادہ کر کے ہم اس نظام کے مندرجہ ذیل کلیات پر روشنی ڈالیں گے:

۱۔ مارکسٹوں کے تاریخی جبر کے اعتقاد کے مطابق مزدور طبقہ کی ناقابل اجتناب حاکمیت کے برعکس امام خمینیؒ اعتقاد رکھتے تھے کہ صرف مستضعف ملتوں کی اپنے حقوق کے بارے میں بیداری اور آگاہی پاکر مستکبرین کے خلاف قیام کرنے سے ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ''مستضعفین کو انقلاب برپا کرنا چاہئے۔'' تمام ممالک کے مستضعفین کو زبردستی اپنا حق حاصل کرنا چاہئے۔ ''انھیں منتظر نہیں رہنا چاہئے کہ وہ (مستکبرین) ان کو اپنا حق دیں گے۔ مستکبرین کسی کو اپنا حق نہیں دیتے۔[۲]''

۲۔ مستضعفین کی دنیا پر اپنی حکمرانی قیام کرنے کے لئے مستضعفین کی آگاہی اور عملی انقلاب ضروری اور ناقابل اجتناب ہونے کے علاوہ قرآن مجید کی آیت کے مطابق بھی ان کی کامیابی یقینی اور قطعی ہے:

''اے دنیا کی مستضعف ملتو! اٹھ کھڑے ہو اور اپنا حق چھین لو بڑی طاقتوں کے غل غپاڑے سے نہ ڈرو، خداوند متعال آپ کے ساتھ ہے اور زمین آپ کی وارث ہے اور خداوند متعال کا وعدہ بدلنے والا نہیں ہے۔[۳]''

۱۔ صحیفہ نور، ج ۱۱، ص ۲۶۲، ۲۔ صحیفہ نور، ج ۱۱، ص ۲۵۹، ۳۔ صحیفہ نور ج ۱۵، ص ۲۱۲

۳۔ عالمی امن وصلح کا تحفظ اور بقا کا تعلق بڑی طاقتوں اور مغربی دانشوروں اور سیاست دانوں کے پیش کردہ دوسرے نظاموں کے توازن سے نہیں ہے بلکہ یہ صرف استکباری طاقتوں کی نابودی اور شکست سے ممکن ہے[۱]۔

۴۔ مستضعفین کا تعلق صرف مسلمانوں اور تیسری دنیا کی ملتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کے اطراف واکناف میں استکبار کے تسلط میں پھنسے عام لوگ، یہاں تک مشرق ومغرب کی استکباری حکومتوں کے سائے میں موجود لوگ بھی مستضعفین ہیں۔ اس لئے جغرافیائی، ثقافتی اور حکومت وملت کی تقسیم بندیوں میں سے کوئی بھی عامل مستضعفین اور مستکبرین کے درمیان سرحد بندی کی دلیل نہیں ہوسکتی ہے۔ لہذا تمدنوں اور ثقافتوں کے ٹکراؤ، حتی عالمی قطب بندیوں کا نظریہ، مستکبرین کے تسلط کو جاری رکھنے، غنائم کی تقسیم بندی اور مختلف ملتوں اور معاشروں کا استحصال کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے[۲]۔

۵۔ سیکولرزم اور اومانسزم کی بنیادوں پر مشتمل گزشتہ نظاموں...... جو ایک اچھی زندگی کے لئے حصول لذت اور پرخرچ مصرف گرائی کی ترویج کرتے تھے...... کے برعکس یہ نظام دین اور خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر استوار ہے اور تقویٰ کی پابندی، اخلاقی نظم وضبط اور معنوی والٰہی اعتقادات کی پابندی کو باسعادت زندگی سمجھتا ہے اور بوالہوسی اور ذخیرہ اندوزی کی ثقافت (جو مستکبرین کا شیوہ ہے)...... کو سختی کے ساتھ مسترد کرتا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں امام خمینیؒ فرماتے ہیں: یہ تحریک، تمام دنیا مین مستضعفین کی تحریک کے طور پر پھیلنی چاہئے۔ ایران تمام مستضعف ملتوں کے لئے ابتداء اور نمونہ ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو اٹھنا چاہئے، بلکہ مستضعفین کو اٹھنا چاہئے۔ مستضعفین کے ساتھ وعدۂ الٰہی ہے جو فرماتا ہے کہ ہم مستضعفین پر منت رکھتے ہیں کہ وہ امام بن جائیں اور دنیا میں وارث بن جائیں۔ امامت مستضعفین کا حق ہے۔ وراثت مستضعفین کی ہے۔ مستکبرین غاصب ہیں۔ مستکبرین کو میدان سے نکلنا چاہئے۔ دونوں بڑی طاقتوں نے مستضعف ملتوں کو بر باد کرنے کا عہد کیا ہے اور ہمیں دنیا کے مستضعفین کی حمایت کرنی چاہئے۔ اسلام مسلمان اور غیر مسلم ممالک کے درمیان فرق کا قائل نہیں ہے اور دنیا کے تمام مستضعفین کا حامی ہے۔

۲۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ (دنیا کی) ملتیں، حتی وہ ملتیں بھی جو خدا پرست نہیں ہیں، سب مستضعفین ہیں اور ہمیشہ مستکبرین کے تسلّط میں رہی ہیں۔

۶۔ عام طور پر مسلمان اور خاص طور پر ایران کی ملت، جو استکبار پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوئی ہے، مکتب اسلام سے مستفید ہونے کی برکت سے اس عظیم عالمی تحریک کی ہدایت و رہبری اپنے ذمہ لئے ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی انقلاب کی وسعت اور اس کا ملک سے باہر مقبول ہونا سامراجی طاقتوں سے عالمی سطح پر مقابلہ اور مستضعفین کی حمایت کرنے کی کوشش کے معنی میں ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اکیسویں صدی میں ایک چند قطبی نظام کے گزر جانے کے بعد عالمی معاشرہ ایک نئے دو قطبی نظام میں داخل ہوگا جس کے ایک طرف دنیا کی سامراجی طاقتیں تمام فوجی اور اقتصادی وسائل کے ساتھ منظّم اور متحد ہوں گی اور دوسری طرف دنیا کی مستضعف ملتیں بالخصوص تیسری دنیا کی مستضعف ملتیں بیدار اور آگاہ مسلمانوں کی رہبری میں انقلاب برپا کر کے سامراجی طاقتوں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کریں گی۔

اگرچہ سامراجی طاقتیں قابل توجہ فوجی اور اقتصادی لحاظ سے مسلح تھیں اور ہوں گی، لیکن وہ اندرونی اور بیرونی محاذ پر بیدار اور آگاہ لوگوں کے ساتھ ایک شدید جنگ سے دوچار ہوں گی اور مناسب حالات، وسائل اور اسلحہ کے باوجود اپنے زمامداروں کو بچا نہیں سکیں گی۔

موجودہ تشکیل پا رہے چند قطبی نظام میں اسلامی جمہوریہ ایران سرگرم رول ادا کرسکتا ہے اور اسے یہ کردار انجام دینا چاہیے۔ مستقبل کی بلاک بندی اور امریکہ کے سامراجی عزائم کے مقابلہ میں یورپ کے تشکیل پا رہے بلاک کے علاوہ مغربی ایشیا میں، روس، چین، ہندوستان اور اسلامی جمہوریہ ایران پر مشتمل ایک اور طاقتور بلاک تشکیل پا رہا ہے۔ یہ چار بڑی طاقتیں عظیم قدرتی منابع رکھنے کے پیش نظر اور بوالہوسی نہ رکھنے کی وجہ سے امریکہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کے اسباب فراہم کرسکتی ہیں۔ اس بلاک بندی میں اسلامی جمہوریہ ایران، سرگرم اور طاقتور آئیڈیالوجی، سوق الجیشی حالت، اور عظیم منابع و ذخائر کا مالک ہونے کے پیش نظر، ملتوں کی ضروری آگاہی حاصل کر کے اپنے مقدر کا خود فیصلہ کرنے کے لئے انقلاب برپا کرنے تک، اہم رول ادا کرسکتا ہے۔

امریکہ کی طرف سے مجموعی طور پر کم از کم تجارتی اور اقتصادی لحاظ سے دباؤ ڈالنے کے باوجود

یورپ کے ساتھ اسلامی جمہوریہ ایران کے تعلقات بڑھ رہے ہیں اور یہ ایسی حالت میں ہے کہ تین اہم بحرانوں نے یورپ کے ساتھ ایران کے تعلقات میں خلل پیدا کی ہے۔ان میں سب سے اہم قضیہ ''آیات شیطانی'' نامی کتاب کے مصنف سلمان رشدی کے خلاف حضرت امام خمینیؒ کا فتویٰ تھا۔

اس فتویٰ نے مغربی دنیا میں ایسی ہلچل مچادی کہ یہ مسئلہ نہ صرف یورپی ممالک کے تہران سے اپنے سفیروں کو واپس بلانے کا سبب بنا بلکہ مغربی دنیا کے ایجاد کردہ بین الاقوامی نظام کو ایک چیلینج کا سامنا کرنا پڑا۔امام کے فتویٰ نے ثابت کیا کہ ایک اسلامی رہبر کی سادہ تحریر مغربی دنیا کی سیکیورٹی کی مستحکم دیواروں کو عبور کرسکتی ہے اور مغرب کو اپنے ایک شہری کی حفاظت کے لئے سالہا سال تک حفاظتی فوج کی ایک بڑی تعداد کو تیار رہنے کا حکم دینے پر مجبور کرسکتی ہے۔یہ لوگ اس وقت ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزرنے اور فتویٰ صادر کرنے والے کی رحلت کے باوجود سلمان رشدی کے لئے ضروری تحفظ مہیا نہ کرسکے ہیں۔

عالمی اور بین الاقوامی موازنے تغیر وتبدل کی حالت میں ہیں۔یک قطبی نظام کے زوال اور تمدنوں سے ٹکراؤ کے نظریہ موثر ثابت نہ ہونے کے بعد امریکی ''گلوبل'' اور ''چھوٹے عالمی گاؤں'' کا نظریہ پیش کررہے ہیں کہ اس عالمی چھوٹے گاؤں میں امریکہ کی چودھراہٹ میں دوسرے تمام سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی نظام امریکی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی نظام کے تحت الشعاع قرار پا کر نابود ہونے چاہئے اور حقیقت میں امریکہ کا تسلط ہمیشہ کے لئے دنیا میں قائم ہونا چاہئے۔فوکویاما کے بقول: ''ہم تاریخ کے اختتام تک پہنچ جائیں گے۔'' اگرچہ ''گلوبل'' نظریہ کے لئے زبردست پروپیگنڈا کیا جارہا ہے اور تیسری دنیا کی بہت سی ملتوں کو اس نظریہ کے مقابلہ میں منفعل و مرعوب کیا گیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ملتوں کے درمیان روابط کی وسعت کا لازمی نتیجہ مغربی بالخصوص امریکہ کے تسلط کا زیادہ دیر جاری نہ رہنا ہوگا۔یہ ایسی حالت میں ہے کہ خداوند متعال اور قرآن مجید کے وعدہ کے مطابق دنیا کی حاکمیت حضرت مہدی موعود(عج) کی رہبری میں مستضعفین کے ہاتھ میں ہوگی۔

تیسرا حصہ:

اسلامی انقلاب، دنیا کے بڑے انقلابوں میں

• ۔مقدمہ

• ۔پہلی فصل: ایران، فرانس اور روس کی بادشاہی حکومتوں کا موازنہ

• ۔دوسری فصل: انقلاب سے پہلے ایران، فرانس اور روس میں سماجی طاقت کا موازنہ

مقدمہ

عصر حاضر کا اسلامی انقلاب تاریخ کے معدود چند کامیاب انقلابوں میں سے ایک انقلاب ہے۔ فطری طور پر اس کے قوی اور ضعیف نقاط کی تحقیق کے طریقوں میں، دوسرے انقلابوں کے ساتھ اس کا موازنہ کرنا ہے۔ اس فصل میں ہم پہلی فصل میں پیش کی گئی تھیوری کے ڈھانچہ بالخصوص دو مقابلہ کی سیاسی واجتماعی طاقتوں کے روابط کے نکات سے استفادہ کر کے، دنیا کے مشہور اور حد درجہ نمایاں برجستہ ترین انقلابوں یعنی فرانس اور روس کے انقلابوں سے اس کا موازنہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ان میں سے ہر ایک علل وعوامل کے پیش نظر اور تاریخی دلائل وشواہد سے استفادہ کر کے اس انقلاب کی عظمت اور خصوصیات بیان کریں گے۔[1]

۱۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین، مصنف کی کتاب ''اسلامی انقلاب کا روس اور فرانس کے انقلابوں سے موازنہ''، طبع دوم، ۱۹۹۳ء کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

پہلی فصل:

ایران، فرانس اور روس کی بادشاہی حکومتوں کا موازنہ

۱۔ انقلاب سے پہلے حکومتوں کی اقتصادی حالت

۲۔ انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں حکومتوں کی عسکری طاقت

۳۔ انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں حکومتوں کی پیچیدگی اور استحکام

تین بادشاہی حکومتوں کا موازنہ

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا کہ سیاسی نظاموں کی قدرت کے عوامل اور منابع، اقتصادی اور عسکری طاقت اور بین الاقوامی حمایت اور سیاسی مدیریت پر مشتمل ہیں۔

اب ہم اس بنیاد پر ان تین ملکوں کی سلطنتی حکومتوں کا جائزہ لیں گے:

ا۔ انقلاب سے پہلے ان حکومتوں کی اقتصادی حالت۔

۱۷۸۹ء کے انقلاب سے پہلے فرانس میں ہر لحاظ سے اقتصادی حالات کے برے ہونے کے دلائل کی علامتیں موجود تھیں۔ یہ ملک انقلاب سے پچاس سال پہلے شدید اقتصادی اور مالی بحرانوں سے دوچار تھا اور ان کا دامن روز بروز پھیلتا جا رہا تھا۔[۱]

ڈوک ڈورلیان (نائب السلطنہ) نے ۱۷۸۵ء میں اس سلسلہ میں کہا ہے:

> ''سلطنتی خزانوں اور آمدنی کے صندوقوں میں ایک دینار بھی نقد موجود نہیں ہے تاکہ ضروری ترین اخراجات کے لئے ادا کریں۔ چونکہ میں مالیات کی ذمہ داری نبھاتا ہوں، دیکھتا ہوں کہ سرکاری ملکیتیں بیچی گئی ہیں، سرکاری آمدنی تقریباً نابود ہوئی ہے اور عام آمدنی بھی بیعانہ کے طور پر خرچ کی گئی ہے۔ ادائیگی کے ضمانت ناموں کے گوناگوں سرکاری اسناد لوگوں کے پاس موجود ہیں جن کی رقومات اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ ان کا حساب کرنا اور رقم معین کرنا بھی ناممکن بن گیا ہے۔''

انقلاب سے پہلے، بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی کے اوائل میں، روس کی اقتصادی حالت مطلوب نہیں تھی۔ اس دوران دو بیرونی جنگوں کی وجہ سے روس کی اقتصادی بدحالی میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ ۱۹۰۹ء تک جاری اقتصادی جمود نے مزدوروں اور کسانوں کے لئے ناگفتہ بہ حالات

۱۔ ''اٹھارہویں صدی کی تاریخ اور فرانس کا انقلاب'' تالیف آلبر مالہ وژوال ایزاک

ایجاد کئے تھے۔ایک طرف سے بیکاری پھیل رہی تھی اور دوسری طرف سے ان دو طبقوں کے لئے کام اور آمدنی کے شرائط نا قابل برداشت بن گئے تھے۔اس دوران مزدوروں کی ہڑتالوں کا محرک خاص طور پر اقتصادی بدحالی کا مسئلہ ہوا کرتا تھا اور ان ہڑتالوں اور ان میں شرکت کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی[1]۔

جبکہ ایران میں شاہ کی حکومت کے آخری دنوں میں،سلطنت کے گزشتہ ۵۷ سالہ دور میں اقتصادی قدرت کے لحاظ سے مطلوب ترین حالت تھی، جو پہلوی سلطنت کے پورے زمانے میں بے مثال تھی۔تیل کی درآمد میں اچانک اور خلاف توقع اضافہ سے ایران کی حکومت نہ صرف ایک دولتمند ملک میں تبدیل ہوئی تھی، بلکہ ایرانی معاشرہ مکمل طور پر ایک خرچ کرنے والے معاشرہ میں تبدیل ہوا تھا۔فرانس اور روس کی حکومتوں کے برعکس ایران کی حکومت نہ صرف مقروض نہیں تھی، بلکہ اس نے بہت ساری حکومتوں کو سخاوتمندانہ طور پر قرضے بھی عطا کئے تھے اور اس کے پاس قابل توجہ زرمبادلہ بھی موجود تھا۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی لحاظ سے فرانس اور روس کی حکومتیں بدترین حالات سے دوچار تھیں اور حقیقت میں دیوالیہ پن کے انتہائی مراحل میں قرار پائی تھیں،جبکہ ایران کی حکومت،تیل کی قیمتوں میں اچانک اور غیر متوقع اضافہ کی وجہ سے زرمبادلہ کے ذخائر اور مالی توانائی کے پیش نظر اپنی تاریخ کے مناسب اور مطلوب ترین اقتصادی حالات سے گزر رہی تھی۔

۲۔انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں حکومتوں کی عسکری طاقت۔

ہر سیاسی نظام کی اہم ترین اور محسوس ترین قدرت اور حاکمیت کا وسیلہ اس کی عسکری طاقت ہوتی ہے۔بالخصوص اندرونی خلفشار اور بحرانوں سے دوچار نظاموں کے لئے مخالف تحریکوں کو کچلنے کے لئے عسکری طاقت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔اگر ایک سیاسی نظام میں عسکری طاقت ضروری استحکام نہ رکھتی ہو اور پے درپے ناکامیوں کی وجہ سے اس کی اہمیت پست ہو چکی ہو اور اسی طرح

۱۔''روس کا نامکمل انقلاب'' تالیف ایزاک دوبچر

اقتصادی مشکلات کی وجہ سے حکومت اس کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکتی ہو اور سرانجام نظام کی عسکری طاقت سیاسی حکومت کے بارے میں اپنا عقیدہ کھو دے، تو سیاسی حکومت اپنے مخالفین کو کچلنے کے لئے ایسی عسکری طاقت سے نہ صرف استفادہ نہیں کر سکے گی، بلکہ خود فوجی مدعی بن کر مخالف گروہوں سے جاملیں گے اور سیاسی حکومت کے زوال کے احتمال کو تقویت بخشیں گے۔

فرانس، انقلاب سے پچاس سال پہلے، ۲۶ سال تک اہم بین الاقوامی جنگوں اور لڑائیوں سے دوچار تھا اور ان لڑائیوں میں نہ صرف ایک ریاست کے علاوہ کسی چیز کو حاصل نہ کر سکا، بلکہ عظیم مالی اور جانی نقصانات اور ناکامیوں سے بھی دوچار ہوا۔ یہ متوقع تھا کہ فوج کے افسر انقلاب کو کچلنے میں دلچسپی نہیں دکھائیں گے اور یہ مسئلہ سیاسی واجتماعی اختلافات کا سبب بن جائے گا اور اس طرح بادشاہ اور مسلط قدامت پسند طبقات کے خلاف تحریک کو کچلنے کی کوشش کو ناممکن بنا دے گا اور سرانجام فرانس کے انقلاب کی کامیابی کے لئے راہ ہموار کرے گا۔

روس کی عسکری حالت بھی یورپ میں کریمہ جنگوں اور ۱۹۰۵ء کی جنگ کی وجہ سے بدل گئی تھی۔ جو ملک ۱۸۱۵ء میں براعظم یورپ کا سب سے بڑی طاقت شمار ہوتا تھا، ۱۸۴۸ء کے بعد ایسا لگتا تھا کہ یورپ کی دوسری تمام طاقتوں سے ابھی کافی دور ہے۔ جنگ کریمہ کے بعد یورپ کی اپنی ہم پلہ طاقتوں کی حد سے بھی گر گیا اور جب تک روس پر زار حاکم تھا کبھی ۱۸۱۵ء کا مقام دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔ پہلی عالمی جنگ، وسعت، مدت اور روس کی سرحدوں کے قریب ہونے کے پیش نظر روس اور جاپان کی جنگ سے کئی گنا اہم تھی اور اس نے ملک کے داخلی مسائل پر زیادہ اثرات ڈالے۔ اس طرح کہ اس ملک کی فوجی طاقت کو مکمل طور پر تجزیہ کر کے رکھدیا اور محاذ جنگ سے شکست کھا کر لوٹے ہوئے فوجی، حکام کے مقابلہ میں سیاسی طاقت کے مدعی کے طور پر ابھرے۔ یہی وجہ تھی کہ روسی انقلاب روسیوں کی پہلی عالمی جنگ میں مصروفیت کے عروج کے دوران رونما ہوا۔

اس لئے انقلاب سے پہلے روس پر حاکم سیاسی نظام، نہ صرف فوجی طاقت اور وفادار مسلح افواج سے عاری تھا بلکہ اس کے برعکس شکست کھائی ہوئی فوج، بے ہمت ہو کر نظام سے باغی ہوئی اور

ہڑتالی مزدوروں سے مل کر انقلاب کی کامیابی کے لئے اہم رول ادا کیا۔

لیکن ایران کی شہنشاہی فوج نے فرانس اور روس کے برعکس انقلاب کی کامیابی سے کم از کم ۵۷ سال قبل کسی اہم بیرونی جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ محمد رضا شاہ نے ایران میں ہر بادشاہ کی نسبت مسلح افواج کا خاص خیال رکھا تھا۔ وہ مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے احساس کرتا تھا کہ ایک طاقتور فوج بادشاہ کی وفادار ہونے کے علاوہ، نہ صرف مخالفین کے مقابلہ میں اس کے نظام کی حفاظت کر سکتی ہے، بلکہ اس کی بوالہوسی کے پیش نظر علاقہ میں مداخلت اور بین الاقوامی مقاصد کو پورا کرنے کے وسائل بھی فراہم کرے گی۔

یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انقلاب کے زمانہ میں فرانس اور روس، متعدد جنگوں میں پے در پے شکست کھانے کی وجہ سے عسکری لحاظ سے انتہائی کمزور اور غیر مطمئن حالات سے دوچار تھے یہ فوجیں نہ صرف حکمراں سیاسی نظام کی حمایت نہیں کرتی تھیں، بلکہ انقلابیوں کے ساتھ دلچسپی اور میلان رکھتی تھیں اور بعض اوقات ان سے جاملتی تھیں۔ جبکہ ایران کی فوج قدرت اور اسلحہ کے لحاظ سے بہترین حالت میں تھی اور استثنائی اور پراگندہ مواقع کے علاوہ شاہ کی حکومت کے آخری لحات تک نظام کی وفاداری پر باقی رہی اور انقلابیوں کو کچلنے میں بھی اکثر کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتی تھی۔

ہماری تحقیق کے مطابق یہ تینوں ممالک، ایسے ممالک ہیں کہ نہ صرف اہم سوق الجیشی اور حساس مقام رکھتے ہیں، بلکہ بالفعل یا بالقوہ بڑی طاقتیں شمار ہوتی ہیں اور پوری تاریخ میں علاقہ اور بین الاقوامی سطح پر سرگرم کردار ادا کر چکی اور کر رہی ہیں۔ واضح ہے کہ انقلاب سے پہلے یا انقلاب کے بعد ان ملکوں میں انقلابی تبدیلیوں کے پیش نظر، دوسرے ممالک بالخصوص ہمسایہ اور منافع رکھنے والے ممالک ردعمل دکھائیں اور حکمراں سیاسی قدرت کے حق میں یا برخلاف مخالف اجتماعی گروہوں کی حمایت میں سرگرم ہو جائیں۔ بین الاقوامی ردعمل کا مسئلہ من جملہ اہم مسائل میں سے ایک ہے کہ انقلاب سے پہلے حکمراں سیاسی طاقت کی قدر و منزلت کے بارے میں کافی توجہ اور دقّت کی جانی چاہئے۔

فرانس کے بادشاہوں، لوئی پندرہ اور لوئی سولہ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں جو طولانی جنگیں اپنے ہمسایہ ملکوں، من جملہ آسٹریلیا، روس، انگلستان اور اسپین سے لڑیں، اس کے نتیجہ میں ان ممالک نے انقلاب کے دوران بحرانی حالات میں نہ صرف فرانس کی حمایت نہیں کی بلکہ ان تمام ممالک نے لوئی سولہ کو کمزور کرنے کے لئے کوششیں کیں اور مخالف گروہوں کی حمایت کی۔

اس لحاظ سے روس بھی فرانس کی نسبت کوئی خاص تفاوت نہیں رکھتا تھا۔ پہلی عالمی جنگ میں زار روس کی جرمنی، عثمانی اور جاپان سے براہ راست جنگ نے ان ملکوں، خاص کر جرمنی کی تازہ طاقتور حکومت کی دشمنی کو روس کے خلاف ابھارا، اس طرح کہ جرمنی کی حمایت اور پشت پناہی کی بناء پر لینن روس کے انقلابیوں سے جاملا اور اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بلشویکی انقلاب کے داغ بیل ڈالی۔

دوسری طرف سے زار روس کی اتحادیہ حکومتیں، یعنی فرانس اور انگلستان خود براہ راست جرمنی اور اس کے اتحادیوں سے جنگ میں ملوث تھیں، اس لئے زار روس کی کوئی حمایت اور مدد نہیں کرسکیں۔

لیکن ایران میں شاہ کی حکومت کو کم از کم اپنے زوال سے ایک دہائی پہلے سے بین الاقوامی معاشرہ میں دو قطبی نظام کے حالات کے باوجود، سرد جنگ کے خاتمہ اور آرام و صلح کے دور کے آغاز کے پیش نظر دونوں بڑی طاقتوں اور علاقہ کی حکومتوں کی طرف سے آخری دنوں تک حمایت حاصل تھی اور اس کے مقابلہ میں ایرانی انقلابیوں کو بین الاقوامی سطح پر کسی قسم کی حمایت حاصل نہیں تھی۔

اس طرح، جبکہ فرانس اور روس کی حکومتیں بین الاقوامی سطح پر حمایت کے سلسلہ میں نامناسب حالات سے دوچار تھیں اور یورپی ممالک ان دو ملکوں کی سلطنتی حکومتوں کے بارے میں مناسب نظریہ نہیں رکھتے تھے اور بعض ان کے ساتھ مخاصمت کی حالت میں تھے اور نہ صرف ان دو ملکوں کی کسی قسم کی حمایت نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض مواقع پر برعکس انقلابیوں کی حمایت کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ایران میں شاہ کی حکومت اس لحاظ سے مطلوب اور مناسب حالات سے گزر رہی تھی اور تقریباً مشرق و مغرب کی تمام طاقتیں اور ہمسایہ ممالک اس حکومت کی حمایت کرتے تھے، جب کہ کوئی بھی حکومت انقلابیوں کی حمایت نہیں کرتی تھی۔

۳۔ انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں حکومتوں کی پیچیدگی اور استحکام۔

صرف طاقت کے وسائل کی موجودگی، من جملہ اقتصادی اور فوجی طاقت اور بالقوہ اور بذاتہ بین الاقوامی حمایت، سیاسی طاقت کی حکمرانی کے استحکام اور پائیداری کے لئے کارآمد اور مفید ثابت نہیں ہوسکتی ہے، بلکہ سیاسی نظام میں مطلوب توانائی، مہارت اور مدیریت، بحرانی مواقع پر طاقت کے وسائل کو بالقوہ سے بالفعل میں تبدیل کر کے مناسب زمان ومکان میں بہترین صورت میں استفادہ کرسکتی ہیں۔ اکثر فوجی جنگوں میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ایک لائق اور قابل کمانڈر کم ترین وسائل، اسلحہ اور طاقت سے کافی وسائل اور اسلحہ سے لیس ایک نالائق اور ناتوان کمانڈر پر فتح پا سکتا ہے۔

فرانس اور روس کے نظام ظالم بادشاہوں کی بے لیاقتی اور دربار میں غیر صالح افراد کے نفوذ کی وجہ سے، اپنے منافع کو ہرگز تشخیص نہ دے سکے اور اپنی حکومت کو تحفظ اور پائیداری بخشنے کے لئے مناسب اور توانا مدیر مقرر کر کے ضروری تغیرات ایجاد نہ کرسکے۔ جبکہ شاہ کی حکومت ۳۸ سالہ پُر طلاطم دور سے گزرنے کے بعد رفتہ رفتہ خود اعتمادی اور مطلق حاکمیت کے مرحلہ میں داخل ہوئی تھی اور داخلی اور غیر ملکی مشاوروں، بالخصوص ساواک نامی ایک مخفی پولیس کے بل بوتے پر شاہ اپنی ظالمانہ حکومت کو تحفظ بخش کر اسے برقرار رکھنے کی ضروری توانائی رکھتا تھا۔

ایک نظریہ کے مطابق، ظالم حکومتوں کے نظام کمزور ہونے چاہئے تاکہ لوگوں کی ایک انقلابی تحریک رونما ہوکر کامیابی سے ہمکنار ہوسکے۔ حقیقت میں تاریخی لحاظ سے، عوامی بغاوتیں بذات خود ظالم حکومتوں کو سرنگوں کرنے کی قدرت نہیں رکھتی ہیں، بلکہ غالباً، باہر سے فوجی دباؤ کے ساتھ حاکم طبقہ کے درمیان تضاد اور سیاسی دھڑابندی، ظلم میں کمی اور بغاوتوں اور انقلابی تحریکوں کے لئے راستہ کھولنے کے لئے ضروری ہے۔

انہی کمزوریوں کی وجہ سے فرانس کے انقلاب میں حکمراں سیاسی نظام، عوامی مخالفت کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف ملک کے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مشکلات کو حل کرنے میں نظام کی مکمل ناکامی کی

وجہ سے مختلف طبقات کی تین مجلسیں تشکیل پائیں اور نظام نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔اس کے بعد عوامی تحریکیں اور اجتماعی گروہ تشکیل پائے اور نقلاب کو سرعت بخشی۔

اسی طرح روس کے انقلاب میں ،اگر چہ مخالف طاقتیں موجود تھیں ،لیکن بیسویں صدی کے اوائل سے اپنے خاص اور مختلف مقاصد کے لئے تشکیل پائے گروہ اور سیاسی پارٹیاں نہ صرف رومانوفوں کے نظام کے زوال میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکی تھیں بلکہ تصور بھی نہیں کرتی تھیں کہ روس کا سلطنتی نظام اتنی آسانی کے ساتھ سرنگوں ہوگا۔البتہ زار روس کی حکومت نے کافی دباؤ برداشت کرنے کے باوجود رضا کارانہ طور پر عوام کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔لیکن پتروگراد شہر میں کارخانوں اور صنعتی مراکز میں مظاہروں اور ہڑتالوں کے نتیجہ میں رونما ہوئے دھماکہ خیز اقتصادی بحران کے سامنے ہتھیار ڈال کر زار روس کی حکومت برف کے ایک پہاڑ کے مانند پگل گئی۔

لیکن ایران کا اسلامی انقلاب ایسی حالت میں کامیاب ہوا کہ شہنشاہی نظام قدرت، پائیداری اور استحکام کے لحاظ سے عروج پر تھا اور مخالفوں کے ساتھ آخری حد تک پوری قدرت کے ساتھ مقابلہ کرتا تھا اور عوامی گروہوں کو ایک منظّم منصوبہ بندی کے تحت تمام افراد کو جمع کر کے اور کافی تعداد میں لوگوں کی قربانی پیش کر کے ایسی طاقتور حکومت کو سرنگوں کرنا چاہئے تھا۔

دوسری فصل:

انقلاب سے پہلے ایران، فرانس اور روس
میں
سماجی طاقت کا موازنہ

الف) لوگوں کی شرکت

ب) رہبری

ج) آئیڈیالوجی

انقلاب سے پہلے تین ملکوں میں سماجی طاقت کا موازنہ

سماجی طاقت، ان سرگرم سماجی گروہوں سے تشکیل پاتی ہے جو مشترک اقدار اور عقائد کی بنیادوں پر آپس میں نزدیک ہوتے ہیں۔ جب سیاسی طاقت ان کے اقدار اور مطالبات کو پورا کرنے کی توانائی یا ارادہ نہیں رکھتی ہے، تو سماجی گروہ اس سے مأیوس ہو کر ایسے رہبر یا رہبروں کی تلاش کرتے ہیں جو ان کے نظریات اور مطالبات کو پورا کرسکیں۔ سماجی طاقت کی ایجاد میں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، تین بنیادی رکن قابل تشخیص ہیں: عوام، رہبری اور آئیڈیالوجی۔

الف) لوگوں کی شرکت۔

فرانس اور روس میں ظالم حکمرانوں کی سرنگونی کے سلسلہ میں لوگوں کی شرکت بہت کم تھی اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ، لوگوں کا کوئی اہم رول نہیں تھا[۱] اور فرانس کی حکومت اپنی کمزریوں کی وجہ سے تسلیم ہوئی۔

روس میں پطرزبورگ کے کارخانوں کے مزدوروں کی ایک محدود تعداد اور اسی شہر کی فوجی چھاونی کے فوجیوں نے بغاوت کی اور یہی مانوف خاندان کے زوال کا سبب بنے۔

۱۔ اس سلسلہ میں روبسپیر نے ایک دلکش مطلب بیان کیا ہے:

تقریباً تمام یورپی ممالک میں طاقت کے تین مراکز ہیں: بادشاہی، اعلی طبقہ کے لوگ اور عوام، کہ البتہ عوام فاقد قدرت ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ایک انقلاب صرف تدریجی مراحل کے نتیجہ میں رونما ہوسکتا ہے۔ وہ مراحل ایسے شرفاء، علماء اور دولتمندوں سے شروع ہوتے ہیں جن کی پسماندہ لوگوں کی طرف سے حمایت کی جاتی ہے۔ وہ بھي اس وقت جب ان کے منافع کا مسلط طاقت یعنی بادشاہی نظام سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فرانس میں پہلے شرفاء، علماء اور ثروتمندوں نے انقلاب کو اصلی تحرک بخشا اور لوگ بعد میں میدان میں اتر آئے جنھوں نے ابتدائی حرکت شروع کی تھی انہوں نے بعد میں توبہ کیا یا کم از کم جب دیکھا کہ ممکن ہے لوگ اقتدار پر قابض ہوجائیں تو وہ انقلاب کو روکنے کی آرزو کرنے لگے تھے۔ لیکن حقیقت میں یہ وہی تھے جنہوں نے انقلاب کا آغاز کیا اور ان کے غلط مقابلہ اور محاسبہ کے بغیر لوگ ابھی تک ظلم کے تسلط میں ہوتے۔

لیکن ایران کے اسلامی انقلاب میں[1]، جیسا کہ کتاب کے دوسرے حصہ میں وضاحت کی گئی، ایک محدود اقلیت اور شاہ کی حکومت سے وابستہ فوج کی اکثریت کے علاوہ تمام ملک کے شہروں اور دیہاتوں میں سماج کے تمام طبقات سے مربوط لوگوں نے متحد ہوکر ملک کے اقتصاد کے پہیہ کو ناکارہ بنادیا اور ہر لحاظ سے مسلح حکومت کے مقابلہ میں خالی ہاتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور سرانجام اسے سرنگوں کردیا۔ بعد کے مطالعات نے نشان دہی کی ہے کہ فرانس اور روس کے انقلابیوں کی کامیابی کے بعد جبکہ ظلم اور ڈکٹیٹرشپ کی زنجریں ٹوٹ گئی تھیں اور سیاسی آگاہی اور لوگوں کی شرکت کا ماحول پیدا ہوا تھا، رفتہ رفتہ اور انقلاب کے بعد والے اعتدال پسند یا انتہا پسند حکام کی بے رغبتی کی وجہ سے یہ شرکت کمزور پڑی۔ انقلاب کے بعد والی تاریخ اور لوگوں کی انتخابات میں شرکت کی تعداد سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن اسلامی انقلاب کے بعد مختلف اور مکرر انتخابات میں ایران کے لوگوں نے پے در پے شرکت کی اور یہاں تک بحرانی حالات اور شہروں پر بمباری کے دوران بھی اسلامی جمہوریہ کی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ضروری انتخابات نہ رکے اور نہ ہی ملتوی ہوئے۔

گزشتہ ۲۲ برسوں کے دوران ہمارے ملک کے عوام نے بائیس سے زیادہ انتخابات من جملہ صدر جمہوریہ، اسلامی پارلیمنٹ، مجلس خبرگان، اسلامی جمہوریہ کے نظام کے ریفرنڈم، آئین کے ریفرنڈموں اور بلدیہ کے انتخابات میں شرکت کی ہے۔ ان انتخابات میں لوگوں کی شرکت کی

1-George Brazilling,Newyork,1965,p.137.A History of Modern France, Alfred Cobban

تروتسکی اعتراف کرتا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ روس کا انقلاب بترو گراد کے توسط سے رونما ہوا اور باقی ملک نے اس کی پیروی کی تو مبالغہ نہیں ہے۔ بترو گراد کے علاوہ کہیں اور مبارزہ نہیں تھا...... انقلاب ایک ایسے شہر میں حرکت پیدا ہونے سے رونما ہوا کہ زیادہ سے زیادہ ملک کی آبادی کے سترویں حصہ کو تشکیل دیتا تھا اور تمام ملک ایک انجام پائے کام کے مقابلہ میں قرار پایا۔

T.H.green Comparative Revolutionary,

prenticehall,newjersey,busa,1974.p.49 Zagorin'theories of Revolution of Contemporary Historiography,political Science Quaterly,88,March 1973,p.34

روز افزوں تعداد نمایاں اور قابل توجہ ہے۔اس سے اہم تر یہ کہ ہر سال انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر اجتماعات اور مظاہروں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کی شرکت عوامی بیداری اور انقلاب کی حمایت کی علامت ہے۔

ب) رہبری

رہبر کا کردار اور اس کی شخصیت بالخصوص اس وقت واضح اور نمایاں ہوتی ہے جب انقلابی گروہوں کے نظریاتی مطالبات متفرق اور پراکندہ ہوں یا ان کا نظم وضبط کمزور ہو۔اس صورت میں رہبری کا رول اور اس کی اہمیت انقلاب کے مراحل کے ساتھ ساتھ وسعت پاتے ہیں۔

دوسری طرف سے انقلاب کے رہبروں کا رول تین اہم پہلوؤں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، جو یوں ہیں: انقلاب کا نظریہ پیش کرنے والا، کمانڈر اور بالاخر کامیابی کے بعد نظام کا معمار یعنی رہبر۔

زیر بحث تین انقلابوں میں رہبروں کے رول کی اجمالی تحقیق اور موازنہ سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ انقلاب کے اس رکن میں بھی عوامی رکن کے مانند، اسلامی انقلاب قدرت، امتیاز اور غیر معمولی خصوصیات کے لحاظ سے استثنائی حیثیت رکھتا تھا جس سے فرانس اور روس کے انقلاب محروم تھے۔

۱۔فرانس اور روس کے انقلابوں میں انقلاب کے رہبر معاشرہ کے متوسط اور اونچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ایران کے اسلامی انقلاب کے رہبر معاشرہ کے محروم اور پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

۲۔فرانس اور روس کے انقلابوں میں، بالخصوص روس کے انقلاب میں رہبر ایک ایسے طبقہ کے مدافع اور نمائندے تھے جس سے وہ خود تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن اسلامی انقلاب میں انقلاب کے رہبر ایسے طبقہ کے مدافع تھے جس سے خود تعلق رکھتے تھے۔

۳۔فرانس اور روس کے انقلابوں میں رہبری کی باگ ڈور تعلیم یافتہ اور روشن فکر طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور اونچے طبقہ کے لوگ اور روحانی انقلاب دشمنی کا رول ادا کرتے تھے۔جبکہ اسلامی انقلاب

میں انقلاب دشمن کا کردار دائیں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے روشن فکر انجام دیتے تھے، اور علماء ، انقلاب کی ہدایت اور رہبری کا رول ادا کرتے تھے۔

۴۔ فرانس اور روس کے انقلابوں میں ہم رہبری کی مذکورہ تین خصوصیتوں والے کسی شخص کا مشاہدہ نہیں کرتے ہیں جو اسلامی انقلاب کے رہبر کے مانند آئیڈیالوجی کو پیش کرنے، انقلاب کی کمانڈ سنبھالنے اور انقلاب کے بعد تعمیر و ترقی میں ہدایت کرنے کی صلاحیتوں کا مالک ہو۔

فرانس کے انقلاب میں، لافائیٹ، روبسپیر اور ڈوک ڈورلیان جیسے چہرے نظر آتے ہیں کہ ان میں کسی ایک نے انقلاب کے دوران اور اس کی کامیابی کے بعد پوری مدت میں مکمل طور پر انقلاب کی رہبری نہیں کی ہے۔

روس کے انقلاب میں معروف اور نمایاں چہرہ ''لینن'' ہے۔ وہ حقیقت میں امتیازات استعداد اور غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا اور اس نے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی کامیابی میں مرکزی اور اصلی کردار ادا کیا، جبکہ اسی سال فروری میں رومانوف خاندان کی حکومت کے زوال میں بالکل کوئی رول ادا نہیں کیا۔ زینوولیف، کامنف، استالین، تروتسکی اور کرنسی جیسے چہرے بھی خاص شہرت رکھتے تھے لیکن انہوں نے بھی حکومت کے زوال میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ حقیقت میں زار حکومت کا زوال ایک خود بخود وجود میں آئی حرکت کے نتیجہ میں اور رہبری کے بغیر انجام پایا۔

خلاصہ کے طور پر ہمارا مطالعہ یہ بتاتا تھا کہ فرانس اور روس کے انقلاب میں سے کسی ایک میں بھی ہم کسی ایسے چہرہ کو نہیں پاتے جس میں نظریہ پیش کرنے اور انقلاب کی کمانڈ سنبھالنے کی خصوصیات موجود ہوں۔ جن اشخاص کا ہم نے نام لیا ان میں سے کوئی بھی انقلاب کا نظریہ پیش کرنے والا نہیں تھا اور نہ اس کو کنٹرول کرنے والا، بلکہ یہ انقلاب کے بعد والی حکومتوں کے معمار تھے۔ وہ ایسے اشخاص تھے جنہوں نے نظام کے زوال کے بعد اقتدار ہاتھ میں لے لیا اور بعد والے حالات پر اثر ڈالا۔ جبکہ اسلامی انقلاب میں رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ نے ایک دینی مرجع تقلید کی حیثیت سے اور اپنی غیر معمولی ذہانت، قدرت اور بے مثال خصوصیات کے پیش نظر ۲۵ سال کی مدت میں

نظریہ پیش کرنے والے، کمانڈر اور انقلاب کے معمار کا عہدہ احسن طریقے پر سنبھال کر اپنا کردار ادا کیا۔

ج) آئیڈیالوجی۔

انقلاب سے پہلے تینوں ملکوں کے معاشروں اور نظام میں مشروعیت اور استحکام کا واحد سبب بادشاہی ادارے تھے، جو انقلاب کی حالت میں بے اعتبار ہو چکے تھے، اس لئے انقلاب کی آئیڈیالوجیاں اس امر کی ذمہ دار تھیں کہ نئی بنیادوں پر حکومت کی داغ بیل ڈال کر اس کی توجیہ اور استدلال کریں۔ ضمناً بیان شدہ مکاتب فکر چیدہ انقلابی افراد کی مدد کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو مبارزے اور سیاسی سرگرمیوں کی طرف تحریک کرنے کے لئے ضروری استحکام اور نظم وضبط بخشیں۔

زیر نظر انقلابوں پر حاکم آئیڈیالوجی کی اجمالی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس اور روس میں لیبرل ازم اور مارکسیزم کے مکاتب فکر مادی نقطہ نظر سے اپنے پیروکاروں کے لئے اسی دنیا میں صرف ایک ہی زاویہ میں ایک محدود افق فراہم کرتے تھے اور فرانس اور روس کی بادشاہی حکومتوں کی سرنگونی کے لئے کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتے تھے اور یہاں تک کہ مذکورہ نظاموں کے زوال کے بعد اپنے اقدار اور معیاروں کو بروئے کار لانے میں مشکلات سے دوچار ہوئے اور اپنے نظریات میں کافی حد تک تبدیلی لانے میں مجبور ہوئے۔ دوسری طرف سے دونوں مکاتب فکر فرانس اور روس کے لوگوں کے لئے اجنبی تھے، اور عام لوگوں کے عقائد سے تضاد رکھتے تھے، جو غالباً مذہبی تھے۔ لہذا یہ آئیڈیالوجیاں معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لئے اتحاد و یکجہتی کا سبب نہیں بن سکیں اور صرف روشن فکر طبقہ کی آئیڈیالوجی کے طور پر باقی رہیں۔

جبکہ مکتب اسلام ۱۴۰۰ سال قبل ایران میں پہنچا تھا اور لوگ اس سے مانوس تھے اور تمام لوگ اس کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس کے ساتھ زندگی بسر کر چکے تھے اور اسلام نے ان کے تانے بانے میں اثر و نفوذ کیا تھا۔ الٰہی تصور کائنات کے پیش نظر یہ مکتب اپنے پیروکاروں کے لئے ایک وسیع افق فراہم کرتا ہے اور اخروی سعادت کی نوید دینے کے علاوہ اسی دنیا کی مختصر مدت کے لئے بھی روزمرہ زندگی

کے انفرادی اور اجتماعی امور میں ضروری لائحہ عمل اور راہنمائی فراہم کرتا ہے۔اس کے علاوہ دنیوی سعادت حاصل کرنے اور معاشرہ کا نظم ونسق چلانے کا دستور العمل بھی فراہم کرتا ہے، بالخصوص شیعہ مکتب فکر نے اپنے انقلابی موقف کے پیش نظر ایران کے اسلامی انقلاب کے مراحل کے لئے مناسب راہ ہموار کی تھی۔

فرانس اور روس کے انقلاب نہ صرف حکومت کے خلاف بلکہ روحانیت اور کلیسا کے خلاف بھی اٹھے تھے۔فرانس میں کلیسا فرانسیسی ہوگیا اور واتیکان کے پاپ کے دائرۂ اختیار سے خارج ہوگیا۔روس میں کلیسا مسترد اور مغلوب ہوگیا۔جبکہ ایران کے اسلامی انقلاب میں تمام شیعہ علماء نے حکومت کے خلاف قیام کرکے انقلاب کی رہبری کی۔

اسلامی انقلاب کی آئیڈیالوجی کی کامیابی،ایران کے انقلاب کی قدر ومنزلت کی علامت تھی۔یہ آئیڈیالوجی عصر حاضر کے سیاسی مطالبات اور مادی مکاتب سے مأیوسی کا قوی جواب تھا۔یہ آئیڈیالوجی مذہب سے مقابلہ کرنے والے کمیونزم پر قابل توجہ امتیاز رکھتی تھی۔اسلامی انقلاب نے کمیونزم کے مانند مذہب کی جگہ پرنئی چیز تخلیق کرنے کے بجائے موجود سرگرم مذہب سے استفادہ کیا اور سیاسی میدان میں جنگ کے لئے ضروری آئیڈیالوجی کے اسلحہ سے لیس ہوا اور اس کام سے،عالمی تاریخ کی ایک بڑی اور ممتاز مدد کی۔

ایک امریکی قلم کار ''زارگورین'' کے کہنے کے مطابق :اگرکوئی آج یہ پوچھ لے کہ مارکس کی انقلابی تھیوری میں کونسی چیز معتبر ہے اور کونسی چیز معتبر نہیں ہے،تواس کا جواب یہ ہونا چاہئے کہ اب وہ تھیوری گزشتہ تاریخ سے مربوط ہے،مارکس کے نظریہ کا غیر متناسب ہونا اس وقت واضح ہوا،جب مارکس کی پیش بینی کے خلاف،ترقی یافتہ ترین مغربی ممالک میں انقلاب رونما نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس پسماندہ ترین کسان معاشروں،یعنی روس اور چین میں سوشلزم جاری ہوا۔بہت سے انقلابوں کے بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیقات کرنے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مارکس کا پیش کیا ہوا نمونہ حد سے زیادہ سادہ لوحی کی وجہ سے قابل استفادہ نہیں ہے اور حقیقت میں انقلابوں کو بیشتر درک کرنے میں ایک رکاوٹ ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے راز کو صرف، انقلاب کے تین ارکان ،یعنی عوام، رہبری اور مکتب کی عظمت، مدیریت اور وسیع کارکردگی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ تجزیہ نگاروں کی توقعات اور محاسبات کے برعکس اس انقلاب نے ایک طاقتور اور قدیمی شہنشاہی نظام کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر کے سرنگوں کیا اور دنیا والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

فرانس اور روس کے انقلابوں کی کامیابی، انقلابی افراد کے اتحاد و یکجہتی اور طاقت کے نتیجہ میں نہیں تھی، بلکہ برسر اقتدار حکام کی بنیادوں میں کمزوری کی وجہ سے تھی جس نے حکومتی عمارت کو بوسیدہ بنا دیا تھا۔ فوجی اور اقتصادی بحرانوں اور بین الاقوامی دباؤ نے اس کمزوری کو شدید تر کر دیا تھا، یہاں تک کہ سیاسی نظام کے زوال کو ناقابل اجتناب بنا دیا۔

حقیقت میں مخالف سماجی گروہ، سیاسی قدرت اور حاکمیت کے خلاء کی حالت میں بکھرے ہوئے نظام کے وارث بن کر میدان میں آگئے اور انقلابی افراد کے عنوان سے مقابلہ اور کوشش کے نتیجہ میں اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔[۱]

۱۔ امریکی مصنف ٹڈا اسکا چپول، فرانس، روس اور چین کے انقلابوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

''فرانس، روس اور چین نے انقلاب سے پہلے ایسی سلطنتیں تاسیس کی تھیں جو نچلے درجہ کے طبقات کی طرف سے شروع ہونے والی بغاوتوں کے مقابلہ میں اپنی اور حاکم طبقہ کی برتری کے تحفظ کے لئے ضروری قدرت رکھتی تھیں۔ اس لئے سماجی انقلاب رونما ہونے سے پہلے، ان حکومتوں کی عسکری اور اجرائی طاقت بکھرنی چاہئے تھی۔ جب فرانس (۱۷۸۹ء)، روس (۱۹۱۷ء) اور چین (۱۹۴۸ء) میں انقلابات رونما ہوئے تو وہ اس لئے نہیں تھے کہ سابقہ حکومتوں کے دوران اس مقصد کے لئے انقلابیوں اور طاقتور سیاسی گروہوں کی طرف سے آگاہانہ اقدامات کئے گئے تھے، بلکہ سیاسی انقلابی بحران فوجی اور اداری سسٹم کے بکھر جانے سے وجود میں آیا ہے اور یہ بحران بھی اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب شہنشاہی حکومتیں متعدد دباؤ، جیسے فوجی مخالفتوں یا بیرونی طاقتوں کے نفوذ اور سیاسی اداروں کی ناکامی کی وجہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ چونکہ موجودہ نظام کے لئے انقلابی بحرانوں کے علاوہ فوجی اور بین الاقوامی دباؤ کو برداشت کرنا ناممکن بن جاتا ہے، اس لئے بحرانوں کے سامنے حکومتیں سرنگوں ہوتی ہیں۔''

مزید کہتا ہے کہ:

''تحت تسلط ممالک میں سماجی انقلابوں کے طریق کار ایسے حالات میں تشکیل پاتے ہیں کہ نہ صرف فوجی دفاع اور بالفعل بیرونی حملوں کے تقاضوں کے لئے ہوتے ہیں، بلکہ اس طرح براہ راست بیرونی فوجی اور اقتصادی امداد کے اثر میں ہوتے ہیں۔ کامیاب ہوئے انقلابی لیڈروں کی اکثر ایسی مددان بیرونی طاقتوں کی طرف سے ہوتی ہے جو جدید سیاسی نظام میں اپنا نفوذ کرنا چاہتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اسلامی انقلاب، فرانس اور روس کے انقلابوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ عظمت کا مالک تھا۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی، اساسی۔اکیڈمک مراکز میں حیرت کا سبب بنی کیونکہ گزشتہ انقلابوں کے مطالعات کی بنیاد پر، کسی صورت میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ایران میں اس قسم کا حادثہ رونما ہوگا۔

اس سلسلہ میں ٹڈااسکاچپل کہتا ہے:

''شاہ کی حکومت کا زوال اور ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک ایران کی انقلابی تحریک کا آغاز غیر ملکی ناظرین کے لئے ایک اچانک حیرت کا سبب تھا۔شاہ کے دوستوں سے لے کر اخباری نمائندے اور سیاسی واجتماعی علوم کے دانشور، من جملہ مجھ جیسے انقلاب کے ماہر، سب کے سب اس انقلاب کے حوادث کا تعجب اور ناقابل یقین حالت میں مشاہدہ کررہے تھے۔اس سے بڑھ کر، ایران کا انقلاب قاعدہ اور طبیعت کے بالکل خلاف ایک حادثہ تھا۔یہ انقلاب یقیناً ایک سماجی انقلاب ہے بہرحال انقلاب کے عمل، بالخصوص شاہ کے زوال کا سبب بننے والے حوادث نے فرانس اور روس کے انقلاب کے بارے میں ہمارے تقابلی مطالعہ کی بنیاد پر پیش کئے گئے اسباب وعلل کو مسترد کردیا۔ایران کا انقلاب واضح طور پر ایک عوامی انقلاب تھا اور اس انقلاب نے ایرن میں ثقافتی، اجتماعی اور اقتصادی، اجتماعی روابط کی بنیادوں میں اس قدر تبدیلی ایجاد کی کہ حقیقت میں یہ عظیم اجتماعی، تاریخی انقلابوں کا ایک نمونہ ہے[1]''

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم فرانس اور روس کے انقلابوں کا نام عظیم انقلاب رکھیں تو اسلامی انقلاب کا کیا نام رکھیں؟ اگر اسلامی انقلاب ایک حقیقی انقلاب ہے تو، فرانس اور روس میں رونما ہونے والی چیز کا کیا نام رکھا جائے؟ بظاہر اسکاچپل کا کہنا حق ہے کہ: فرانس اور روس کے

1.Theda Skocaopol "Rentiorstate and Shia Islam in the Iranian Revolution" Theory society USA vol.no.11.3'p284'1982

انقلاب آ گئے اور ایجاد نہیں کئے گئے۔ ایران کا اسلامی انقلاب نہیں آیا بلکہ موجودہ حالات کے پیش نظر ایجاد کیا گیا، وہ بھی نہ سادگی میں بلکہ تمام ملک کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھر پور کوششوں، قدرتمند رہبری اور دسیوں ہزار انقلاب کے عاشقوں کی عظیم قربانیوں کی بھاری قیمت ادا کر کے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے رونما ہونے اور کامیابی نے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

خلاصہ اور نتیجہ

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ، اسلامی انقلاب کے نظریاتی ڈھانچہ کو پیش کر کے اس کے مختلف ابعاد اور ادوار کا جائزہ لیا جائے اور اجمالی طور پر اس کے پس منظر اور نتائج بیان کئے جائیں اور آخر میں دنیا کے دو بڑے انقلابوں سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ فطری بات ہے کہ کتاب کے حجم کے پیش نظر اس عظیم تاریخی حادثہ کے تمام ابعاد اور زاویوں کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں تھا اس لئے تمام موضوعات میں اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ پھر بھی اہم مسائل میں سے بہت کم ایسے ہیں جن سے چشم پوشی کی گئی ہے اور قارئین کو ان سے مربوط منابع کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اسلامی انقلاب کے بارے میں ہمارا تجزیہ ۱۹۹۷ء، یعنی حقیقت میں انقلاب کی دوسری دہائی کے اختتام تک محدود ہے اور ہم نے تیسری دہائی بالخصوص جناب سید محمد خاتمی کے صدر جمہوریہ کے طور پر منتخب ہونے کے بعد داخلی سیاسی میدان میں رونما ہوئی تبدیلیوں، من جملہ سیاسی ترقی، شہری معاشرہ کے وجود میں آنے اور تمدنوں کی گفتگو کے بارے میں بحث و تحقیق نہیں کی ہے۔ اس دور کے بارے میں تحقیق و تجزیہ کے لئے کافی وقت گزرنے اور اس کے جاری شدہ پروگراموں کے آثار و نتائج واضح ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں ہر قسم کی پیش بینی اور فیصلہ کرنا جلد بازی ہوگی۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کا دو دہائی سے زیادہ عرصہ گزر رہا ہے، اس مدت کے دوران ایران کے انقلابی معاشرہ میں پے در پے اور حیرت انگیز حوادث اور اتفاقات رونما ہوئے ہیں۔ ان حوادث کے نتیجہ میں بالخصوص پہلی دہائی کے دوران اس انقلاب کے پیکر پر لگی ضربوں میں سے ہر ایک ضرب کسی بھی معاشرہ کے عام حالات میں ہر سیاسی اور حکومتی نظام کے زوال کے اسباب فراہم کر سکتی تھی۔ لیکن اسلامی انقلاب ہر سطح پر کافی تعداد میں اپنے مؤمن افراد کو کھو دینے کے نتیجہ میں عظیم نقصانات سے دوچار ہوا، لیکن داخلی اور خارجی سازشوں کے ذریعہ پیدا کی گئی ان مصیبتوں اور ضربوں کو

برداشت کیا اور انقلاب کے حوادث و اتفاقات کے امتحانی میدان سے کامیابی حاصل کر کے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر باہر آ گیا۔

مذکورہ دو دہائیوں کے حوادث کی تاریخ شائد ایک ملک کے عام حالات کی ایک صدی کے نشیب و فراز والے حوادث کی تاریخ کے برابر ہے۔ امید ہے کہ مورخین ایک دن ان تمام حوادث کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کریں گے اور ان کے مختلف ابعاد و زاویوں کا جائزہ لیں گے۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی، شاہ کی حکومت کی سرنگونی اور اسی طرح انقلاب کے بعد مشکلات اور مصائب پر کامیابی حاصل کرنا، تمام دنیا بالخصوص اسلامی ممالک میں وسیع پیمانے پر انعکاس کا سبب بنا۔ اس طرح کہ دنیا کی بڑی طاقتیں پریشان ہو گئیں کہ بیسویں صدی کے اس نئے اور عجیب موجود سے کیسا برتاؤ کریں اور وہ اسے ایک ناقابل انکار حقیقت کے عنوان سے قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔

اسلامی انقلاب کی معرفت اور اس کے ساتھ برتاؤ کے سلسلہ میں مغربی ممالک میں سیمناروں، کانفرنسوں اور سیاسی میٹینگوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور یہ بذات خود اسلامی انقلاب کے دشمنوں کی توجہ اور پریشانی کی علامت ہے۔ لیکن آج اسلامی انقلاب کے دوست و دشمن اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی انقلاب مستحکم اور پائیدار رہا ہے اور اسلامی جمہوریہ کا نظام، عالمی سامراجی طاقتوں کی طرف سے، سازشوں، تختہ الٹنے کی بغاوتوں، فوجی حملوں، اقتصادی محاصروں اور دوسری تمام آزمائی گئی ریشہ دوانیوں سے ناقابل شکست و زوال ہے۔

دنیا کے اکثر ممالک، اس حقیقت کو قبول کر کے اسلامی جمہوریہ کے طولانی مدت تک باقی رہنے کی بنیاد پر اس کے ساتھ اپنے سیاسی و اقتصادی روابط کو منظم کر رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اب دنیا کی سامراجی طاقتوں کے سامنے اسلامی جمہوریہ کے نظام کے فوری نابود ہونے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ اس انقلاب کو کس طرح اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر محصور اور محدود کیا جائے اور دوسرے معاشروں بالخصوص اس کے ہمسایہ ممالک میں اس کے پھیلنے میں رکاوٹ ڈالی جائے، لیکن وہ اپنے ان عزائم میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے آج

کل اسلامی انقلاب کو اسلامی شدت پسندی کا نام دے کر ایک خطرہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی ممالک مکتب اسلام کی پیروی کرنے کو سامراجی ظلم کے چنگل سے آزادی کا تنہا راستہ سمجھتے ہیں۔

البتہ ہمیں طولانی مدت کے دوران اسلامی ایران، دوسرے الفاظ میں ام القرائے اسلام میں انقلاب کے انحراف اور شکست کے اسباب فراہم کرنے والے عوامل سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ جس طرح امام خمینیؒ نے بارہا اطمینان دلایا ہے کہ یہ انقلاب بیرونی حملوں اور سازشوں کے اثر میں شکست نہیں کھائے گا، بلکہ اس کے علاوہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ داخلی انقلاب دشمن عناصر کی کاروائیاں بھی انقلاب کو براہ راست شکست دینے کی طاقت نہیں رکھتیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ داخلی اور خارجی انقلاب دشمن عناصر انقلاب کو ناکام کرنے کی اپنی طولانی مدت کاروائیوں سے منصرف ہوئے ہیں۔ بلکہ انقلاب کی آفتوں کے پیش نظر، کہ ہر انقلاب کو اندر سے کھوکھلا کرسکتی ہیں اور اس کے ظاہر کا تحفظ کرتے ہوئے اس کے اصلی مفہوم و معنی کو ختم کرسکتی ہیں، طولانی مدت کے دوران انقلاب کو اپنے اصلی راستہ اور مقاصد سے منحرف کرسکتی ہیں۔

جیسا کہ انقلاب کے نظریاتی ڈھانچہ کو پیش کرتے ہوئے پہلے بیان کیا گیا، کہ ہر انقلاب آفت سے دوچار ہوسکتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آفت تدریجاً انقلاب کو اندر سے صدمہ پہنچانے اور اسے بوسیدہ کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ بالخصوص جب انقلاب سیاسی نظام میں تبدیل ہوجائے، تو آفت کا خطرہ کئی گنا بڑھ کر، حقیقت میں ناقابل اجتناب بن جاتا ہے۔ اگرچہ اسلامی انقلاب ضرورتاً سیاسی ادارے میں تبدیل ہوگیا ہے، لیکن اسلامی جمہوریہ کے نام پر نظام قائم ہونے کے باوجود اپنی انقلابی حالت کو محفوظ کئے ہوا ہے اور عالمی سطح پر اس کی نشو ونما روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

اس کے باوجود آفات سے مقابلہ اور مبارزہ کرنے میں غفلت اور کوتاہی ہر انقلاب کو، جس قدر بھی وہ قوی اور کامیاب ہو، زوال سے دوچار ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے ان آفات کو

پہچاننے کے لئے ہوشیاری اور دقت، دوسرے الفاظ میں اسلامی انقلاب کو پہنچنے والے نقصانات، کی پہچان کرنا، نظام کے تمام ذمہ داروں، یہاں تک انقلاب کے معتقد ہر ایک فرد کا فریضہ ہے۔

یہاں پر اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ انقلاب کی آفتوں اور اسے پہنچنے والے نقصانات کے بارے میں بھی ہر جہت سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کتاب میں اس کی وضاحت کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی چونکہ خاص اور بنیادی آفات اور نقصانات کا اجمالی ذکر کئے بغیر کتاب کے مصنف کا فریضہ ادھورا رہتا ہے، اس لئے میں نے اپنے لئے ضروری سمجھا کہ کتاب کے آخر میں اس موضوع کے بارے میں خلاصہ کے طور پر ایک فہرست پیش کروں۔

اسلامی انقلاب کو پہنچنے والے نقصانات کی پہچان

انقلاب کو پہنچنے والے نقصانات کی پہچان کی بنیادی شرط، انقلاب کی کامیابی، اقتدار اور دوام کے علل واسباب پر توجہ کرنا ہے۔ جیسا کہ انقلاب کی تھیوری کے حصہ میں بیان ہوا، ایک انقلاب اپنے مطلوب کمال کی حد تک پہنچنے کے لئے تین بنیادی رکن رکھتا ہے، کہ عبارت ہیں: ایک متلاشی اور انقلابی آئیڈیالوجی اور مکتب، لوگوں کے تمام طبقات کی وسیع، سرگرم اور ایثار پر مبنی شرکت اور ایک غیر معمولی ذہانت کے مالک، قدرتمند، مضبوط، دلیر اور جرائتمند رہبر کا وجود۔

گزشتہ بحثوں میں اور اسی طرح دوسرے انقلابوں سے اسلامی انقلاب کے موازنہ میں واضح ہوا کہ اسلامی انقلاب مذکورہ تینوں ارکان میں مکمل اور بے مثال عظمت کا مالک تھا اور حقیقت میں خواہ سابقہ حکومت اور ان کے خارجی حامیوں کے مقابلہ میں، یا انقلاب دشمن عناصر اور داخلی و خارجی دشمنوں کے مقابلہ میں مذکورہ تین ارکان پر بھروسہ کر کے بدستور کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

اس طرح نظام وانقلاب کی قدرت کے ان تین بنیادی ارکان کی حفاظت انقلاب کے دوام اور پھیلاؤ کا سبب بن سکتی ہے اور جس قسم کا بھی صدمہ ان تین ارکان کو پہنچے گا، وہ انقلاب کی لئے تدریجی زوال کا باعث بن سکتا ہے۔ انسانی معاشروں کی تاریخ میں اقتدار کا عروج اور اس کا زوال، خواہ اسلامی معاشروں میں یا غیر اسلامی معاشروں میں، بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

دوسری طرف سے انقلاب کے دشمن بھی اس انقلاب کی کھل کر مخالفت کرنے سے ناامید ہوئے ہیں، لہذا یہ عناصر انقلاب کی آفتوں کو ایجاد کرنے اور انھیں تقویت بخشنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھیں گے۔ اس لئے نظام کے حامیوں اور ذمہ داروں کا فریضہ ہے کہ جتنا ممکن ہو سکے، صحیح طور پر ان آفتوں کو پہچاننے کے لئے اقدام کر کے ان کا مقابلہ اور علاج کریں اور اس سلسلہ میں خاص حساسیت دکھائیں اور جان لیں کہ کوئی بھی انقلاب اس کی آفتوں سے مسلسل مبارزہ کئے بغیر اقتدار پر قائم رہ کر اس کی کامیابیوں اور ماحصل کو ضمانت نہیں بخش سکتا ہے۔ مزید آگاہی کے لئے خلاصہ کی رعایت کرتے ہوئے ہم ذیل میں انقلاب کے مذکورہ تین ارکان کے دائرہ میں ان آفتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے:

ا۔ آئیڈیالوجی کی زاویہ سے

آئیڈالوجی یا مکتب انقلاب، حقیقت میں انقلابی معاشرہ کی جان ہے اور انقلابی معاشرہ کو ضروری تحرک اور سرگرمی بخشتی ہے۔ چونکہ اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اس کے دوام میں اسلام، بالخصوص مکتب اہل بیت (ع) کا اصلی اور بنیادی کردار تھا، اس لئے اس انقلاب کی خصوصیات کو تحفظ اور تقویت بخشنے کے لئے اور مکتب انقلاب سے اس قدرت کو سلب کرنے والے نفوذ اور افکار کو روکنے کا کام انقلابیوں کے فرائض اور پروگراموں کا سرلوح ہونا چاہئے۔ یہ وہی مکتب ہے جسے امام خمینیؒ نے خالص محمدی (ص) اسلام کا نام رکھا ہے۔

اس انقلاب کو پہنچنے والے نقصنات گوناگوں ہیں اور یہاں پر ہم ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کریں گے:

غیر سیاسی اسلام، من پسند اسلام، اور لیبرل اسلام کی ترویج، من جملہ آفات ونقصانات میں سے شمار ہوتے ہیں کہ ان کا ہوشیاری سے مقابلہ کرنا چاہئے اور ان کے اثر ونفوذ کو روکنا چاہئے۔ اس کے علاوہ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ زمانہ کے گزرنے اور علمی اور ٹکنالوجی کے میدان میں سرعت کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں اور نئے موضوعات اور موجود کے وجود میں آنے کے پیش نظر اس مکتب کو

ضروری مخالفتوں کا حامل ہونا چاہیئے تا کہ دنیا میں رونما ہونے والے نئے مسائل اور مظاہر کا جواب دے سکے۔ روزمرہ حقائق سے ہر قسم کی پہلوتہی اور بے توجہی اس امر کا سبب ہوسکتی ہے کہ انقلاب کی آئیڈیالوجی میں بے حسی اور رجعت پسندی کی حالت پیدا ہو کر زمانہ سے پیچھے رہے، لیکن خوش بختی سے مکتب تشیع میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہونے کے پیش نظر، یہ توانائی اور امید موجود ہے کہ اس سلسلہ میں ہمارے دینی علماء، امام خمینیؒ کے مانند اپنی رسالت کو انجام دیں گے اور خالص اسلام یعنی مکتب انقلاب کے لئے شائستہ محافظیں ثابت ہوں گے۔

۲۔ قیادت کے زاویہ سے

انقلاب میں امام خمینی (رہ) کے اختراعات میں سے ایک، ولایت فقیہ کی اصل اور اسی کی بنیاد پر سیاسی نظام کی تشکیل دینا ہے۔ حقیقت میں ولایت فقیہ انقلابی خیمہ کا ستون ہے اوگزشتہ دو دہائیوں کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس اصول کے بغیر، اسلامی انقلاب اور اس کے نئے وجود میں آئے نظام میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ اس اصل کو کمزور کرنے کے لئے جو بھی تفسیر یا اقدام کیا جائے، وہ انقلاب کی رہبری کو سست کرنے کا سبب ہوسکتا ہے اور انقلاب کو نابودی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ دوسرے انقلابوں کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ انقلاب کے رہبر کی وفات اور رہبری کی بنیادیں مستحکم نہ ہونے کی وجہ سے، جانشینوں کے درمیان کشمکش اور لڑائی ایجاد ہوئی ہے اور سرانجام انقلاب مکمل ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہوا ہے۔ جبکہ اسلامی انقلاب میں ولایت فقیہ کی اصل کا مستحکم اور پائدار بن جانے کی وجہ سے، امام (رہ) کی رحلت نے رہبری کے رکن میں کسی قسم کا خدشہ ایجاد نہیں کیا اور کسی کشمکش اور لڑائی جھگڑے کے بغیر انقلاب کے رہبر کا انتخاب عمل میں آیا۔

حالانکہ نظام کی قیادت ولایت فقیہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ حکومت کے عہدہ داروں اور سیاسی و مذہبی افراد کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہے۔ خاص کر اسلامی انقلاب میں علماء اور روحانیوں کے ناقابل انکار رول کے پیش نظر، اس طبقہ کو صدمہ پہنچنا، نظام کی کارکردگی عوام اور نظام کے مجموعہ کے درمیان رابطہ پر براہ راست اثر ڈال سکتا ہے۔ نظام کے عہدہ داروں کی ہر قسم کی اپنی اور اپنے خاندان کے لئے

خصوصی مراعات حاصل کرنا، اداری بد نظمی، گراں بازاری اور سرانجام موقع پرست فریب کاروں اور غیر معروف اجنبی عوامل کا نفوذ من جملہ نقصانات ہیں جو نظام کو نابود کرنے کے اسبات فراہم کر سکتے ہیں اور اسلامی انقلاب کو اُسی انجام سے دوچار کر سکتے ہیں جس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلامی حکومت دوچار ہوئی ہے۔

۳۔ عوامی زاویہ سے

اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ نقلاب کے سلسلہ میں وسیع پیمانہ پر لوگوں کی شرکت انقلاب کی کامیابی اور انقلاب دشمن عناصر کو ناکام بنانے کے اصلی اور اہم عومل میں سے تھی۔ عصر حاضر کی تاریخ کے اکثر انقلاب لوگوں کے انقلاب میں نمایاں رول کے باوجود، انقلاب کی کامیابی کے بعد لوگوں کی حمایت سے محروم ہو کر انقلابی نظام شخصی اور طولانی ڈکٹیٹر شب میں تبدیل ہوئے ہیں۔ لیکن اسلامی انقلاب میں حضرت امام خمینیؒ نے قدرت ونفوذ کے مالک ہونے اور ان کا کلام لوگوں کے لئے حجت ہونے کے باوجود، کوشش کی کہ ہدایت وآگاہی دلانے کے ضمن میں لوگوں کو میدان میں حفظ کر کے انھیں سرگرم رکھیں اور لوگوں کی یہ سرگرم شرکت، معاشرے کے مدیروں کے انتخاب اور محاذ جنگ میں داخلی اور خارجی دشمنوں سے لڑنے اور خطرات کو دور کرنے کے لئے افراد کو آمادہ کرنے کے سلسلہ میں ابھی تک جاری ہے۔ لوگوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ یہ انقلاب ان کا اپنا انقلاب ہے۔ لوگوں کو سیاسی میدان سے دور رکھنے کے لئے جو بھی کوشش کی جائے وہ انقلاب کے لئے قطعی ویقینی نقصان کا سبب ہوگی۔

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ دونسلوں کے درمیان تعلقات کا مسلسل فقدان معاشرہ کے لئے، بحران اور مشکلات کا سبب بنتا ہے اور دونسلوں کے درمیاں تعلقات میں فاصلہ اور ایک دوسرے کو درک کرنے کا فقدان، من جملہ ان نقصانات میں سے ہے اور اس لحاظ سے انقلابی معاشروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر انقلابی نسل اپنے انقلابی تفکر اور آرزؤں کو اپنی بعد والی نسل، جن کے سامنے انقلاب سے پہلے اور بعد والے حوادث کی کوئی واضح تصویر نہیں ہوتی ہے، میں منتقل نہ کر سکے تو اس

بحران سے دوچار ہوگی اور دشمن اسی فاصلہ سے استفادہ کر کے ان دونسلوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا سکتا ہے۔

تربیت اور مسلسل آگاہی نہ دینا، آرام طلب افکار کا نفوذ، رہبروں اور عوام کے درمیان فاصلہ ایجاد ہونا، لوگوں میں اس فکر کا پیدا ہونا کہ حاکم نظام نہ ان کی خدمت میں ہے اور نہ ان سے متعلق ہے اور امتیازی سلوک اور بے انصافی کا پیدا ہونا، جو طبقاتی فاصلہ ایجاد ہونے کا سبب بنتا ہے، بھی ان آفتوں میں سے ہیں جو ایک انقلابی معاشرہ کو رفتہ رفتہ بے خیال اور بالاخر ناراض لوگوں پر مشتمل معاشرہ میں تبدیل کر کے انھیں حکومت کے مقابلہ میں قرار دے سکتے ہیں۔

البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان آفتوں سے مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن انفرادی یا اجتماعی طور پر ایک مسلسل اور دائمی مبارزہ ان آفتوں کے خطرات کو کم کرسکتا ہے۔ یہ معاشرہ کے مفکرین، خواص اور رہبروں کی ذمہ داری ہے کہ نہ صرف ان آفتوں کی پہچان کریں بلکہ ان سے مقابلہ کر کے انھیں نابود کرنے کا راستہ بھی دکھائیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ جو عوامل آج تک انقلاب کی کامیابی اور اسے تحفظ بخشنے کا سبب بنے ہیں، ان میں لوگوں کا اتحاد و اتفاق کے ساتھ میدان میں حاضر رہنا، اسلامی اقدار اور معیاروں کی پابندی اور رہبری کی پیروی تھی۔ ہماری قوم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ انقلاب نے کامیاب ہوکر داخلی اور خارجی سازشوں پر قابو پالیا ہے، لہذا ان کی ذمہ داری تمام ہوگئی ہے اور انھیں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہونا چاہئے۔ اس چیز کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اسلامی انقلاب پہلے سے معین کئے گئے اپنے تمام داخلی اور خارجی مقاصد بالخصوص ثقافتی مقاصد کو ابھی حاصل نہیں کرسکا ہے اور صرف امت حزب اللہ کا مسلسل حضور اور حفظ ماتقدم ان مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ شائد ایک یا دو نسلوں یا شائد ہمارے معاشرہ میں ہمیشہ کے لئے ضرورت ہو کہ انقلابی حالت اور ذہنیت کو محفوظ کیا جائے تا کہ معاشرہ اپنے انقلابی مطالبات تک پہنچ سکے۔ اس لئے انقلاب کی کامیابی کے عوامل کے پیش نظر، انقلاب کی اہم اور خطرناک آفات، لوگوں کی میدان سے کنارہ کشی، اسلامی انقلاب کے نظریاتی

مقاصد کو اصول پر، نہ یہ کہ وسائل اور کامیابیوں پر بھروسہ کر کے عملی جامہ پہنانے میں کوتاہی، اور اسی طرح انقلاب کی رہبری میں اختلاف اور کشمکش کی ایجاد ہو سکتے ہیں۔

وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی نماز جمعہ کی صفیں مختصر ہو کر لوگوں کی شرکت کم ہو جائے اور جب بھی اسلامی معیاروں اور اقدار کے تحقق میں بے خیالی کا مظاہرہ کیا جائے اور ہمارے رہبروں اور حکومت کے عہدہ داروں پر نفسانی خواہشات سوار ہو جائیں اور اسلامی ایثار وتقویٰ کی جگہ جاہ طلبی اور دنیا پرستی آ جائے، تو انقلاب اپنی ڈگر سے ہٹ کر شکست سے دوچار ہو سکتا ہے۔ لائق اور متعہد مدیروں کے بری الذمہ ہونے کے لئے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی بھی انقلاب کی آفتوں میں سے ایک آفت ہے۔ ایسے افراد کو شرعی اور انقلابی ذمہ داریوں کے پیش نظر مشکلات، رکاوٹوں اور ریشہ دوانیوں سے نہیں ڈرنا چاہئے اور انھیں حسب معمول میدان میں رہنا چاہئے۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو آرام طلبوں، اور ناصالح و نالائق عناصر کے نفوذ کا احتمال ہے۔

آرام طلبی کو صرف منافع خوروں، موقع پرستوں اور اپنے شخصی منافع کی حفاظت کے لئے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے فریب کاروں کے وجود میں تلاش نہیں کرنا چاہئے (اگر چہ یہ خود ایک خطرناک آفت ہے) بلکہ شکست خوردہ اور رسوا شدہ فکری مقابلہ آرائی کا نفوذ بھی انقلاب کی خطرناک آفتوں میں سے ایک ہے۔ جب ان فکری مقابلہ آرائی کا براہ راست مقابلہ میں کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا ہے اور شکست سے دوچار ہوتی ہیں تو یقیناً نظام میں خفیہ طور پر نفوذ کر کے اپنے انحرافی افکار کو وسیع پیمانہ پر پھیلا دیتی ہیں۔

ہمارے اسلامی انقلاب کے معاشرہ میں، دائیں بازو، بائیں بازو (مارکسیزم اور لیبرل ازم) نام کی دو خطرناک اور منحرف راستے ہیں، اسی طرح، من پسند اور مخلوط اسلام اور غیر سیاسی اور مدہوش کرنے والے اسلام کے نام پر انحرافی راستے موجود ہیں۔ اگر چہ ان راستوں نے اسلامی انقلاب سے براہ راست مقابلہ میں شکست کھائی ہے اور ان کا تنظیمی نظام اور سسٹم یا نابود ہو گیا ہے یا رسوا ہو کر رہ گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اکثر وارث اور کارندے اپنی فکر و طریقہ کار پر باقی ہیں اور

اپنی بقا اور حیات کے لئے یہاں تک اپنی فکر کو پھیلانے کے لئے میکیاولی طریقہ کار کے مطابق نہ صرف ان فکری روئیدادوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنی وابستگی کا انکار کرتے ہیں بلکہ ان سے اظہار نفرت بھی کرتے ہیں۔ لیکن عمل میں بظاہر انقلاب واسلام کے نام پر اور اسلامی معیاروں سے تمسک کا اظہار کر کے اپنی فکری روش کی ترویج کرتے ہیں۔ دائیں بازو اور بائیں بازو ہمیشہ ایسے اہم خطرات ہیں جو انقلاب کی شکست اور انحراف کے اسباب فراہم کر سکتے ہیں۔

ایسی روشوں کے نفوذ کو روکنے اور انقلاب کو ہر قسم کے خطرات اور انحرافات سے بچانے کے لئے ،انقلاب کے مفکروں بالخصوص فقہا پر مندرجہ ذیل دو قسم کی بنیادی اور اصلی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں:

الف) آج کل کے مسائل اور مشکلات کے پیش نظر مجاہدت اور مسلسل کوشش سے مکتب اسلام کو مختلف زاویوں اور ابعاد میں تشریح، بیان اور تدوین کرنا تا کہ اس طرح مناسب قوانین مرتب کر کے انھیں جاری کرنے میں عہدداروں کی مدد کی جائے۔

ب) منحرف سیاسی ، مذہبی فکری روشوں کی خصوصیات کی مکمل پہچان اور تحقیق کر کے، انھیں عوام میں متعارف اور پیش کرنا اور معاشرہ کو ان کے نفوذ کے خطرہ سے آگاہ کرنا۔

ہمارا معاشرہ جن حل نہ شدہ مسائل سے ابھی تک دو چار ہے وہ متعدد ہیں۔ یہاں پر نہ ان کے سلسلہ میں بحث کرنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی ان میں سے ہر ایک کا حل پیش کرنا ممکن ہے۔ اس لئے ذیل میں صرف ان کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے:

اگر چہ سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۵۹۸ کو قبول کرنے، جنگ بندی کے اعلان، عراق کی کویت پر حملہ کے ضمن میں جنگی قیدیوں کی آزادی اور عراقی فوج کے ایران کی سرزمین سے نکلنے کے پیش نظر مسلط کی گئی جنگ کا مسئلہ، اب اسلامی جمہوریہ کے بنیادی مسئلہ کی حیثیت سے اس کے پروگراموں کے اعتبار سے سرفہرست نہیں ہے، پھر بھی اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ، سامراج کے ساتھ جنگ اس کی نابودی تک جاری رہے گی اور ملت کو ایثار و قربانی کے لئے اپنی مسلسل تیاری سے غفلت نہیں کرنی چاہئے۔ اسلامی جمہوریہ اور انقلاب کے لئے یہ جنگ صرف حملہ آور کو دور کرنے اور نقصانات

کی تلافی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اسلامی جمہوریہ کے نظام کو سرنگوں کرنے کے سلسلہ میں انقلاب کے بیرونی دشمنوں کی ایک بڑی سازش کو ناکام بنانے کے علاوہ ایک بڑا امتحان تھا، اور سیاسی اور فوجی دباؤ کے مقابلہ میں انقلاب کی پائداری اور سازش کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکنے کا جائزہ لینے کا ایک اہم رول تھا۔

ایمان، ارادہ اور جذبہ قربانی وشہادت کی بنیاد پر اسلامی مجاہدین کی پے در پے فتحیابیاں، بالخصوص لبنان اور فلسطین میں شہادت طلبانہ کاروائیوں نے انقلاب کے دشمنوں کے لئے
پریشانیاں ایجاد کی ہیں اور طاقت وتسلط کے توازن کے موضوع، جس کا پہلے فوجی اور اسلحہ کی بنیاد پر محاسبہ کیا جاتا تھا، کو ایک جدید اور ناقابل حل مسئلہ سے روبرو کر دیا ہے۔

اس کے باوجود اسلامی جمہوریہ کو اپنے مطالبات حاصل کرنے کے لئے بدستور اپنی فوجی طاقت کی بنیادوں کو تقویت بخشنے اور سفارتی سطح پر اپنی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر چہ اس سلسلہ میں عظیم انسانی اور مالی ذخائر صرف کرنا پڑے لیکن انقلاب کی پالیسیوں کو پائداری اور تقویت بخشنے کے لئے خاص اہمیت دینی چاہئے تاکہ عالمی مقاصد کے تحقق کے لئے علاقہ میں قومی اقتدار پائدار اور مستحکم ہو جائے۔

ان مسائل کے ساتھ ساتھ اقتصادی مسائل کو حل کرنا انقلاب کے اہم مسائل میں سے ہے۔ طاغوت کے زمانہ سے باقی بچی اقتصادی اور اجتماعی بے انصافیوں کو دور کرنا اور عادلانہ اقتصادی نظام کو قائم کرنا بھی ایسے مسائل میں سے ہے جن کا ڈھانچہ اور پروگرام مکمل طور پر ابھی تک واضح اور معین نہیں ہوا ہے۔ معاشرہ کے عظیم طبقات جن کے دوش پر انقلاب کی ذمہ داریاں ہیں، زندگی کے کم از کم وسائل سے بھی کب تک بدستور محروم رہیں گے جبکہ خوشحال اور مزے اڑانے والے طبقات سے مربوط ایک محدود اقلیت، جن کے پاس نقلاب کے بارے میں کمی اور دیگر مشکلات کی شکایتیں بیان کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، تمام وسائل کی مالک ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں بالاخر توجہ کرنی چاہئے اور یہ مسئلہ وہی چیز ہے جسے رہبر انقلاب نے فقر وفساد اور امتیازی سلوک سے

مبارزہ کا نام دیا ہے۔

معاشرہ کی ضروریات زندگی سے مربوط اصلی اجناس اگانے والے گاؤں اور ان کے باشندوں کی مشکلات کو حل کرنا اور گاؤں کے لوگوں کی شہروں کی طرف مہاجرت کو روکنا اور منصوبہ بندی کے بغیر روز بروز شہروں کے پھیلنے کے مسئلہ کا حل بھی اہم مسائل میں سے ہے کہ ابھی تک ان کے حل کے لئے کوئی چارہ جوئی نہیں کی گئی ہے۔ جبکہ اس وقت ایران کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ شہرنشینوں پر مشتمل ہے اور نصف سے کم لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں جو ضروری وسائل کی کمی کی وجہ سے اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات کو بھی پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، ان حالات کے پیش نظر ہمارا ملک ضروری اجناس کے سلسلہ میں کیسے خودکفیل ہوسکتا ہے؟

لوگوں کی رہائش کا مسئلہ، ہر گھرانے کی پریشانیوں کا ایک بڑا حصہ ہے اور ان کی اکثر آمدنی اسی میں خرچ ہوتی ہے، یہ بھی فلاحی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جو معاشرہ کی ایک بڑی مشکل ہے۔

دفتری بیوکریسی کے مسئلہ کو حل کرنا اور یونیورسیٹیوں اور تعلیمی اداروں کی اصلاح بھی انتہائی اہم مسائل میں سے ہے کہ ان کی طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

بین کی گئی عظمتوں کے پیش نظر اسلامی انقلاب ایک الٰہی تحفہ ہے جو ہمیں تاریخ کے تاریک ترین لمحات میں ملا ہے، حقیقت میں یہ انقلاب ایک الٰہی امانت ہے کہ خداوند متعال نے ہم پر منت واحسان کیا ہے اور تمام نسلوں میں عصر حاضر کی نسل کو اور تمام معاشروں میں ہمارے معاشرہ کو اس کے لائق سمجھا کہ اس امانت کو ہمارے حوالہ کرے تاکہ ہم اس کے نصب العین کی توسیع اور حفاظت کی کوشش کریں۔ ہماری ملت نے بھی آج تک کئی لاکھ شہید اور معلولوں کی قربانی پیش کر کے اور ہمیشہ میدان عمل میں حاضر رہ کر اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی حفاظت کے لئے وسیع پیمانے پر تلاش وکوشش کی ہے اور تمام مشکلات اور رکاوٹوں پر قابو پایا ہے۔

اسلامی انقلاب کی نمایاں کامیابیوں اور روزافزوں بالیدگیوں نے سامراجی طاقتوں کی نیند حرام کر کے رکھدی ہے۔ ان کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر اس انقلاب کو آرام سے پھیلنے اور اسلامی

نظام کے تعارف کرانے کی فرصت ملی، تو اس کی کشش اس امر کا سبب بنے گی کہ نہ صرف مسلمان ملتیں ناقابل مقابلہ صورت میں اس کی طرف مائل ہو جائیں گی بلکہ بلاک بندیوں اور دنیا کی موجودہ حالت سے عذاب میں مبتلا غیر مسلم ملتیں بھی اس نئے ماڈل اور طریقہ کار کی طرف رخ کریں گی اور انھیں اس کام سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ اس لئے بڑی طاقتیں اپنی قطعی شکست اور مکمل نا اُمیدی تک اسلامی انقلاب کے لئے مشکلات ایجاد کر کے اس کی سرنگونی کے لئے سر توڑ کوششیں کریں گی اور اس صورت میں دعوی کریں گی کہ اس قسم کے مطلوب کمال کا پیدا ہونا اسلامی نظام کے ذریعہ ممکن نہیں ہے اور مذہب اپنے آئیڈیل کی حد میں خدا سے ایک انفرادی رابطہ ہے یا زیادہ سے زیادہ حکومت کی ایک قسم ہے جو ایک مسلمان ملک میں ایک حاکم کے ذریعہ چلائی جاتی ہے۔

ہوشیار رہنا چاہئے کہ سامراج کی اس سلسلہ میں ہر قسم کی کامیابی، انقلاب کے لئے سب سے بڑی شکست ہوگی اور برسوں، بلکہ صدیوں تک ہر قسم کی اسلامی تحریک کو شکست دی جائے گی یا ابھرتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔

ایران کی ملت اور اس کے رہبروں کو یہ فرصت اور موقع ہاتھ آیا ہے کہ جو کچھ سابقہ نظام کی معنوی و اخلاقی مخالفت کے طور پر ظاہر کرتے تھے، اسے ماڈرن اور منظّم سیاسی ڈھانچہ میں عملی جامہ پہنائیں۔ سیاسی ماہیت، اسلامی اقتصاد، اجتماعی روابط اور سماج میں اسلامی انصاف قائم کرنا من جملہ ایسے اہم مسائل میں سے ہیں کہ ان کی طرف توجہ دینی چاہئے جبکہ مغربی بورژوائی، لیبرل انقلاب، اجتماعی انصاف کو انفرادی آزادی پر قربان کرتے ہیں اور مارکسیسٹی انقلاب انفرادی آزادی کو اجتماعی انصاف کی بھیٹ چڑھاتے ہیں۔ اب یہ اسلامی انقلاب کا کام ہے کہ دنیا والوں کے لئے ایسا معاشرہ پیش کریں جو ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہ ہونے دے، یعنی نہ اجتماعی انصاف انفرادی آزادی پر اور نہ انفرادی آزادی اجتماعی انصاف پر قربان ہو۔

آج کی دنیا، انقلاب سے پہلی والی دنیا نہیں ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک نیا صفحہ کھل گیا ہے۔ اسلام کی سابقہ شان و شوکت پھر سے لوٹ رہی ہے۔ اسلام کے دشمن، اسلام کے خلاف دائمی جنگ کا

آغاز کریں گے۔ وہ اپنی مادی طاقت پر مغرور ہیں اور اپنی دشمنی اور ریشہ دوانیوں سے ہاتھ نہیں کھینچیں گے۔

اگرچہ لاکھوں انسانوں کی جانی قربانی سے طاغوتی حکومت سرنگون ہوئی ہے، لیکن جب درپیش پروگراموں اور عظیم مقاصد کے ساتھ اس کا موازنہ کیا جائے تو یہ ایک معمولی کامیابی اور ابتدائی راستہ معلوم ہوتا ہے۔

آج دنیا کے کونے کونے میں مسلمان، اسلامی نعرے بلند کرتے ہیں۔ دنیا کے مسلمانوں نے ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کی برکت سے ایک ایسا راستہ اپنایا ہے جسے ہم نے طے کیا ہے۔ اس راستہ پر آگے بڑھتے ہوئے ہماری ہر غفلت ان کے لئے بھی یاس و ناامیدی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لحاظ سے دوسری ملتوں کی کامیابی اور ناکامی کا بوجھ بھی ہمارے ہی کاندھوں پر پڑا ہے اس لئے ہمیں اس سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ایسے حالات میں ہے کہ آج کی اسلامی حکومتیں نہ صرف سیاسی، اقتصادی اور عسکری لحاظ سے بلکہ نظریاتی لحاظ سے بھی سامراجی طاقتوں کی طرف جذب ہوئی ہیں۔ انقلاب کے دشمنوں کی آخری اُمید اور انقلاب کے حامیوں کی پریشانی امام خمینیؒ کی رحلت اور انقلاب کا میدان ان کے وجود سے محروم ہونے کا موضوع تھا۔

چونکہ انقلاب کی کامیابی اور اس کے دوام کے سلسلہ میں رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ کا کردار انقلاب کے اصلی اور اہم ارکان میں سے تھا اور تمام لوگ ناقابل بیان عشق و محبت سے ان کی ہدایات، نظریات اور احکام کی اطاعت کرتے تھے۔ اس لئے اسلام کے دشمنوں کا یہ تصور تھا کہ امام خمینی (رہ) کی رحلت کے ساتھ ہی لوگ بھی انقلاب سے منہ موڑ کر رہبر کی جانشینی کی جنگ میں مصروف ہو جائیں گے اور ایسی افراتفری، اختلافات اور ناامنی پھیل جائے گی کہ حکومت کے اہل کاروں کے لئے اس کا کنٹرول کرنا ناممکن بن جائے گا اور حقیقت میں انقلاب دم توڑنے کے قریب پہنچ جائے گا۔ اس کے باوجود امام خمینی (رہ) کی رحلت کا حادثہ ایسے حالات میں رونما ہوا کہ نہ صرف دشمنوں کی آخری امیدیں نااُمیدی میں بدل گئیں، بلکہ دینا والے اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ انقلاب

انتہائی استحکام، قدرت اور توانائی کا مالک ہے۔

امام خمینی (رہ) کی رحلت ایسے حالات میں واقع ہوئی کہ، ان کی جانشینی کے بارے میں مشکلات پیدا کرنے والے اور اس مسئلہ کو تعطل سے دوچار کرنے والے مسائل کے بارے میں تمام فیصلے انجام پا چکے تھے۔ بالخصوص انہوں نے اپنی زندگی کے آخری چند مہینوں کے دوران سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۵۹۸ کو قبول کر کے، آیت اللہ منتظری کو معزول کر کے اور آئین میں ترمیم کے بارے میں لئے گئے اہم فیصلے لے کر راستہ ہموار کر دیا۔

اس کے علاوہ امام خمینیؒ اپنے اقدامات، بے شمار پیغامات، تحریروں اور آخر کار اپنے سیاسی، الٰہی وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے پیروکاروں کے لئے کسی حد تک دستور العمل معین کر چکے تھے تا کہ وہ اس پر عمل کر کے ان کے اصلی اور صحیح راستہ کو تشخیص دے کر اس پر گامزن ہوسکیں۔

امام خمینیؒ کی تاریخی اور بے مثال تشییع جنازہ، جس میں غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے اعتراف کے مطابق ایک کروڑ سے زائد لوگوں نے شرکت کی اور مجلس خبرگان رہبری کی طرف سے فوری طور پر حضرت آیت اللہ خامنہ ای کو امامؒ کا جانشین اور رہبر انقلاب منتخب کرنے اور لوگوں کے مختلف طبقوں کی طرف سے ہر قسم کی گروہ بندی اور پارٹی بازی سے بالا رہ کر اس کا استقبال کرنے اور عام لوگوں کی طرف سے نئے رہبر کی بیعت نے دنیا والوں کو حیرت میں ڈال دیا اور اس کے علاوہ انقلاب کے دشمنوں کو شدید طور پر یاس و ناامیدی سے دوچار کیا اور یہ ثابت کیا کہ ان کی تمام پیشنگوئیاں خلاف حقیقت اور مادی تجزیوں پر مبنی تھیں۔

اگر چہ ایران کی ملت اپنے رہبر و مقتدا کے فقدان پر غم و اندوہ میں مبتلا اور عزادار ہے اور اب وہ ملکوتی چہرہ ہمارے درمیان نہیں ہے تا کہ وہ اپنی ناقابل توصیف معنوی قدرت سے جانکاہ بحرانوں اور حوادث میں ہمیں آرام و سکون عطا کرے اور اس بات کی اجازت نہ دیں کہ معاشرہ کے اندرونی اختلافات انقلاب کے ارکان کو متزلزل کر دیں، لیکن امامؒ کے دی ہوئی ہدایات و راہنمائی اور معاشرہ کے رہبروں کی کوششیں انقلابی معاشرے کے لئے نوید بخش ہیں۔

ہم نے اس کتاب میں جو کچھ انقلاب کے ساتھ ہوا ہے اسے ''انقلاب کے پس منظر اور نتائج'' کے عنوان سے اور جو آئندہ انجام پانا چاہیئے ،اسے خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے اور اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس الٰہی نعمت کے مقابلہ میں فرداًفرداً ہمارا کیا فریضہ ہے۔ہمیں کیا کرنا چاہئے تا کہ ہم نہ صرف اپنے فریضہ کو انجام دیں بلکہ انقلاب کے نتائج اور اس کے عالی مقاصد کی حمایت اور ان کو تحقق بخشنے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر سکیں۔

جو کچھ ایک آگاہ ایرانی مسلمان کو مدنظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ اس وقت اسلامی انقلاب کا پرچم اس کے دوش پر ہے اور وہ عالمی اسلامی انقلاب کا دستہ ہے۔یہ ایک سنگین ذمہ داری ہے کہ اس کی گہرائی کو سمجھنے میں ہر قسم کی غفلت سے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ایران کی موجودہ نسل کے ذمہ جو سب سے اہم فریضہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس گراں قیمت امانت اور میراث کی احسن طریقہ پر حفاظت کریں اور اس کو ثمر بخش بنا کر آئندہ نسلوں کے حوالہ کریں۔ہمیں اپنی ذمہ داری کو بہتر طریقہ پر انجام دینے کے مندرجہ ذیل اصول کو مدنظر رکھ کر ان پر عمل کرنا چاہئے:

۱۔ہمیں تمام مشکلات، پریشانیوں، ناکامیوں، سازشوں اور انحرافی برتاؤ کے مقابلہ میں مأیوس و نا امید نہیں ہونا چاہئے ، بلکہ آیۂ کریمہ:﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا﴾ سے توسل کر کے اور پروردگار عالم کی مدد اور اس کی نصرت و یاری پر اطمینان رکھ کر،صرف خدا کے لئے اسلام اور اسلامی انقلاب کے راستہ میں کوشش اور جدوجہد کرنی چاہئے۔

۲۔اس کے علاوہ بلکہ اس سے اہم تر،ہمیں تزکیہ نفس کے لئے کوشش کر کے اس جدوجہد کو اپنے پروگراموں کا عنوان قرار دینا چاہیئے جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد اکبر کا نام دیا ہے تا کہ ایک لائق اور قدرتمند سپاہی کے مانند اسلامی انقلاب کی راہ میں مخلصانہ کوشش کریں۔

۳۔اسلامی انقلاب کے بارے میں جو لوگ آج اپنی سنگین ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہیں،انھیں انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے کے علاوہ کوئی اور کام انجام دینا نا قابل عفو بخشش ہوگا۔ ہمارا پورا وقت،ہمارے افکار اور پروگرام اسلامی انقلاب کے مقاصد کو وسعت دینے میں صرف ہونے چاہئے۔

۴۔ہمیں ہر زمان و مکان میں اور ہر قسم کے ماحول بنانے ،تہمت، افترا پردازی اور اس قسم کے مسائل کے مقابلہ میں تھکن اور یأس و ناامیدی سے اجتناب کرنا چاہئے ،میدان کو خالی نہیں چھوڑنا چاہئے ،اس صورت میں ہم میدان کو موقع پرست ، ناجائز منفعت خوروں اور نالائق افراد کے لئے چھوڑ دیں گے ۔انقلاب کے مومنوں کے لئے میدان کارزار میں مسلسل اور سرگرم طور پر حاضر رہنا، انقلاب کی حفاظت و کامیابی کی ضمانت ہے۔

۵۔اس کے علاوہ ہمارے جہاد و مبارزہ کا اصلی مقصد خداوند متعال کی رضامندی حاصل کرنا اور وہ ذمہ داری نبھانا ہے، جسے امام خمینیؒ تکلیف شرعی کہتے تھے ۔اس لئے ہمیں الٰہی تقویٰ کو صرف ایک سوق الجیشی مقصد نہیں جاننا چاہئے ، بلکہ اسے اپنی زندگی کا عنوان قرار دینا چاہئے ۔ہمیں ہرگز اصول کو ظاہری اور عارضی کامیابیوں پر قربان نہیں کرنا چاہئے اور دنیوی کامیابیوں کو حاصل کرنے کیلئے صحیح اور تقویٰ کی ڈگر سے دور نہیں ہونا چاہئے

۶۔ہمیں اپنی زندگی کو اسلامی معیاروں اور ایک مبارز و انقلابی مسلمان کے نمونہ کے مطابق بنا کر اپنے کردار و گفتار کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۷۔ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے علمی اور آگاہی کی سطح کو زیادہ سے زیادہ بڑھا دادے کر انقلابی معاشرہ کی بیشتر ذمہ داریوں کو نبھائیں اور معاشرہ کی پسماندگی کی تلافی کریں تاکہ انقلاب کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کوشش کر سکیں ۔اس صورت میں خداوند متعال بھی ہمیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مدد کر کے کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔

وما النصر الا من عندالله

فارسی اور انگریزی منابع کی فہرست

۱۔ آرنٹ، ھانا ''انقلاب''، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، خوارزمی، ۱۹۸۲ء

۲۔ خمینی، روح اللہ: ''صحیفہ نور'' (۲۱ جلد)، وزارت ارشاد اسلامی، ۱۹۸۲ء

۳۔ خمینی، روح اللہ: ''ولایت فقیہ'' (حکومت اسلامی)، ناس.

۴۔ بازرگان، مھدی: ''انقلاب ایران دردوحرکت''، بازرگان، ۱۹۸۴ء

۵۔ برآم، سایروس: ''انقلاب ایران ومبانی رہبری امام خمینیؒ ''، ترجمہ پ، شیرازی

۶۔ بریر، کلرو بلانشہ، پیر، ''ایران: انقلاب بہ نام خدا''، ترجمہ قاسم صنعوی، سحاب ۱۹۷۹ء

۷۔ برینٹون، کرین: ''کالبدشکافی چہار انقلاب''، ترجمہ محسن ثلاثی، نشرنو، ۱۹۸۳ء

۸۔ پارسونز، آنٹونی: ''غرور وسقوط''، ترجمہ پاشاشریفی، راہ نو، ۱۹۸۴ء

۹۔ پہلوی، محمد رضا: ''(اعترافات) پاسخ بہ تاریخ''، ترجمہ منوچہر مہر جو، ہفتہ، ۱۹۸۳ء

۱۰۔ ٹوین بی، آرنالڈ: ''تاریخ تمدن: تحلیلی از تاریخ جھان''، ترجمہ یعقوب آژند، مولی، ۱۹۸۳ء

۱۱۔ جانسن، چالمرز: ''تحول انقلابی''، ترجمہ حمید الیاسی، ہفتہ، ۱۹۸۳ء

۱۲۔ جرڈن، ھامیلٹون: ''بحران''، ترجمہ محمد مشرقی، ہفتہ، ۱۹۸۰ء

۱۳۔ دانشجویان پیرو خط امام: ''اسناد لانہ جاسوسی امریکا (۵۰ جلد)''، اسلامی، ۱۹۸۰ء

۱۴۔ روحانی، سید حمید: ''بررسی وتحلیلی از نہضت امام خمینیؒ (جلد اول) آفسٹ ۱۹۸۲ء
۱۵۔ روحانی، سید حمید: ''شریعتمداری در دادگاہ تاریخ''، دفتر اسناد انقلاب اسلامی، قم، ۱۹۸۲ء
۱۶۔ سالینجر، پی یر: ''ایران میں یرغمالی''، ترجمہ ثقۃ الاسلامی، نوین، ۱۹۸۳ء
۱۷۔ سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی: ''ذخیرہ ہای امپریالیسم''، دفتر سیاسی سپاہ
۱۸۔ سولیوان، ولیم: ''ایران میں ماموریت''، ترجمہ محمود مشرقی، ہفتہ، ۱۹۸۲ء
۱۹۔ طاہری خرم آبادی: ''ولایت فقیہ یا حاکمیت ملت اسلامی''، ۱۹۸۳ء
۲۰۔ فردوست، حسین: ''ظہور وسقوط سلطنت پہلوی''، انتشارات اطلاعات، چاپ دوم، ۱۹۸۹ء
۲۱۔ مایکل، لوئیس ویلیم: ''کارٹر وسقوط شاہ''، ترجمہ ایرانی، امیر کبیر، ۱۹۸۲ء
۲۲۔ مدنی، دکتر سید جلال الدین: ''تاریخ سیاسی معاصر ایران (۲ جلد)''، اسلامی، ۱۹۸۳ء
۲۳۔ مطہری، مرتضیٰ: ''پیرامون انقلاب اسلامی''، آفسٹ، ۱۹۸۰ء
۲۴۔ مطہری، مرتضیٰ: ''خدمات متقابل اسلام وایران''، صدرا، ۱۹۷۸ء
۲۵۔ مطہری، مرتضیٰ: ''نہضت ہای اسلامی در صد سال اخیر''، صدرا
۲۶۔ مؤسسہ مطالعات وپژوہش ہای سیاسی: ''کودتای نوژہ''، چاپ دوم، ۱۹۸۹ء
۲۷۔ دفتر وزارت عظمیٰ: ''چگونگی انتخاب اولین نخست وزیر''، دفتر وزارت عظمیٰ، ۱۹۸۱ء
۲۸۔ نہضت آزادی ایران: ''چھ کھلے خطوط''، نہضت آزادی ایران، ۱۹۸۲ء
۲۹۔ نہضت آزادی ایران: ''شورای انقلاب اور عبوری حکومت''، نہضت آزادی ایران، ۱۹۸۲ء
۳۰۔ نہضت آزادی ایران: ''سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کے نام کھلے خط''، نہضت آزادی ایران، ۱۹۸۳ء
۳۱۔ نہضت زنان مسلمان: ''مواضع نہضت آزادی در برابر انقلاب اسلامی''، نہضت زنان ایران، ۱۹۸۲ء
۳۲۔ ہیکل، محمد حسنین: ''ایران، ایک ناگفتہ روایت''، ترجمہ حمید احمدی، الہام، ۱۹۸۳ء

English Biblography

1. Akhav, Sharough, (1980) *Religion and Politics in Contemporary Iran.* State University press.
2. Afshar, Haleh, (1985) *A Revolution in Turmoil.* State University of New York Press.
3. Algar, Hamid, (1981) *The Islamic Revolution in Iran.* Qom, Iran: Ansariyan Publications.
4. Bernard, C& Khalilzad, (1984) *Islamic Republic the government of God*, New York: Columbia University press.
5. *Eagle and the lion, the tragedy of American-Iranian relations*, Yale University Press, 1988.
6. Brinton, Crane, (1965) *The anatomy of revolution*, Prentice Hall Inc. USA.
7. Keddie, N. ed, (1981) *Continuity and change in modern Iran*, State University of New York Press. Bonine, M.E.&.

8. Carter, Jimmy, (1982) *Keeping Faith. Memories of a President,* USA: William Collins Sons & Co. Ltd.

9. Dawish ,Adeed, (1983) *ISLAM in Foreign Policy,* Cambridge University Press.

10. Hiro, Dilip, (1985) *Iran under the Ayatollahs*, Routlege & Kegan Paul- London.

11. Huyser, R.E, (1986) *Mission to Tehran*, London: Andre Deutsch.

12. Huntington, Samuel (1976) *Order Political in Changing Societies*. New Haven: Yale University Press.

13. Hussain, AsafIran, (1985) *Islamic Revolution and Counter Revolution*, London: Frances Printer.

14. Loannides, *Christos. America's Iran Injury and Catharsis,* University Press of America.

15. Fischer, Michael. (1980) Iran, *Religious from Dispute to Revolutions,* USA: Harvard University Press.

16. Graham, Robert. (1980) *The illusion of power*, New York: St. Martin's Press.

17. Grayson, Benson, L. (1981) *United States-Iranian relations,* University Press of America,

18. Keddi, Nikki. (1980) *Religion, Politics & Society,*

London: Frank Cass and Company Ltd.

19. Keddie, Nikki. (1983) *Question to Revolution, Iran Religion and Politics in Iran, Shiism From,* New Haven: Yale University Press.

20. Keddi, Nikki. (1981) *Roots of Revolution,* New Haven: Yale University Press.

21. Eric, ed. Keddi, Nikki. (1981) *Republic, Middle East Institute,* Hoagland: Woodrow Wilson USA.

22. *The Iranian Revolution and the Islamic.*

23. Kennedy, Moorhead. (1986) *The Ayatollah in the cathedral, Reflections of a Hostage,* New York: Hill and Wang.

24. Mottahedeh, The Roy. (1985) *Mantle of the Prophet, Religion and Politics in Iran*, New York: Simon and Schuster.

25. Ramazani , R .k. (1988) *Revolutionary Iran*, London: The john Hopkins University Press.

26. Roosvelt, Kermit. (1979) *For Struggle the Control of Iran*, USA: MC Grew Hill Book Company, Counter Coup.

27. Said Edward w. (1981) *Covering Islam*, London: Rutledge and kegan Paul

28. Sami, K.A. (1987) *Strategies Containment in Iran, Involvement by invitation American* London: The Pennsylvania University press.

29. Segoy, Samuel. (1988) *The Iranian Triangle,* New York: The free Press.

30. Simpson, john. (1988) *Inside Iran,* New York: St. Martin I.S press.

31. Stempel, john. (1981) *Inside the Iranian Revolution.* USA: Indian University Press.

32. Zabih, Sepehr. (1979) *Iranian Revolutionary Upheaval*, USA: Alchemy Books.

Of From revolution accounts of the revolution, world politics 35,(July 1983) Zonis, Marvin, Iran. A theory.

33. farhang ,jahanpour. (1984) *World Trolley Aspic the rise and fall of the tudeh Party.*

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #3
KARACHI
PH. 7211795

المجمع العالمي لأهل البيت
www.ahl-ul-bayt.org
ISBN 978-964-529-234-4
9 789645 292384